

www.Paksociety.com

خواتین اور وہ شہزادوں کیلئے اپنی طرز کا پہلا کتاب

# خواتین اور وہ شہزادوں

www.Paksociety.com

Proudly Presented by Paksociety.com





میں ناول

14 سیر  
15 ادا

کہنہی سنتی  
کرن کرن روتی  
ہم کالے نام

74 جو پھولوں کو دھول تھے عفت سحر  
124 سیدی عزیز  
156 نایاب جیلانی

270 نادر و خانوں

نہ

20 انشاجی فقیر بن کر

ناول

200 بشری سعید  
232 ردا فاطمہ

نہ

275 امت الصبور میری ڈائری سے

کہان

ناول

280 مہرت شاہین  
283 خالد جیلانی

271 شکستہ چاہ  
286 عکال توکان  
278 ایمان علی

افسانے

67 ام مسیم  
60 راشدہ رفعت  
118 نعیمہ تاز  
58 کونسی حاصل نہ تھا

21 شاین رشید فرحت علی گوہر

انٹرویو

25 شاین رشید ڈاکٹر مرزا حامد ریگ

نسیات

288 نفسیاتی ازدواجی مجھضیں عدنان

نسیات

276 خالد جیلانی آپ کی بیاضت سے

نسیات

269 محشرہ آدنی  
270 فاطمہ حسن  
270 کامی شاہ  
269 شمیم فاطمہ

ناول

250 رضوانہ نگار  
36 رفعت ناہید

نویں گھر

290 بیوی بکس کے مشورے سے امت الصبور

زیر نگرانی ایڈیٹر گلشن گیلانی  
پاکستان (سالانہ) --- 500 روپے  
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 4000 روپے  
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 5000 روپے

فروری 2011  
جلد 38 نمبر 10  
قیمت 40 روپے

ماہنامہ نوائے سخن ڈائجسٹ اور ادارہ نوائے سخن ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچہ ہفت روزہ نوائے سخن اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل ہیں اور محفوظ ہے۔ کسی بھی قریب ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ذریعہ میں یہ ڈراما اور ناولی تکثیریں اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پیشتر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ نوائے سخن چارہ ہفت روزہ کا حق رکھتا ہے۔

محلہ و تقاریر کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔  
پبلشر: ڈورڈیض سے این سن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ تمام اشاعتیں: 91، پاک W، نادرہ رحم آباد، کراچی  
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872  
Email: khawateendigest@hotmail.com, info@khawateendigest.com



# سچی شہادت

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمار ہے حاضر ہیں۔

اس مہینے میں ربیع الاول کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ وہ بابرکت مہینہ ہے جس میں محسن انسانیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ وہ آخری نبی جس کی آمد کی نشاندہ تمام انبیاء اور مسلمان دیتے رہے۔ اس سے پہلے نبی ایک مخصوص قوم کے لیے مبعوث ہوتا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم انسانیت کے لیے مبعوث کیے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخوت، محبت اور امن کا پیغام لے کر آئے تھے۔ مخلوق سے محبت اور رحم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں شامل تھا۔ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اسلامی وحدت کا پیغام تھا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ آپ نے باہمی محبت اور داد دہانی کا درس دیا۔ اہل سنت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو رحمت اللعالمین کے خطاب سے نوازا۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی تو اس وقت اہل عرب کفر و شرک کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر طرف جہالت کا دور دورہ تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے ایک انقلاب برپا کر دیا۔ مختصر عرصہ میں اہل عرب کی کایا پلٹ گئی اور عرب کے پیمانہ ترین معاشرے سے وہ شخصیات ابھریں جنہوں نے اخلاق و کردار کی بے مثال داستانیں رقم کیں اور پوری دنیا پر حکومت قائم کی۔

آج ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی خوشیاں مناتے ہیں۔ گھر گھر مسیحا کی مجلس منعقد ہوتی ہیں۔ سڑکیوں، چولہوں پر چراغاں کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت پر اہل عربوں میں اس قدر راسخ ہے کہ ہم آپ کی شان میں ادا فی جہاں باہت گفتا نہیں سوا اللہ نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کی صحبت پر بھی اسی جوش و جذبے سے ملن کر رہیں جو اس دنوں حالی سے قبل کر علم و ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔ سنی لسانی، مذہبی اور علاقائی تعصبات میں الجھانے رکھنا ان لوگوں کی سازش ہے جو پاکستان کی سلامتی کے دشمن ہیں۔ ہم صرف اپنے اتحاد اور یکجہتی سے ہی اس سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔

## اسٹس شمارے میں

- حضرت سحر علیہ السلام کا مکمل ناول۔ "جو بیٹوں راہ کی دھول تھتے"
  - سعید بن جبیر کی آج پڑھی کا مکمل ناول۔ "قبول ہے"
  - نایاب جیسا مانی کا مکمل ناول۔ "محبت سورج کی پہلی کرن"
  - رفعت ناہید سجاد اور رخسار نگار کے سلسلے وار ناول
  - بشری سعید اور وفا قاطر کے ناول
  - یحییٰ ناز، ناشدہ رفعت، ام مریم اور کوسل ہبا کے افسانے
  - داستانوں کے اعراض کے ماہر پروفا حامد بیگ سے ملاقات
  - الف ایم 101 کے آریجے فرحت علی گوہر سے باتیں
  - باتیں کتابوں کی۔ سنی کتابوں پر تبصرہ
  - کرن کرن روشنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ
  - نفسیاتی ازدواجی اجنبی اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔
- خواتین ڈائجسٹ پر پھر کہیں خط لکھنا نہ بھولیں گے۔ آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لازمی عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی علی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر مشتمل ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور اسی ہے اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتاب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو تمام ماہل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سابق امور واقعات بھی شائع کریں گے۔

# کرن کرن روشنی

اخبار

## مشہور کام

نظری عبادت میں اس حد تک مشغول ہو جایا سکتا ہے کہ اپنی ذات اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کے علاوہ کسی اور مخلوق کو سرگرمی میں حصہ نہ لیا جاسکے۔ حجرت میں وطن چھوڑا جاتا ہے اور گوشہ نشینی میں اہل وطن کی برائیوں اور شرارتوں سے دامن بچانے کے لیے ان سے تعلق محدود کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں عمل مشابہ ہیں اور ان دونوں کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔

## اسلام شروع میں اجنبی تھا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسلام شروع میں اجنبی تھا اور وہ وہاں اجنبی ہو جائے گا اس لیے اجنبیوں کو مبارک ہو۔"

## فوائد مسائل :-

1۔ "غریب" وہ جنہی اور بے وطن گو کہتے ہیں۔ شروع میں اسلام کی یہ کیفیت تھی کہ اسے کوئی جانتا نہ تھا۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مخل و عارت (اور فتنوں کے ایام) کے دوران میں عبادت کرنا ایسے ہے جیسے میری طرف حجرت کرنا۔"

فوائد مسائل :-

1۔ فتنہ و فساد کے ایام میں فتنوں میں شمولیت سے بہتر ہے کہ ان سے الگ تھلک رہا جائے۔ اس کے لیے بہتر طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے۔

2۔ رہبانیت ممنوع ہے لیکن فتنوں کے ایام میں گوشہ نشینی رہبانیت میں شامل نہیں کیونکہ رہبانیت کا مطلب ہے کہ عوام سے جائزہ مل جوں سے بھی اجتناب کیا جائے اور عبادت میں اس طرح کی تنگی کی جائے جو سنت کے خلاف ہے جب کہ اس گوشہ نشینی کا مقصد اپنے آپ کو مخل و عارت اور فساد میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔ اس دوران میں مسنون



بھلا شہادت قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ آہستہ آہستہ لوگ اسے سمجھتے اور قبول کرتے گئے حتیٰ کہ ہر طرف اسلام کا بول بالا ہو گیا اور کفر و شرک ختم ہو گیا۔

2- خلفائے راشدین کے دور کے بعد اسلام میں بدعات کا ظہور ہوا بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے غیر مسلمانوں کے رسم و رواج اور خیالات اپنا لیے۔ اس طرح اصل اسلام چند لوگوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اکثریت نے خود ساختہ رسم و رواج اور غلط عقائد و اعمال ہی کو صحیح اسلام سمجھ لیا۔

3- جن اجنبیوں کو ہمارے باوردی مئی ہے ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو بدعات کی کثرت میں سنت پر عمل پیرا رہیں غلط عقائد مشہور ہونے پر بیخ عقیدے پر قائم رہیں اور اخلاقی انحطاط کے دور میں صحیح اسلامی اخلاق کو اختیار کریں۔

4- حق و باطل کا اور اور کسی نام کو اختیار کرنے پر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کی موافقت اور مخالفت پر ہے۔

### فتنوں سے سلامتی

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن مسجد نبوی میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں۔ انہوں نے کہا۔

”آپ کیوں رو رہے ہیں؟“

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔  
 ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے ہوئے ایک ارشاد کی وجہ سے رونا آ رہا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے ”تھوڑا سا دکھاؤ ابھی شرک ہے اور جو کوئی اللہ کے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے، وہ (گویا) اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وہ گناہ منافی تک لوگ پسند ہیں جو غیر حاضر ہوں تو انہیں تلاش نہیں کیا جاتا مگر موجود ہوں۔ انہیں بلایا

نہیں جاتا۔ انہیں پھانسا جاتا ہے۔ ان کے دل بدایت کے چراغ ہیں۔ وہ ہر ایک غبار آلود تارکک فتنے سے نکل جاتے ہیں (اور فتنوں سے متاثر ہو کر گمراہ نہیں ہوتے)۔

### کامل انسان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”لوگوں کی مثال ان سوا نون کی سی ہے جن میں سے ایک بھی سواری کے قابل نہ ملے۔“

### فوائد مسائل :-

- 1- صاحبِ کمال لوگ تعداد میں بہت کم ہوتے ہیں۔
  - 2- عوام میں زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی اہم ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے مگر کامل اہلیت والا فرقہ ملے تو ناقص اہلیت والے ہی سے کام چلانا چاہیے، تاہم ان کی مناسب رہنمائی اور ان کے کام کی مناسب گمرانی ضرور ہے۔
  - 3- صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے اور اس کا مطلب عقیدہ نہ ملے تو ضروری نہیں کہ تربیت میں نقص ہو۔ بعض اوقات تربیت پانے والوں کے نقص کی وجہ سے مطلوب نتائج حاصل نہیں ہوتے۔
- امتوں کا فرقوں میں تقسیم ہونا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”بیروزی 71 فرقوں میں تقسیم ہوئے۔ اور یہی امت ہتر (73) فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔“  
 حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”بیروزی اکثر فرقوں میں تقسیم ہوئے (ان میں سے) ایک فرقہ جتنی تھا اور ستر جنسی۔ عیسائی ہتر (72) فرقوں میں تقسیم ہوئے (ان میں سے) 71 جنسی تھے اور ایک جنسی۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے!

یہی امت ضرور تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ان میں سے) ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور ہتر جنم میں۔“

عرض کیا گیا اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہیں؟  
 فرمایا ”جماعت۔“

### فوائد مسائل :-

- 1- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل میں پیش آنے والے جن جن واقعات کی جس جس طرح خبر دی ہے وہ اسی طرح پیش آئے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور عہد اہدق کی دلیل ہے۔
- 2- فرقوں میں تقسیم ہونے کے بارے میں اس لیے بتایا گیا ہے کہ مسلمان ان اختلافات میں صحیح طرز عمل اختیار کرنے کی کوشش کریں۔
- 3- نصاریٰ اور مسلمانوں میں اختلاف کی اصل وجہ خواہشات نفس کی پیروی اور تعصب ہے اور یہ جرائم جنم میں لے جانے والے ہیں۔
- 4- مسلمانوں کی اصل ”جماعت“ وہ ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریقہ پر چلی آ رہی ہے اس جماعت سے لوگ الگ ہو کر مختلف فرقوں کی شکل اختیار کر گئے لیکن اصل ”جماعت“ یہی قائم ہے۔ مسلمانوں کو اسی ”جماعت“ کے ساتھ رہنے اور ان کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔
- 5- جماعت سے الگ ہونے والے خواہش نفس یا غلط تاویلات کی وجہ سے الگ ہوئے جو لوگ ان فرقوں میں شامل نہیں ہوئے وہ قرآن و حدیث پر قائم رہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔
- 6- نجات کا اور رعد رانی پاری کا کوئی خاص نام رکھ لینے پر نہیں بلکہ قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے سے۔ عالمین کتاب و سنت مختلف زبانوں اور علاقوں میں مختلف ناموں سے مشہور ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ الگ الگ فرقے بن گئے ہیں بلکہ وہ سب تنظیمیں یا جماعتیں ”الجماعتہ“ میں شامل ہیں۔

### گمراہی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
 ”تم لوگ پہلوں کے طریقے کی (پوری طرح) پیروی کرو گے، جیسے بائیں بائیں کے برابر ہاتھ ہاتھ کے برابر اور بائیں بائیں کے برابر ہوتی ہے حتیٰ کہ اگر وہ کسی ساڑھے کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ضرور اس میں گھسو گے۔“

صحابہ نے عرض کیا۔  
 ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہم یہودیوں اور عیسائیوں کی (پیروی کریں گے؟)  
 آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اور کن کی؟“

### فوائد مسائل :-

- 1- یہود و نصاریٰ کے رسم و رواج کی پیروی کرنا گمراہی کا باعث ہے۔
- 2- یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے تہواروں میں شرکت ہونا ان کی محبت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان کا مذہب بھی اچھا محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب اسلام کے مقابلے میں کفر کے طور طریقے اچھے لگنے لگیں تو پھر نام نہاد ایمان کا پالی رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔
- 3- ”پلغ“ سے مراد وہ فاصلہ ہے جو دونوں ہاتھوں کے سروں کے درمیان اس وقت ہوتا ہے جب دونوں بازو مخالف سمتوں میں دائیں بائیں پھیلا لیے جائیں۔ ”ہاتھ“ (ذراع) سے مراد ہاتھ کی انگلیوں سے کہنی تک کا فاصلہ ہے۔
- 4- ساڑھے کے بل میں گھسنے کی کوشش کرنا ایک نامعقول حرکت ہے، لیکن یہود و نصاریٰ کی پیروی میں مسلمان یہ بھی نہیں دیکھیں گے کہ یہ کلام یا سوچ درست بھی ہے یا نہیں بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی شروع کر دیں گے۔
- 5- اس پیش گوئی پر عمل کی موجودہ دور میں متعدد مثالیں ہیں۔ مغرب کی تہذیبی و ثقافتی بنا ہے جس کا مسلمانوں کی نسل نو بڑی تیزی سے شکار ہوتی جا رہی ہے۔

### مال کا فتنہ



حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا۔  
”لوگو! قسم ہے اللہ کی! مجھے تمہارے بارے میں صرف دنیا کی زینت (اور مال و دولت) سے خطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ تمہیں عطا فرمائے گا۔“

ایک آدمی نے کہا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آیا خیر سے بھی شر حاصل ہو جاتا ہے؟“  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر خاموش رہے پھر فرمایا ”تم نے کیا سوال کیا؟“  
اس نے کہا میں نے کہا تھا کیا خیر سے بھی شر حاصل ہوتا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خیر (حلال مال) سے خیر ہی حاصل ہوتا ہے کیا وہ خیر ہے؟ (دنیا کا ہر مال خیر نہیں ہوتا) موسم بہار میں جو سبزہ لگتا ہے اس سے جانور اچھا ہے کافکر ہو کر مر جاتا ہے یا مرنے کے قریب ہو جاتا ہے، گمراہ چرے والا جانور (بچ جاتا ہے) بچو کھاتا ہے پھر جب اس کی کوئی گھبراہٹ نہیں تو وہ صوب کی طرف منہ کر کے گویا اور پیشاب کرتا ہے پھر چنگلی کرتا ہے اس کے بعد دوبارہ کھانے لگتا ہے جو شخص جائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس میں برکت حاصل ہوتی ہے اور جو شخص ناجائز طریقے سے مال حاصل کرتا ہے اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی کھانا رتتا ہے لیکن سیر نہیں ہوتا۔“

- فوائد و مسائل :-
- 1- مال و دولت کی حرص انسان کے دین کے لیے خطرناک ہے۔
  - 2- مال اللہ کی نعمت ہے اس لیے حلال طریقے سے حاصل کرنا منع نہیں۔
  - 3- حلال کمائی سے حاصل ہونے والا مال بھی خرچ نہ کرنا بلکہ سمیٹ سمیٹ کر رکھنا نقصان دہ ہے۔
  - 4- گھاس اور سبز جانور کے لیے مفید ہے بشرطیکہ پہلا کھایا ہوا ہضم ہونے کے بعد اور تھانک اگر مسلسل کھا جا جائے گا تو نقصان اٹھائے گا۔ اسی طرح

مال مفید چیز ہے بشرطیکہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ بھی کیا جائے۔  
ذکر مثال دے کر سمجھانے سے بات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔

مال دنیا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کرو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟“  
حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ”ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر دالے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یا دو سر کی بات ہوگی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے پھر ایک دوسرے سے منہ پھیرو گے پھر ایک دوسرے سے مارا مار رہے گے اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔ پھر غریب مساجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لادو گے۔“

- فوائد و مسائل :-
- 1- رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے نہ دوسرے کو ملے، ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے جو ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے وہی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔
  - 2- حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک لیت جا پڑتی ہے۔ یہ سب حالتیں مذموم ہیں۔
  - 3- آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تک دست افرازی نہ کریں گے اور رعیت جماعتیں

بھی یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں، بعد ازاں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی صفاتیں موجود تھیں۔

مال

حضرت عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ جو عمر بن لوی کی خلیفہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ غزوہ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ انہوں نے بیان کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو بحرن روانہ فرمایا تاکہ وہاں (کے لوگوں) کا جزیہ لے کر آئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرن والوں سے صلہ لگی اور ان پر حضرت علاء بن حسری رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا تھا۔

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ۔ بحرن سے مال لے کر آئے انصار کو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی آمد کا علم ہوا تو انہوں نے بحرن کی نماز (مسجد نبوی میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتھاہ میں آرائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوئے تو وہ لوگ آپ کے سامنے آئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو مسکرایے پھر فرمایا۔

”میرا خیال ہے تم نے سنا ہے کہ ابو عبیدہ بحرن سے کچھ لاتے ہیں؟“ انہوں نے کہا۔  
”جی ہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!“  
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”خوش ہو جاؤ اور خوشی والی چیزوں کی امید رکھو۔ قسم ہے اللہ کی! مجھے تم پر فقر کا اندیشہ نہیں۔ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ دنیا تم پر اسی طرح قراخ ہو جائے گی جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر ہوئی تھی پھر تم اس کے لیے ایک دوسرے پر رشک (اور مسابقت) کرو گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے کیا تو یہ (دنیا) تمہیں تباہ کرے گی جس طرح اس نے تم سے پہلے لوگوں کو تباہ کر دیا تھا۔“

فوائد و مسائل :-

- 1- دولت ایک آزمائش ہے۔ اس کی حرص کی وجہ سے ظلم اور گناہ کا ارتکاب ہوا ہے۔
- 2- مال حلال طریقے سے حاصل ہو اور اس پر قناعت کی جائے تو ہر بات میں۔

نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو، قبل اس کے کہ تم دعائیں مانگو اور تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔“

- فوائد و مسائل :-
- 1- نیکی کا حکم دینے سے مراد مناسب طریقے سے نیکی کی ترغیب دینا ہے۔ حاکم اپنی رعایا کو والد اپنی اولاد کو اور شوہر اپنی بیوی کو حکم دے سکتا ہے جس کی وہ تعمیل کرتے ہیں۔ دوسروں کو اس انداز سے حکم نہیں دیا جاسکتا۔
  - 2- برائی سے منع کرنے کی طاقت ہو تو ہاتھ سے منع کرنا (جیسے حاکم والدین اور خاندان وغیرہ) ورنہ زبان سے کھانا ضروری ہے (جیسے عالم عوام کو سمجھا سکتا ہے) اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو گناہ سے دلی نفرت ضروری ہے۔
  - 3- گناہوں کا ارتکاب دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بن جاتا ہے لہذا توبہ کرنی چاہیے۔

فقتہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبیلہ مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اترا تو ہوتی مسجد میں نکلی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔  
”لوگو! انی عورتوں کو مسجد میں زینت والا لباس پہننے اور نقا خروائی چھان چھلنے سے منع کرو۔ نبی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں۔“





- 1 "اصلی نام؟"
- "فرحت علی گوہر۔"
- 2 "پیار کا نام؟"
- "زیادہ تر فرحت ہی کہتے ہیں یا بہت پیار آجائے تو فرو کہہ دیتے ہیں۔"
- 3 "تاریخ پیدائش / شہر / ستارہ؟"
- "23 جون 1978ء / کراچی / کینسر۔"
- 4 "تعلیمی قابلیت؟"
- "ایم بی بی ایس / ایف بی بی ایس / پارٹ ٹو۔"
- 5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
- "میرے تین بھائی اور ہم تین بہنیں ہیں اور میرا نمبر دو سرا ہے۔"
- 6 "شاہی کب کرنی ہے / اپنی باگھ والوں کی پسند؟"
- "کب کرنی کا تو جواب نہیں سے میرے پاس۔"

## بیابانِ فرحت علی گوہر سے

شاہین مرشد

- 11 "بہشت کرنے کا۔"
- 12 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟"
- "مسکراہٹ کے ذریعے جو ڈھیل پڑتے ہیں وہ اچھے لگتے ہیں۔"
- 13 "تھر کے کس کو نے میں سکون لگتا ہے؟"
- "اپنے کمرے میں۔"
- 14 "شدید جھوک میں آپ کا رد عمل؟"
- "بہت غصہ آتا ہے اور میں کچھ بڑھ رہی ہوں اور جھوک لگ جائے تو کچھ کچھ میں نہیں آتا کہ میں کیا پڑھ رہی ہوں۔"
- 15 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟"
- "اپنی چھوٹی بہن عروج سے یا پھر بڑی بہن سے۔"
- 16 "کیونکہ جب نصیب میں ہو گا ہو جائے گی اور جوڑے آہانوں پہنٹتے ہیں اور ارشِ صبح ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"
- 17 "ریڈیو پوز آؤ؟ کس نے تعارف کرایا؟"
- "بزمِ طلبہ میں 'ایک منٹ' کے عنوان سے مقابلہ ہوا تھا تو مجھے موقع ملا شرکت کا اور میری غزل کو پہلا انعام ملا تھا اور چونکہ مجھے شوق تھا تو اپنی صلاحیت سے آئی۔"
- 18 "سلاہیو گرام بحیثیت آرٹسٹ؟"
- "میسوزگ آن ڈیمانڈ۔"
- 19 "پہلی کمانی کمال فرخ کی؟"
- "(تعمیر) ریڈیو کی پہلی کمانی اور آخری کمانی تو آپ نے ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔"
- 20 "سچ اچھے ہی کیا دل پاتا ہے؟"

## فقیر بن کر

ابن النشار

فقیر بن کر تم ان کے در پر ہزار دھونی دما کے بیٹھو  
جہیں کے لکھے کو کیا کرو گے، جہیں کا لکھا مٹا کے بیٹھو

اے ان کی محفل میں آنے والو، اے سود و سودا پتانے والو  
جو ان کی محفل میں آ کے بیٹھو تو ساری دنیا بھلا کے بیٹھو

بہت جتاتے ہو چاہ ہم سے، مگر کر کے نبیہ ہم سے  
ذرا ملاؤ نگاہ ہم سے، ہمارے پہلو میں آ کے بیٹھو

جنوں پرانا ہے عاشقوں کا، جو یہ بہانہ ہے عاشقوں کا  
تو اک ٹھکانا ہے عاشقوں کا، حضورِ جنگل میں جا کے بیٹھو

ہیں دکھاؤ نہ دردِ چہرا، لے یہ وحشت کی گرد چہرا  
رہے گا تصویرِ دردِ چہرا جو روگ ایسے لگا کے بیٹھو

جنابِ انشا یہ عاشقی ہے، جنابِ انشا یہ زندگی ہے  
جنابِ انشا جو ہے یہی ہے، نازاں سے دامنِ چہرا کے بیٹھو



15 "کوئی مہری بند سے اٹھاوے تو؟"

"اگر کوئی کسی کام سے اٹھاوے تو برا نہیں لگتا اور ویسے عموماً ایسا ہوتا ہے۔"

16 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا رکعتیں ہیں؟"

"ڈرامٹک جوتے ویسے۔ کیونکہ یہ چیزیں شخصیت کی عکاسی کرتی ہیں۔"

17 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ آئینہ دیکھوں اور کچھ سوچوں اپنے بارے میں۔"

18 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی آزادی ہوتی تو؟"

"ابھی بھی اپنی مرضی سے ہی گزار رہی ہوں۔"

19 "اپنے آپ کو تک بے بس محسوس کرتی ہیں؟"

"جب سامنے والا شخص بہت ٹھیکو ہو اور آپ کی بات سمجھنے کو تیار نہ ہو۔"

20 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"

"مجھے کبھی ایسی مشکل نہیں ہوتی میں اپنے شوق اور ضرورت کے لیے وقت نکال سکتی ہوں۔"

21 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"

"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔"

22 "اگر دعا کچھ مل سکتا تو کیا آتیں؟"

"اپنی کامیابیوں کی دعائیں سب کی صحت و تندرستی کی دعا کریں۔"

23 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"

"نہیں کوئی بھی نہیں۔"

24 "جب آپ پہلی مرتبہ نیا ہی استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟"

"میں تو لکھیں لاٹینیں مار کر دیکھتی ہوں کہ چل رہا ہے کہ نہیں۔"

25 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر کٹھنی محسوس ہوتی ہو؟"

"کچھ لوگ ہوتے ہیں جن سے تعلقات رکھ کر لگتا ہے کہ ہم نے غلطی کی ہے۔"

26 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"نہیں میں کھانا پینا کبھی نہیں چھوڑتی۔ مجھے بھوک بہت لگتی ہے۔"

27 "کبھی سوچا کہ آج سے چند سال بعد آپ کہاں ہوں گی؟"

"سوچتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ میں کنٹسٹ بین چاؤس گی اور میری لائف سیکور ہوگی۔"

28 "کھانا کس کے ہاتھ کانا ہوا ہے؟"

"اپنے ہاتھ کی کوٹنگ کبھی مجھے بہت پسند ہے۔"

29 "ہانڈ میں کیا کھانا پسند کرتی ہیں؟"

"ہانڈ کاشٹ کرتی ہوں۔ عموماً چائے تو س۔"

30 "موزک خراب ہوتا ہے؟"

"بھوک کے وقت اور جب بہت تھک جاؤں تب تا۔"

31 "ملک میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟"

"ایک کمر کھنی ہوں یہاں تو ہر اقدام پہلے سے لیا جا رہا ہوتا ہے۔"

32 "ملک کو بحران سے کتنے نکال سکتے ہیں؟"

"قوانین پر عمل در آمد کر کے۔"

33 "پسندیدہ میٹل؟"

"جنوینیو دیکھتی ہوں۔"

34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکیاں یا لڑکے؟"

"میرا خیال ہے کہ لڑکیاں۔"

35 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"

"لگتا تو نہیں ہے کیونکہ جو چیز آپ کے نصیب میں لکھی دی جاتی ہے وہی ملتی ہے۔"

36 "قسمت پر آپ کا یقین؟"

"سو فیصد جو لکھا گیا ہے وہی ملے گا۔"

37 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"

"ذرا مزاج کو ٹھنڈا کر لوں۔ خود غصہ کم کر لوں۔"

38 "ایک سوال جو خدا سے روزانہ کرتی ہیں؟"

"نہیں کوئی سوال نہیں کرتی کہ اس نے بہت لہذا ہوا ہے۔"

39 "کبھی پھٹی حس ایکٹو ہوتی؟"

"ہاں بہت مرتبہ بہت ساری باتوں کا مجھے بہت پہلے علم ہو جاتا ہے۔"

40 "شکر آکر پہلے خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"کہ کھانا کھاؤں۔"

41 "بہت سے ڈر لگتا ہے؟"

"نہیں۔"

42 "کون سی تقریبات پسند نہیں؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے مجھے تقریبات میں جانا اچھا لگتا ہے۔"

43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"کمپیوٹر۔"

44 "جھوٹ کب بولتی ہیں؟"

"جب بہت مشکل حالات ہوں اور جھوٹ کے بغیر گزارنا ہو۔"

45 "کیا اسوار شوق سے مناتی ہیں؟"

"جی ہاں شوق سے مناتی ہوں۔"

46 "دولہنڈا کون ڈنٹے کیا لگتا ہے؟"

"میری زندگی میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

47 "ریڈیو کی فیلڈ میں سب سے بڑی برائی؟"

"لوگوں کے پاس فائو ٹائم بہت ہوتا ہے وقت کو پورے وقتوں میں استعمال نہیں کرتے۔"

48 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"

"میری چھٹی کا دن فکس نہیں ہوتا اور حس دلنا چھٹی ہوتی ہے دل چاہتا ہے کہ آرام کروں۔ کپڑوں کی ڈیزائننگ کر لوں۔"

49 "سوشل فون آپ کے اثرات؟"

"بہترن ایجاد ہے لوگوں کو ٹریس کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔"

50 "شہرت کیسی لگتی ہے؟"

"اچھی لگتی ہے لوگ پہچان لیتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔"

51 "زندگی کب بڑی لگتی ہے؟"

"بہت کم بڑی لگتی ہے۔ کبھی کبھی جب بہت ڈپریشن ہوتی ہوں تب بڑی لگتی ہے۔"

52 "صحافیوں کا ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"

"ایسا کوئی خاص سوال تو نہیں ہے۔"

53 "کوئی لڑکا مسلسل گھورتے تو؟"

"نظر انداز کر دوں گی۔"

54 "سٹارڈن میں پسندیدہ وقت؟"

"صبح کا جب آپ فریش ہوتے ہیں کاپہ جارہے ہوتے ہیں۔"

55 "کب تھکنے چلانے کو دل چاہ رہا ہوتا ہے؟"

"جب کسی پہ غصہ آ رہا ہوتا ہے۔"

57 "زندگی میں کس چیز کی محسوس ہوتی ہے؟"

"چیز تو نہیں مجھے اپنی ای کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ہاں کامیاب بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔"

58 "صحیح ہو رہی لگتی ہے؟"

"نصیحت کرنے کا اگر انداز اچھا ہو تو نصیحت بڑی نہیں لگتی۔"

59 "رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟"

"ایسا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ چھوٹی سونی باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

60 "غصہ کب آتا ہے اور رد عمل کیا ہوتا ہے؟"

"جب کوئی میری بات نہ سمجھ رہا ہو اپنی ہی بات پہ قائم ہو تو پھر غصہ آتا ہے پھر میں بولنا شروع کر دیتی ہوں۔"

"کنٹرول تو مجھے اپنے آپ پر اچھا خالص ہے۔ اپنے جذبات پر آسانی سے کنٹرول کرتی ہوں۔"

63 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"

"ضروری نہیں اور محبت بہت سارے لوگوں سے ہو سکتی ہے۔"

64 "کب ہانگ کر تختہ لیا؟"





میں سمجھتی ہوں کہ دنیا کے بہت سارے پروفیشنلز میں میڈیکل کا پروفیشن سب سے زیادہ اچھا اور محفوظ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر کسی بھی شعبے کا ہو وہ انسانوں کے لیے ایک نعمت ہوتا ہے اور انسان کی صحت کا سارا دار و مدار روایت ہی ہوتے ہیں جن سے ہم اپنی پسندیدہ خوراک چبا کر اپنی جان بناتے ہیں۔

دانتوں کے مسائل کا ماہر ڈاکٹر مرزا خالد بیگ سے ایک انٹرویو میں دانتوں کی بیماریوں اور لن کے علاج پر بات ہوئی جو آپ کی نذر ہے۔

”کیسے ہیں ڈاکٹر خالد! اور یہ بتائیں کہ میڈیکل کی فیلڈ میں آنے اور خاص طور پر Dentist بننے کی کیا وجوہات تھیں؟“

”ڈاکٹر بننے کا تو مجھے بچپن سے ہی شوق تھا اور جب والدین نے میرا اس طرف رجحان دیکھا تو میرے والد صاحب نے کہا کہ اگر آپ کو میڈیکل کی فیلڈ میں آنا ہے تو پھر آپ Dentist بنیں کیونکہ یہ ایک سیکینڈل

دانتوں کے امراض کے مگاہر

## ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے ملاقات

شاہین رشید

جما سکتے کی۔ عموماً لوگ اس وقت علاج کے لیے آتے ہیں جب دانت کافی خراب ہو چکے ہیں۔ اس وقت آپ ان کے جراثیم سے بچنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟

”اس وقت ہم مانگ کا استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جراثیم کا ہم بھی شکار ہو سکتے ہیں اور ہمارے منہ کے جراثیم بھی ان کو متاثر کر سکتے ہیں مانگ اور دستاویں کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔“

”رہ بھی رکھا گیا ہے کہ دانتوں کا علاج کروانے وقت لوگ خوفزدہ ہوتے ہیں۔ کیوں؟“

فیلڈ ہے۔ اس میں انتر بھی ہے اور نایاب بھی زیادہ حاصل ہوتی ہے تو بس والد صاحب کے کہنے پر اور پھر اپنے شوق کی وجہ سے Dentist بنا۔“

”آپ ڈاکٹروں کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ کے ہاتھ لوگوں کے منہ کے اندر ہوتے ہیں اور اسپیل بھی آرہی ہوتی ہے۔ تو کچھ محسوس ہوتا تھا آپ کو؟“

”شروع میں محسوس ہوتا ہے مگر پھر انسان آہستہ آہستہ ”لو زینو“ ہو جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”گویا آپ کی عادت ہو گئی ہے لوگوں کے منہ میں

- ”مجھے یوں کہ بہت پسند ہے۔“
- 78 ”ایک چوت لٹری بے ساختہ کیا کہتی ہیں؟“
- ”دو چ لٹری ہے رو سے بولتی کچھ نہیں۔“
- 79 ”بستر لیٹنے ہی نیند آجاتی ہے یا کہ نہیں لیٹتی ہیں؟“
- ”عموماً جلدی نیند آجاتی ہے۔“
- 80 ”انسان کا بہترین روپ مرد/عورت؟“
- ”ضروری نہیں کہ مرد ہی بہترین روپ ہو اور ضروری نہیں کہ عورت ہی بہترین روپ ہو۔ میرا خیال ہے مرد ہو یا عورت انسانیت بہترین روپ ہے۔“
- 81 ”کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟“
- ”ڈائننگ ٹیبل ہے گھر میں تو اسی پر کھاتی ہوں۔“
- 82 ”کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتی ہیں؟“
- ”مخالفے بہت زیادہ استعمال نہیں کرتی۔ بولتی بہت ہوں مگر کوئی مخصوص الفاظ کا استعمال زیادہ نہیں کرتی۔“
- 83 ”مروکب پر نکتے ہیں؟“
- ”جب وہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں۔“
- 84 ”پیسہ کس شکل میں خرچ کرتی ہیں؟“
- ”بینک میں کیش کی صورت میں۔“
- 85 ”اگر زہب میں ایک قفل کی اجازت ہوتی تو کس کو قفل کرتیں؟“
- ”نہیں میں کسی سے ایسی نفرت نہیں کرتی کہ قفل کا سوچوں۔“
- 86 ”بینڈ کی سائیز ٹیبل یہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟“
- ”سوجاں ڈائری، چین پائی کا گلاس۔“
- ”اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے؟“
- ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

- ”ہاں کہیں نہیں کسی کو میری برتھ ڈے پر تحفہ دینا یاد نہ رہے تو کہہ دیتی ہوں کہ میرا گفٹ کمال ہے۔ اپنے سب بھائیوں سے مانگ لیتی ہوں۔“
- 65 ”پسندیدہ سخانی؟“
- ”اخبارات کا زیادہ مطالعہ نہیں کرتی۔ اس لیے معلوم نہیں۔“
- 68 ”گھر والوں کی کس بات سے سوز آف ہو جاتا ہے؟“
- ”وہی بات کہ کوئی مجھے غلط سمجھ رہا ہو اور میں ٹھیک ہوں۔“
- 69 ”کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟“
- ”جو توں، کپڑوں پر اور اپنی گاڑی پر۔“
- 70 ”نٹ یا تھپہ پہ کھڑے ہو کر کس چیز کا جائزہ لیتی ہیں؟“
- ”کہ ہمارے یہاں کتنی بری ڈرائیونگ کی جاتی ہے کوئی ٹریفک کے قوانین کو فالو نہیں کرتا۔“
- 71 ”کس کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟“
- ”نہیں ایسا نہیں ہوتا ہے سب کتالی یا تیس ہیں۔ آپ سب چیزوں کے بغیر نہ سکتے ہیں۔“
- 72 ”کس شخصیت سے خوفزدہ رہتی ہیں؟“
- ”کوئی نہیں مجھے ڈر نہیں لگتا کسی سے۔“
- 73 ”اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟“
- ”اچھی عادت یہ ہے کہ میں بہت محبت کرنے والی ہوں۔ بری یہ کہ لاپرواہ ہوں۔ چیزیں بہت پھیلا دیتی ہوں۔“
- 74 ”دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تازہ محسوس کرتی ہیں۔“
- ”وہی صبح کے وقت۔“
- 75 ”آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو؟“
- ”مجھے ٹھنڈا لگتی آتی ہے پھر بھی اگر کھل جائے تو دعا میں پڑھ لیتی ہوں۔“
- 76 ”ایک شام جو آپ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں؟“
- ”نہیں کوئی خاص شخصیت نہیں ہے۔“
- 77 ”کس رنگ کے لیے کتنی ہیں کہ کاش۔ میرا ہوتا؟“



"اس کی وجہ یہ ہے کہ دانت کا علاج زیادہ تر ڈرمل سے ہوتا ہے تو لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ہمیں درد ہو گا۔ درد سہی ہو جائے کہ انجکشن بھی لگانا پڑتا ہے تو چونکہ انجکشن اور ڈرمل کا استعمال زیادہ ہے اور پردیسچر میں درد بھی ہوتا ہے تو جب مریض دوسروں کو جا کر دیکھتا ہے تو پھر لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم علاج کروائیں گے تو ہمیں بھی درد ہو گا لہذا جب تک گزارا کر سکتے ہیں کریں اور لوگوں کی اسی سوچ کی وجہ سے بہت کچھ خراب ہو چکا ہوتا ہے تب لوگ علاج کروانے آتے ہیں۔"

"دانتوں کی کوئی کون سی بیماریاں ہوتی ہیں؟"  
 "دانتوں میں کیڑا لگنا اور کس میں انفیکشن ہونا اور گال کی بیماری میں پھسلے نکال آنا اور کینسر کی بیماری بھی ہو سکتی ہے اور مسوٹوں میں تریاکی بیماری ہو سکتی ہے۔"

"اور کامن بیماری کیسے دانتوں کی؟"  
 "دانتوں میں کیڑا لگنا اور کیڑا لڑواؤں سے ہو جائے تو وہ انفیکشن کا باعث بنتا ہے۔ منہ میں چھمالے ہو جانا اور پارٹیاکی بیماری بہت کامن ہے۔"

"ان بیماریوں کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟"  
 "اپنی خوراک کا خیال نہ رکھا جائے۔ بازار میں کھلے عام بیٹے والی چیزیں کھانا اور برش ناٹھنا اور روزانہ نہ کیا جائے تو بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر اگر دو ٹائم برش نہ کریں تو جو چیزیں ہم کھاتے ہیں وہ دانتوں میں چھنس کر گل مڑ جاتی ہیں اور دانتوں کی بیماری کا باعث بنتی ہیں اور اس سے تریاکی لگ جاتا ہے اور مسوٹوں کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔"

"قابل علاج کون سی بیماری ہے اور ناقابل علاج کون سی بیماری ہے؟"  
 "ناقابل علاج تو کینسر کی بیماری ہے اگر اس کی اسٹیج برہہ جائے یعنی بہت دور میں پتہ چلے تو۔ یا کچھ مسوی امراض ہوتے ہیں جو ناقابل علاج ہوتے ہیں۔"

لیکن سب سے زیادہ ناقابل علاج کینسر ہے اگر اسے ابتدائی اسٹیج پہ نہ پکڑا جائے اگر یہ دانت سے ہڈی میں چلا جائے تو پھر موت بھی واقع ہو جاتی ہے۔"  
 "کیا دانتوں کی بیماریاں مسوٹوں بھی ہوتی ہیں؟"  
 "ہاں جی مسوٹوں بھی ہوتی ہیں۔ جیسے دانت کا صحیح نہ بنایا جلد کے جو امراض ہوتے ہیں وہ منہ میں بھی آ جاتے ہیں۔ پھیلاؤں کا براہ نام بھی عموماً مسوٹوں ہوتا ہے اور اس کا کوئی خاطر خواہ علاج بھی نہیں ہے۔"  
 "پائرا کیا ہوتا ہے اور روس کنال کیا ہوتا ہے؟"  
 "مسوٹوں میں سوزش ہو جانا پائرا کہلاتا ہے اور اس سے دانت کی جڑیں متاثر ہوتی ہیں اور دانت ہلنا شروع ہو جاتا ہے۔ دانت کے اندر جو کس ہوتی ہے ہم اس کو نکال دیتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ روس کنال نہیں کروانا چاہیے کیونکہ پھر آپ کے دانت ایک زندہ لاش بن جائیں گے۔"

(بے ساختہ نہیں)۔ "ایسا نہیں ہے۔ دانت کا انفیکشن جاری رہتا ہے اور تکلیف میں ہوتی رہتے رہتی رہتی اسٹیج سے کھانی سکتا ہے ایک طرح سے دانت save ہو جاتا ہے۔ نکلوانے سے تو بہتر ہے کہ روس کنال کروا لیا جائے دانت اپنی جگہ موجود رہتا ہے اور کھانے پینے میں بھی مشکل نہیں ہوتی اور ٹھنڈا گرم بھی نہیں لگتا۔"

"کیڑا لگنا کیا ہوتا ہے۔ اور یہ عموماً بچوں کو بھی لگ جاتا ہے؟"  
 "یہ ایک بیکٹیریا ہوتا ہے جو دانت کو کھاتا ہے اور مائیکرو اسکوپ سے نظر آتا ہے اس کو ہم عام زبان میں "کیڑا" کہتے ہیں اور اس کے لٹنے کی وجہ بھی صحت مند غذا نہ کھانا اور برش نہ کرنا ہے اور کھانا دانت میں رہ جائے تو پھر اس جگہ یہ بیکٹیریا جمع لیتا ہے اور جب وہ Grow ہوتا شروع ہو جاتا ہے تو اسے خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر وہ دانت کو کھاتا ہے۔"

"ایک صحت مند انسان کے دانت کس عمر سے خراب ہونا شروع ہو جاتے ہیں؟"  
 "اس کے لیے کوئی عمر مخصوص نہیں ہے بعض اوقات تو دودھ کے دانت ہوں تب سے ہی خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لیے پریشانی والی بات اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ ٹوٹ کر دوبارہ آجاتے ہیں لیکن جب مستقل دانت نکلیں اور ان کی پرورش کی جائے تو پھر کم عمری سے ہی خراب ہونا شروع ہو جائیں گے اور اگر خیال رکھیں گے تو سو سال میں بھی آپ کے دانت خراب نہیں ہوں گے۔ یہ بات ریسرچ نے ثابت کی ہے کہ اگر آپ خیال رکھیں گے تو آپ کے دانت خراب نہیں ہوں گے یہ سوچنا کہ اب اتنی ایج ہو گئی ہے اب تو دانت ملیں گے ہی۔ تو ایسا نہیں ہے۔ دانتوں کا ہلنا ان کی خرابی اور تکلیف دینے کا تعلق عمر سے ہرگز نہیں ہے۔"

"implant کیا ہے؟ کیا جانتے ہیں کہ implant کروالیں تو دانت صحت مند کی گئی ہے یا محفوظ ہو جاتے ہیں؟"

"بنیادی طور پر ہڈی کے اندر اسکرو ڈرل کر کے دسے دیتے ہیں وہ اسکرو as a root کام کرتا ہے اور اس کے اوپر کراؤن ڈیولپٹ کرتے ہیں۔ جہاں آپ کے دانت تھیں ہوتے وہاں ہڈی کے ذریعے ایک اسکرو جاتے گا اور اس کے اوپر ایک کراؤن ڈیولپٹ ہو گا۔"

"پھر تو یہ تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہو گا۔"  
 "تکلیف دہ اتنا نہیں ہے جتنا لہا ہے۔ تکلیف اس لیے نہیں ہوتی کہ من کر دیے ہیں اور سرجری ہوتی ہے اور اس کام میں چار سے چھ مہینے تو لگ ہی جاتے ہیں اور قیلر کے چانسوز بھی ہوتے ہیں۔"  
 "دانت فکس کروانا کیا ہوتا ہے؟ اب لوگوں کی اکثریت دانت فکس کروا لیتی ہے۔"

"یہ بنیادی طور پر اسٹیل کا ایک کراؤن ہوتا ہے جو کہ دانتوں کے اوپر سیمنٹ ہو جاتا ہے اس کو

فکس دانت کہتے ہیں یہ اپنے ہی دانتوں کے اوپر ہوتا ہے۔"  
 "کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دانت فکس نہیں کروائے جائیں۔ اس سے کینسر ہو جاتا ہے یا کچھ اور چیزیں گئیں؟"

"تمہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ کینسر جن چیزوں سے ہوتا ہے اس کو تو لوگ نہیں چھوڑتے جیسے سگریٹ کا استعمال پھیلاؤ لگنا پان اور تمباکو کا استعمال اور جن سے کینسر نہیں ہوتا ان کے لیے شوہر بچا دیتے ہیں اور انہی تک کوئی کیس ایسا سامنے نہیں آیا کہ Implant کی وجہ سے یا فکس کروانے سے کسی کو کینسر ہوا ہو۔ اس میں کسی قسم کا رسک فیکٹر بھی نہیں ہے۔"

"مشہور شخصیات بھی امپلانٹ اور فکس کرواتے ہیں؟"  
 "بالکل کرواتے ہیں یہاں نام لینا مناسب نہیں ہے مگر جب میں اس کام کی رٹنگ لے رہا تھا تو ایک مشہور شخصیت کے دانت فکس کیے تھے۔"

"اکثر دانتوں کے اوپر کالے رنگ کے اسٹون سے بن جاتے ہیں۔ یہ کیا ہوتا ہے؟"  
 "یہ بھی ایک بیکٹیریا ہوتا ہے جو کیم کے کور کے اندر Grow بھی ہوتا ہے اور چھپا ہوا بھی ہوتا ہے یہ اسٹون اس وقت بنتے ہیں جب تھیک طرح سے برش نہ کیا جائے اور پلاک کو 72 گھنٹے ہو جائیں تو پھر کیمیکل بنع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس بیکٹیریا کی غذا ہڈی ہوتی ہے جو کہ خطرناک ہے۔"

"دانتوں کا چیک اپ سال میں کتنی مرتبہ کروانا چاہیے؟"  
 "ہر چھ مہینے کے بعد چیک اپ ضرور کروانا چاہیے۔ مگر یہاں تو لوگ سالوں چیک اپ نہیں کرواتے اور اس دوران اگر خدائے خواستہ سے کینسر ڈیولپ ہو رہا ہو تو انہیں پتہ نہیں چلتا۔"  
 "اب کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"



”میرے آپ بچاؤ اور والد کا تعلق وہی ہے۔ ہم اردو اسپتال تک ہیں۔ میرے والد نے انڈیا آ کر آئیٹس سے اور وہ کرل کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ والد ہاؤس وائف ہیں۔ میں 6 مارچ 1980ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ تم تین بھائی اور ایک بہن ہے اور میرا عمر پندرہ ہے۔ بڑی بہن ہاؤس وائف ہیں۔ بڑا بھائی کسیپوٹر سائنس کے پروفیشن سے وابستہ ہیں اور چھوٹا بھائی بی بی اے کا طالب علم ہے۔ ابتدائی تعلیم بہاولپور اور گوجرانوالہ میں ہوئی۔ میٹرک کے بعد کراچی آگئے یہاں ڈی جے سائنس کالج سے انٹریک۔ جناح میڈیکل ڈینٹل کالج سے گریجویشن کیا۔ جناح اسپتال میں ہاؤس جاب کی کچھ عرصہ سول اسپتال میں کام کیا لیاقت میڈیکل اسپتال میں کچھ عرصہ کام کیا۔ پھر انگلینڈ چلا گیا وہاں سے ایم ایچ بی ایس آری ایس کی ڈگری حاصل کی۔ واپس پاکستان آیا اور یہاں پرائیویٹ پریکٹس کے علاوہ عیاشی شہید اسپتال میں بھی پریکٹس کرتا ہوں۔“

”بلکہ میں واپس آنے کی کیا وجوہات تھیں اور آپ کا تعلق ریٹائر کیا تھا؟“

”میرے والد صاحب کی طرف سے تھوڑی سی پابندی تھی کہ تعلیم مکمل کر کے اپنے ہی ملک میں پریکٹس کرنی ہے۔ جہاں تک پڑھائی کا تعلق ہے تو میں پڑھائی میں پیشہ ہی اچھا رہا۔ زیادہ تر میری پوزیشن آئی تھی۔ فرمٹ پرو فیشنل سیکنڈ پرو فیشنل اور فائنل پرو فیشنل میں میں نے پوزیشن حاصل کی تھوڑے پروفیشنل میں کوئی پوزیشن نہیں تھی۔ مختلف مضامین میں Distinction لی یعنی 5 مضامین میں میری Distinction ہے میری اور تین سال کی لڑکا لڑکی بھی مجھے ملی۔ میرا بچہ 2004ء میں مکمل ہوا۔ 2005ء میں میری ہاؤس جاب ختم ہوئی 2006ء میں لندن چلا گیا 2007ء میں واپس آیا۔ اور تب سے اب تک میں پرائیویٹ پریکٹس بھی کرتا

ہوں اور عیاشی شہید اسپتال میں بھی بیٹھا ہوں پرائیویٹ پریکٹس میں میں نے مختلف ڈاکٹرز کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔“

”کسی مریض نے کبھی تنگ کیا آپ کو؟“

”ہاں کیوں نہیں؟ فلی مریضوں نے تنگ کیا ہے مگر ہمارا پروفیشن ایسا ہے کہ ہمیں ری ایکٹ نہیں کرنا ہوتا۔ عیاشی شہید اسپتال ہوا کوئی بھی سرکاری اسپتال نہیں تو ہر مریض ہی تنگ کرتا ہے کیونکہ کنڈیشن ایسی ہوتی ہے کہ ہر مریض۔ اب سیٹ ہوتا ہے۔ تو وہ چلا تا بھی ہے اور غصہ بھی کرتا ہے۔ مگر ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

”وہیے مزاج! کسے ہیں آپ؟“

”وہیے تو اللہ کا شکر ہے میں نرم ہوں اور یہ نرم مزاجی ہی تو ہے کہ مریضوں کی بات پر ہم غصہ نہیں کرتے۔ ورنہ اگر غصہ چیز ہوتا تو کبھی کبھی تو مریض اتنا تنگ کرتا ہے کہ ہم اس پر غصہ نکال دیتے ہیں۔ مگر کبھی ایسا نہیں کرتا۔“

”اور لائف پارٹنر کا انتخاب بھی آپ نے ابھی تک نہیں کیا کیوں؟“

”میں آج کل ایف سی بی ایس F.C.P.S کی تیاری کر رہا ہوں اس کی ڈگری مجھے مل جائے گی تو میں سرجن بن جاؤں گا۔ اگر ابھی شادی کر لوں گا تو پھر میں اپنی پڑھائی پوری نہیں دے پاؤں گا۔“

”آپنا پسندتے کریں گے؟“

”نہیں۔ والدین کی پسندتے کروں گا۔ یہ ان کا ہی شعبہ ہے۔ انہی کا ارمان ہوتا ہے۔ انہی کی خواہش کا احترام کروں گا۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے اجازت چاہی۔

ماڈل \_\_\_\_\_  
 ڈائریکشن \_\_\_\_\_  
 صائمہ \_\_\_\_\_  
 موصیٰ رضا \_\_\_\_\_  
 میک آپ \_\_\_\_\_  
 روزنامہ میوٹی پارلر \_\_\_\_\_

## خواتین ڈائجسٹ

خط لکھانے کے لیے پتہ  
 خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔  
 Email: info@khawateendigest.com  
 khawateendigest@hotmail.com



### ملانکہ گوثر۔ بسم اللہ پور

”انفصال کر“ بھری سعید کا کہنا تو بہت اچھی ہے مگر ایسا کہ اور چھوٹی بہت سے اس میں۔ ”میرا آخر شب“ کی رفعت تاج کی کہتوں کو میرا عقیدت ہے۔ اس وقت والی قسط پڑھ کر کہنے پر نے زخم نازہ، اونٹنہ اپنے اور اپنے بچوں کے پسندیدہ گیسٹر مستنصر حسین ماروڑ کا انٹرویو پڑھ کر بے حد لطف آیا۔ بالی مستقل سلسلے بھی ٹھیک تھا کہ تھے۔

”میں آج کل ایف سی بی ایس F.C.P.S کی تیاری کر رہا ہوں اس کی ڈگری مجھے مل جائے گی تو میں سرجن بن جاؤں گا۔ اگر ابھی شادی کر لوں گا تو پھر میں اپنی پڑھائی پوری نہیں دے پاؤں گا۔“

”آپنا پسندتے کریں گے؟“

”نہیں۔ والدین کی پسندتے کروں گا۔ یہ ان کا ہی شعبہ ہے۔ انہی کا ارمان ہوتا ہے۔ انہی کی خواہش کا احترام کروں گا۔“

اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے اجازت چاہی۔

### سائزہ رضا۔ کراچی

کتے بہت سارے ساروں کے سورج خواتین کے ساتھ دیکھے ہیں کہ اب یاد نہیں بہت عرصہ بعد تیسرا لکھ رہی ہوں۔ ڈائجسٹ کے مندرجات پر کہ۔ اور وجہ۔ وجہ بہت ساری سال کا پیلا شمارہ اور مستنصر حسین ماروڑ کا انٹرویو۔ مزہ آگیا ایک ایسا آدمی کہ جس کے ہارے میں میں بر ملا کہتی ہوں کہ اپنے لبا کے بعد اور چاچوؤں کے بعد جو پیلا آدمی اچھا لگا وہ یہی تھے چاچاچی۔ باہری دنیا کا پیلا بندہ جو پیشہ اچھا لگا اور اتنا اچھا لگا کہ آج تک وہ اسی مقام پر براجمان ہے وہ جگہ کوئی اور سارے ہی تھے۔

سال کے آغاز میں ایک اچھا آتما زخم رسالہ گزشتہ میں کیے جانے والے انٹرویو بھی بے حد سچے معلوم ہوئے۔ خصوصاً ”عاصمہ شیرازی“ حلد میرا کشف عیاشی وغیرہ کے انٹرویو تو مگر گزشتہ برس کا سب سے نمایاں انٹرویو کسی بنگلہ دہی (ڈاکٹر کلثوم ابوالشیر) خاتون کا تھا ان دونوں ہم ساجدہ حبیب کا ”بعد زوری اور وفا میں“ ”بڑھ کر ویسے ہی بہت زور دینا لیں اور پختہ دوسری کی آگ میں جس رتبہ تھے اور اس انٹرویو کو پڑھ کر دل اور جگر پھر پھر کیا زخم کا مینہ آج بھی پرانے زخموں میں نہیں دیتا ہے اور ایسے کی روگ ہیں جو آج بھی اس البیہ پر کھستے ہیں مگر ان کا اندازہ فکری اور ہم سے الگ ہو جانے پر طمانیت کا اظہار دل کو لہو لہو کر گیا۔ اس خاتون کے انٹرویو نے سیکلے ساجدہ حبیب اور اب رفعت تاج ساجدہ کے دل کے اندر زخمی کی تھی کوئی معلوم نہیں اور سوا کو ایسا لگا یا نہیں ایک اپن فورم میں یہاں اور وہاں کے نئے پرانے لوگوں سے ضرور پوچھا جائے کہ کیا اچھا ہوا تھا اور کیا برا (بہر حال میری رائے میری سوچ سے بہت متفق نہ بھی ہوں گے۔)

اس ماہ پر چاہیں تے ٹائٹ کوچ میں برتھ ریٹ کر کھل میں چھپ کر رہا اور یہ بڑا دلچسپ تھا۔ اتنے بہت سارے لوگوں کے سچ ہوتے ہوئے بھی آپ اپنی دیتا میں کھوجا جاتے ہیں

”میں کی دنیا واقعی ہوتی ہے ہر جگہ رنگ بدلتی ہی کبھی روز خیالی ہی روشناس بھی اتنا اندھیرا کہ لگتا ہے بیانیہ چلی



مجھے بھی واسے رو یعنی اور زندگی شانہ بگتے لگتی ہے۔ ہاں مگر ایک مسلسل خوشبو اور خوشی ہمراہ رہتی ہے۔ اپنا سے ملنے کی اور ہیرا ملی کی مرگ ملتی لکڑی آٹیلوں سے اٹھتا ہوا ہم کراچی جیسے شہروں میں رہنے والے لوگ فطرت کو خود سے اتنا قریب پا کر بے خود ہو جاتے ہیں کیا آپ سب بھی ایسا محسوس کرتی ہیں؟

ج۔ ہاں سارہ ہی آپ کا خوب صورت خط ہی پر اپنی یادیں تازہ کر گیا۔ جب پرانی قارئین کے خط ملتے ہیں تو لگتا ہے کہ دیرینہ دوستوں سے ملاقات ہو گئی ہو۔ قوائین ڈائجسٹ سے آپ کا تعلق اتنا رانا ہے یہ دیرینہ تعلق ہمیں یقین دلاتا ہے کہ قوائین ڈائجسٹ کا معیار آج بھی برقرار ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تعلق کو ہمیشہ قائم رکھے۔ آمین۔

**شعق ساحرہ گوجرہ**

اکثر مائیں اپنی بیٹیوں کو اور بڑی نہیں چھوٹی بیٹیوں کو ڈائجسٹ پڑھنے نہیں دیتیں۔ تو مجھے ان سب سے کہنا ہے کہ وہ بلیز کسی کو بھی ڈائجسٹ پڑھنے سے نہ روکیں۔ تو اللہ جبر میں رو یعنی کی کہن ہے۔ بہت سے بچکے ہوئے بیٹیوں کو سیدھا راستہ دکھانا ہے۔

اس کی ایک مثال میں آپ کو بتانی ہوں جب میں 10th میں تھی (اب بھی میں کوئی بہت بڑی نہیں ہو گئی فرسٹ ایئر میں ہوں) تب ایک لڑکی جو کہ میری ہی کلاس میں پڑھتی تھی۔ ایک دن میں ڈائجسٹ پڑھ رہی تھی تو کہنے لگی۔

”اس میں ایسا کیا ہے جو تم بریک میں امد ہر فارغ ہو بیٹھ

میں اسے ہی پڑھتی رہتی ہو؟“

تو میں نے ڈائجسٹ اسے دیا اور کہا ”آج تم اسے گھر لے جاؤ اور اسے پڑھو۔ تمہیں جواب خود مل جائے گا“ اس سے اگلے دن جب وہ اسکول آئی تو اس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔ ”میلے آپ کو اسی کی زبانی سنائی ہوں۔“

”شعق! مجھے سمجھ میں نہیں آ رہی میں تمہیں کیسے تھینکس کہوں۔ تم نے مجھے ایک بہت بڑا نطفہ قدم اٹھانے سے بچالیا۔ میں گلی کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی اور میں جانتی تھی کہ میرے والدین اس رشتے سے نہیں مانیں گے“ اس لڑکے کے والدین بھی نہیں مانتے کیونکہ

ہماری برادری الگ ہے وہ لڑکا مجھ سے کہتا تھا کہ ہم بھاگ جائیں گے اور میں ایسا کرنے کے لیے تیار بھی تھی میں سمجھتی تھی کہ میرے والدین میرے دن ہیں جو میری خوشی کے درمیان آ رہے ہیں۔ لیکن کل اس ڈائجسٹ میں ایک کہانی پڑھی اور مجھے پتہ چلا کہ میرے والدین نہیں بلکہ وہ لڑکا میرا دشمن ہے اور میں کتنے غلط راستے پر چلنے والی تھی۔ شعق! تم نے مجھے اس اندھے گمو میں گرنے سے بچالیا جس میں اگر میں گر جاتی تو میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی مرنے والے تھے۔ میں نے کل ہی اس لڑکے کا ذرا ہوا موبائل اسے واپس کر کے اس سے ہر رابطہ ختم کر دیا۔ مجھے اس دلیل سے بچانے والا یہ ڈائجسٹ ہی ہے اور آئندہ زندگی میں میں کسی بھی اس سے نا مانیں توڑوں گی۔“

آپ سب حیران ہو رہے ہوں گے لیکن یقین جاتیے مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں تمہیں سکتی۔ اسی لیے میں کہتی ہوں کہ آپ کبھی بھی کسی کو ڈائجسٹ خاص طور پر ”شعق“ اور ”قوائین“ پڑھنے سے نہ روکیں۔

ج۔ ہاں یہی شعق! آپ کا خط شائع کر رہے ہیں۔ وہ تمام لڑکیاں جن کے والدین لڑکیوں کو قوائین ڈائجسٹ پڑھنے سے منع کرتے ہیں۔ وہ اپنے والدین کو یہ خط دکھا سکتی ہیں۔

**سوید حیدرہ۔ (ای میل)**

مددوش سی ماڈل کالج میں منظر کا چند اڈالے اچھی ہی لگ رہی تھی۔ پھر فائنل رشانہ کی کا ”محبت خواب سحر“ پڑھا اور دن انکر پبلیز اعلیٰ قسط آخری قسط ہو۔ راحت ہی کا ”امرت اور چال“ زیادہ پسند آیا۔ گھر انہوں نے ایذا چھاپا نہیں کیا۔ کیا تمہارا دن میں سے کسی ایک سے شادی کروا دیتیں آپ؟ پبلی مارچ 2003ء میں ڈائجسٹ خرید تو وہ خبر کا نمونہ تھا اور اس میں بشری سعید کی تحریر ”رفصں جتناں“ پڑھ کر تب سے ہی ہم قوائین کے قیمن ہو گئے تھے۔ ”سفال کر“ بہت عرصے بعد ایسی عمدہ تحریر پڑھنے کو ملی ہے۔ مگر ایک درخواست ہے آپ سے کہ بلیز اس کو جلدی ختم کر دیجئے گا۔ زیادہ طول دینے سے کہانی کا چارم ختم ہو جاتا ہے۔ افسانوں میں تو ہمیں ”یہ دل آپ کا ہوا“ عفت سحر ظاہر اور ”۴ سال تے جانا“ ہم تمام زیادہ پسند

آجے شفقت جی اے چاری رو بھائی بھی سن لیں۔ کہو اوریں اب از میرٹھ سے اظہار محبت ایک اب تو شادی ہی کروا دیں۔ بہت مزے کے گزارا ہوں یہ دونوں اور بے چارہ شیرا کھن ایذا چھاپا ہوا تھا اس کا بھی بلیوکی سوچا چھٹی تھی جس سے اس کی سوچ کچھ بدل گئی۔ بالی سب کچھ بھی پانچھا تھا۔ آپنی ایسے بھی بگاڑنا کھنے کا شوق سے تو میں کیا کروں؟

ج۔ ہاں یہ سوید ایذا آوری کا شکر ہے۔ ”سفال کر“ کی زیادہ اشاد نہیں ہیں۔ آپ کو طوالت کی شکایت نہیں ہوگی۔ تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

**انعم عزیزین عاتقہ۔ فیصل آباد**

یقیناً ”میری زندگی کا دوسرا خط ہے میں نے پہلا خط لکھا اور وہ آپ کو پسند نہیں آیا۔ بلیز اس بار خط شامل کر لیں اور خط بھیجئے کی تحریریں لکھی جائیں اور ہمیں ڈائجسٹ لیت مانتا ہے اس لیے۔ ڈائجسٹ گھر میں مجھے اور بقیہ افراد کو بے حد پسند ہے۔ بہت پسند۔ ماڈل بہت خوب صورت تھی بے حد مضمون سی۔ ”انکر کھن ڈائجسٹ“ اور ”موسم کے پھول“ پڑھا اور جی کے مشورے سے مسائل کا حل اور تمام نا اہل اور سلسلے ایسے تھے ”سفال کر“ اچھا ہے ”چراغ آفرشب“ کچھ پور تھا پسند نہیں آیا۔ فرحت آگنی کہاں ہیں انہیں دھونڈیں۔

ج۔ انعم عزیزین اور عاتقہ خواندگی کی محفل میں خوش آمدید فرحت اشتیاق آج کل ناول لکھ رہی ہیں۔ آپ جلد ہی ان کا ناول پڑھ سکیں گی۔

قوائین ڈائجسٹ کے لیے آپ خط اس طرح لکھیں کہ میٹھے کی 22 مارچ تک ہمیں موصول ہو جائے۔

**مریم بانو۔ گارڈن کراچی**

میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں میرے بچے بھی ماشاء اللہ صاحب اوارا ہیں۔ میری بھانجیاں آپ کے ادارے سے نکلنے والے تمام ڈائجسٹ پڑھا منگوائی ہیں۔ میں نے ان سے مل کر ہی پڑھا تو پسند آیا اور یوں بس دل چاہا کہ ڈرا خود کہیں بھی آنا لیا جائے۔

آپ کے ڈائجسٹ کی رائٹر رشاد نگار مجھے بہت پسند ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے Ary جینل پریسلے بھی

آئے تھے اور آج کل پھر ایک اور ڈرامہ آنے والا ہے۔ آپ سے یہ پوچھتا ہے کہ T.V پر لکھنے والی اور آپ کے ڈائجسٹ میں لکھنے والی کیا ایک ہی برائیاں ہیں؟

ج۔ ہاں۔ بہن! آپ نے خط لکھا ”بہت خوشی ہوئی۔ ہمارے ڈائجسٹ میں لکھنے والی رخصانہ نگار کے ڈرامے ہی فی وی جینل پر آ رہے ہیں۔“

**منار شید۔ اسلام آباد**

”شعاع“ اور ”قوائین“ تو پڑھتے ہوئے سات یا آٹھ سال کا عرصہ ہو چکا ہے اگر زندگی کی انہیں سے زیادہ ہماریں دیکھی ہوتیں تو ہمارا رشتہ اور بھی پرانا ہوتا مگر ٹوٹ تو اب بھی ہے۔

خط لکھنے کی وجہ کسی ایک رائٹر کی تعریف کرنا نہیں ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ سب رائٹرز کے انداز مخاطب اسلوب بیان اور کہانیاں گوارا ایسے ہیں کہ بہت سے دلوں کو فتح کر لیتے ہیں۔ یعنی زندگی گزارا اب تک ان رسالوں سے کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو مگر علمی زندگی میں بہت سے اہم چیزوں کے بڑے فیصلے کرنے میں ایسا دکھایا اور خوشی تو اس بات کی ہے کہ ان رسالوں میں خوب صورت انداز بیان والی رائٹرز کے ساتھ بہت ہی باادب تقاریر لکھی ہیں خط لکھنے کی وجہ مجھے دل کے جذبات کو قارئین سے شیئر کرنا تھا۔

ج۔ ہاں یہی حال خوش آمدید آپ نے اپنے مخلص جذبات سے آگاہ کیا بہت اچھا لگا۔ ”نوارہ اجمال لکھا اگر قوائین ڈائجسٹ کی تحریروں پر مفصل تبصرہ کرتیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجئے گا۔“

**ام طیفور۔ گوجرانوالہ**

چار ماہ پہلے میں نے آپ کو اپنے دو افسانے ”لڑا کھل“ اور ”جو سمجھو تو منہل یہ نہیں“ کے نام سے مجھے خطے اور کہا تھا کہ ضرورتاً نئے گا کہ قابل اشاعت ہیں کہ نہیں؟

ج۔ ام طیفور! آپ کا افسانہ ”لڑا کھل“ منتخب ہو چکا ہے۔ شامل ہو جائے گا۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ مزید لکھیں۔



شہرین خان۔ خان بیلہ

آج پہلی مرتبہ خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں اور اس کی وجہ ہے نقیسہ سعید کی تحریر "اک بارہ جو نوٹ گیا" بلاشبہ یہ ایک بہت اچھی تحریر تھی "انہوں نے بہت اچھا لکھا اس کے علاوہ مکمل ناول بھی بہت اچھے تھے راحت جیس کا "امرت اور بیکالہ" زبردست تحریر تھی۔ اس میں رانیہ کا کردار بہت اچھا تھا اور نایاب جیلانی کا "دوستی سی چار سو ہے" بہت اچھی تحریر تھی فرحت اشتیاق "عصیرہ" احمد "تہذیبہ ریاض کمال غائب ہوئی میں سلیزان سے کوئی اچھی سی تحریر لکھو" میں باقی ایف ایم 946 پر ایک مارٹک شو 8:10 آتا ہے فریڈ مارٹک کے ڈی جے یا مسٹر قاضی کا انٹرویو کریں۔

جتنے باری شہرین افواجین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں نقیسہ سعید اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف ان منظور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔ یا مسٹر قاضی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہنت قرآن۔ (ای میل) سماہ یوال

"خواتین" اور میرا ساتھ آٹھ سال پرانا ہے اس نے ایک ماں کی طرح میری تربیت کی ہے۔ ہمارے گھر میں ڈائجسٹ کو غیر اخلاقی چیز تصور کیا جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں پڑھتی ہوں۔ یہ بھی چھپ کر تو کبھی سامنے عصیرہ احمد "رخسانہ نگار عدنان" "جین سسٹرو" فرحت اشتیاق "نمو احمد" "عصیرہ سعید" "تازہ افکار اور شہہ بخاری" سمیت بہت سی رائٹرز ہماری ٹیورٹ ہیں۔ رخسانہ جی کا ناول "محبت خواب سفر" ان کی قسط کا ہر ماہ بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ رفعت ناہید سجاد کا خوب صورت منظر نگاری سے سجانا ناول "چراغِ آخرب" شاندار ہے۔ ہر ماہ اس کو پڑھتے ہوئے ہم اس کے حیرتیں کھو جاتے ہیں۔ پاکستان کی ماہرین پر ان

کی تحقیق بہت زیادہ ہے اور وہ نوجوان نسل کو بڑی فوسہ صورتی کے ساتھ ماضی کے اہم ناک واقعات سے آگاہ کر رہی ہیں۔

رج : ہنت قرآن و اک کا نام سمجھ میں نہیں آیا "فراد آپ کے والد کا نام سے آیا آپ نے خواہ نایاب نام رکھا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لئے شکر ہے۔ مختلف مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

بلقیس اختر۔ انگلینڈ

یہ میرا پہلا خط ہے گزشتہ بیس سال سے خواتین ڈائجسٹ سے رابطہ ہے میں برطانیہ میں نہیں سال پہلے آئی تھی لیکن مفاہدہ کا بہت شوق ہے سب سے "خواتین" سے رابطہ ہوا ہے "افسانوں سے لے کر سلیٹے وار ناول تک پڑھتی ہوں اور جب ناول کتابی شکل میں آجاتا ہے تو لاہوری سے لے کر پڑھتی ہوں۔ پہلے بھی خط نہیں لکھا۔

آج جس بات نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ایک بہن کا خط ہے جو جو میرے خواتین میں شائع ہوا تھا وہ ایک ناول کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی جو ہمارا کب بخاری کا ناول تھا جس میں اپنی ماں کی اولاد کو نفرت کا شکار بناتی ہے اس ناول کا نام "اک عمر کے ظلم میں" ہے جس دن میں نے یہ خط پڑھا۔ اسی دن میں لاہوری سے یہ ناول لے کر آئی تھی۔

اس رسالے نے بہت جگہ میری رہنمائی کی بہت سی تعریف کراں کم ہے۔

ج: بلقیس، بہن افواجین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کا خط پڑھ کر بے حد خوش ہوئی خاص طور پر یہ جان کر کہ اتنی دور جا کر بھی "خواتین ڈائجسٹ" سے آپ کا تعلق برقرار ہے۔

آپ نے ہماری قاری بہن کے لیے خط لکھا بہت شکر ہے۔ اچھا ہوا کہ آپ خواتین ڈائجسٹ کی تحریروں کے بارے میں تفصیلی اظہار رائے کرتیں۔ خواتین کی محفل میں شرکت کرتی رہیں گے۔

رخسار سلیم۔ سیالکوٹ

بتوری کا شمارہ ملا۔ ٹائٹل زبردست لگا۔ اپنا خط دیکھا بہت اچھا لگا۔ افسانوں میں ام میریم کا افسانہ "فیصلہ" اتنا اچھا نہ لگا۔ پلاٹ پرانا تھا۔ ام ٹائر کا افسانہ "اساں تے جانا" بہتر لگا۔ افسانوں میں سبقت حنیفہ عامر نے لی۔ حنیفہ عامر نے اچھا لکھا۔ "سفال گر" بشری نے قیسی

قسط میں بھی کمال کر دیا "ناڈٹ زبردست جا رہا ہے۔ ویل ڈن بشری سعید تھی۔ ج: رخسار جی، خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تمہارے شکر ہے۔ مختلف مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

سوجنا شہزاد۔ ایڈیٹر منور۔ ملتان

ٹائٹل گرل باری لگ رہی تھی۔ "کمانیاں اور گردلو" کے جیسے بڑھ کر مزہ آیا "مکمل ناول" "دونوں ہی اچھے تھے۔" "سفال گر" بشری سعید نے "اک بارہ جو نوٹ گیا" میں بشری جی۔ نقیسہ سعید نے "اک بارہ جو نوٹ گیا" میں بہت دلایا۔ ایسی ہی مرقطی شاہ کی موت بلکہ انیت ناک موت نے بہت دلایا۔

آپ کی بہت سی رائٹرز آج کل غائب ہیں جن میں فرحت اشتیاق "عصیرہ احمد" "تازہ افکار اور جین بہت سی ہیں۔ پلیزان سے کہیں ہمارے لیے بھی کچھ لکھیں۔

آپ سے گزارش ہے کہ FM-103 کے زیادہ سے زیادہ کاپیزز کے انٹرویو شائع کیا کریں۔ اس کے علاوہ آپ سے التماس ہے کہ اپنے تخیل شاعر خواتین "مکمل ناول" شاعر میں ایک نیا ایکٹو اور شائع نہ کیا کریں۔

ج: سوجنا شہزاد، اور منور افواجین کی محفل میں خوش آمدید ایف ایم 103 کے شعبہ اہمہ کا انٹرویو خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہو چکا ہے۔ دیگر کاپیزز کا انٹرویو بھی جلد دینے کی کوشش کریں گے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکر ہے مختلف مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شہینہ چاند نیو۔ گوٹھ پیر پریل شاہ

"خواتین" اور "شاعر" کی میں بہت پرانی قاری ہوں۔ خواتین ڈائجسٹ جہ 100 زبردست ہے۔ پچھلے سال سے 98 پر آگیا تھا وہ اس کے لیے پچھلے سال کوئی ایسا

ناول شائع نہیں ہوا تھا جو مدتوں یاد رہتا رہا یہ پھر سے 100 پر آگیا ہے اور وہ "سفال گر" کے شائع ہونے کی وجہ سے ہے۔ میری عادت ہے کہ کوئی بھی زبردست ناول پڑھتے ہوئے اس باس کا ہوش نہیں دیتا اور یہ کیفیت

بہت عرصے کے بعد وہ ایسے ناول پڑھتے ہوئی۔ پہلا ناول تو حلال کر ہے۔ "سفال گر" کے کیا ہی کہنے جب بھی بشری سعید نے لکھا بہت اچھا لکھا۔ اس ناول کا کردار "عصیرہ" بہت اچھا ہے اور پلیز بشری سعید جی اس ناول میں جتنی انگلش لکھتی ہیں تو ان کا مطلب بھی لکھ دیا کریں اور دوسرا ناڈٹ "اک بارہ جو نوٹ گیا" ہے اس کہانی نے بھی اپنا آپ جھکا دیا تھا۔ ایسی بہت سے کہانیاں ہوتی ہیں جن میں کہیں نہ کہیں توڑی بہت کی رہ جاتی ہے۔ پر اس ناڈٹ میں کہیں کوئی کی نہ تھی اور ایڈیٹر ہتھے ہوئے تو آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نایاب جیلانی کے سبب سے والے ناول بہت اچھے لگتے ہیں نایاب جیلانی جب خانوں اور شاہوں کی جوہلیوں پر لکھتی ہیں تو حقیقت میں مجھے جوہلیوں سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ پر جب جی جی کیڑی ہوئی تو جوہلیوں پر لکھتی ہیں تو بے اختیار جوہلیاں اچھی لگنے لگتی ہیں۔ جی جی سیدہ کینز شو جی شادی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بھول جائیں۔ اور آخر میں جی جی سیدہ کینز شو جی کا تعلق کس شہر سے ہے

ج: سوجنا شہزاد، آپ نے خط لکھا بہت خوش ہوئی بہت شکر ہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے قریبی ناڈٹ سے ہے۔ آج تک ان کی طبیعت سنا ہے۔ اس بنا پر لکھ نہیں پڑتی ہیں۔ بشری سعید اور نقیسہ سعید ہمیں نہیں ہیں۔ بشری اوکاڑہ میں رہتی ہیں جبکہ نقیسہ سعید کا تعلق کراچی سے ہے۔

شہناز لیشی۔ کراچی

بہت طویل مدت کے بعد پھر حاضر کچھ مجبوریاں آؤں گی آج کچھ دنوں اور کچھ گھنٹوں پر نشانیاں بھی "سوکالی طویل مدت کے بعد آئی ہوں۔

"خواتین ڈائجسٹ" جب پھر وہیں روپے کا ہونا تھا میں جب لکھی تھی چالیس روپے کا ہونا ہے اب بھی لے رہی ہوں۔

اصل میں میرے شوہر لیشی صاحب 19 ستمبر 2010ء کو مجھے چھوڑ کر چلے گئے اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے (آمین) سرورق کئی ایڈیٹ نہ لگا۔ اقبال بانو عصیرہ راحت اور پرانی لکھنے والیاں کہاں ہیں اور آواز تو دین انہیں۔







# سیرۃ الخشب



پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تمدنی اعتبار سے نکل نکلا اس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نگی مشائی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص دوام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام علم و فنس پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی یکم کے ساتھ اولادوں کو بھی آراوئی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی عین اولادیں ہیں۔ شوہر عثمان اور عبید۔

بڑی بیٹی شوہر ماں کی لادنی ہے۔ دوران تعلیم غیر معمولی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہیں۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں۔ اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی جگہ نہیں دیتیں۔ شوہر کا شوہر ہمیشہ روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسنی لے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گزیا ہے جس کی گھرائی کریم بی کے پیرو ہے۔ یہ سب کی شادی اور نوکری کرنے کے مادہ سسرال میں اس پر زبان بھری کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور نوکری کے وجود مقبول نوکری حاصل نہیں کر سکتے۔ انہیں گھر کے ماحول اور براہِ مختار فضائے اسے مکمل باپوں میں نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف تفریحی پروگراموں کے لیے پکارا جاتا ہے۔ اس کا لیتا ہے کہ گزراؤ قات اچھی ہو جائے۔

عبید آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرتا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ بائیں کی طالبہ ہے۔ وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔





عبیدہ دینی ہوئی۔ سن سے زیادہ بچپن کی سبلی عبیدہ است قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ خرابیاں بھی عبیدہ کو دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آئی جانی ہے۔ عبیدہ اسے خاص وجہ سے عزیز سمجھتی ہے۔

گھر میں چچا عبد العزیز اور ماہوں کرم بخش اپنے اسرار کے ساتھ۔ وہ جو وہ باتیں یاد میں ہیں۔ بڑی تانی بے اولاد ہیں اور بچوں کی بے پور سے پانچ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آئی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیدہ کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا یہ وہ اٹھانے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیدہ اہل برداشت ہوتی ہے تو وہ کچھ دور کے لیے حیر اور رنسا کے یہاں بھی آتی ہے جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے غلوں اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کر دیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کا صرف ایسا نرمل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈیشن میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیدہ کو سب سے زیادہ شو میں کرن شہباز کی موجودگی مسرور کرتی ہے جو شخص عبیدہ کی قابل ملاحظہ سترے کے شہو گئے آتا ہے۔ وہ دنوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے اس لیے ایک دور سے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہباز کے لیے عبیدہ کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں باجا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیدہ کی ملاقات ہوتی ہے جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ انجان رہتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

### قبضہ کا

کمرے کے وسط میں دھری گول میز اخبار کے صفحات سے بھری پڑھی ہوئی ایک ایک صفحے کے جنگلی حالت میں پھینچنے والے اخبار جس کے ہاتھ جوڑنا وہ اٹھا لیا۔ اسے سید سے بے ترتیب پھرتے۔ چنانچہ اسے ایک نچر کے اور کچھ ٹیسٹ پور تھا۔ ٹیکسیکل کی تازہ سیانی کی ناگوار باس کمرے کو بوجھل ہانے سے رہی تھی۔ چنانچہ یہ سیانی کی بڑھتی ہی ان پر لکھے حرف بودے رہے تھے۔ وہ کانڈوں کے بد رنگ ورق نہیں جیسے رہتے کھلا تے پتھار سے زہریلے سانپ تھے۔ ان کو ہاتھ لگانا تو درد نثار وہ ایک اچھتی نظر بھی ان پر ڈالتے کر ڈجا تھا۔ تیسرے روز تمہ ایک کے اوپر ایک رکھے۔

وقت شاید اتنا اہم نہیں رہا تھا۔ گزر گیا تھا یا شاید وقت نہیں گزرتا تھا رہتا ہے۔ ہم گزر جاتے ہیں۔ بہت پرانی بات نہیں تھی۔ ابھی کل یا شاید برسوں ایسے ہی ٹھیسوں میں پاکستان کی غیرت نے گالی کھائی تھی۔ حالانکہ وقت کی کل برسوں نہیں ہوتی۔ وہ سب ہماری ہوتی ہے اس نے داغ پر زور دیا۔ کب کا قفسہ تھا جب ہم اپنی تاریخ سے پیٹھے کھیلے ہیں۔ تو ایسے کھلا تے سانپ ہم پر بار بار حملہ آور ہوتے ہیں۔ 47ء کو ہم نے مصافحت جانا۔ 71ء کو ہم نے فراموش کر دیا۔ ہم اس واقعے کو بھی بھول جائیں گے۔ کیونکہ ہم پچھلی کی طرح زور فراموش ہیں۔

پتا نہیں کیوں وہ اس ایک سمرنی پر توجہ مرکوز نہیں کر پاتا تھا۔ وہ رات سے اسی ایک جگہ بیٹھا تھا۔ جب اس نے پھولے والے کو گھر میں ہر اسماں حالت میں دردناکوں سے نکلنے کے لفظوں سے اچھے ایک صفحے کا سیاہ ورق لیے آتے دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جس کے آدھے حصے میں خون آٹام سمرنی کی سیانی تھی۔ اور وہ پھر پھر کانپ رہا تھا۔

ہم نے تاریخ کی کتابیں جھاڑ کر پینک دس اور پچھے شائع کر لیے تھے۔ حادثے کی نوعیت کچھ بھی تھی لیکن

اخباروں کا کاروبار پتل نکلا تھا۔ سائیکلوں کے ہینڈل پر بیٹھنے والی کی تعداد میں اسے لکھے ورق سبز چھوڑنا ہوتے ہر اسماں آواز میں نکالتے ہاگز ایک جوم ان کے گروپ ہوتا۔ سائیکل پر لکھے سب اخبار بک جاتے۔ پھر کوئی اور سائیکل سوار کوئی اور ورق۔ سکول سے ان کی جیبیں بوجھل ہو جاتی تھیں۔ سوت کا کاروبار ہی چیز نہیں۔

ریڈیو پاکستان صرف سرس فشر کرنے والی ایک مشین تھا۔ اس نے معمول کی نشریات دے دیں نہ کوئی ٹیوٹر بریک کی۔ نہایت اطمینان سے پیشگی طرح ترتیب یافتہ آواز میں ایک لائن کی فشر نشر کر کے وہ شہر کی بقیہ خبریں اس اشہاک سے سنانے میں مگن ہو گیا جیسے رہنماؤں کی پھانسی اور منڈیوں کے بھانڈوں میں زیادہ فرق نہ ہو۔ جس پر چند لفظوں اور سات لمحوں سے زیادہ وقت صرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کمرشل سروں کے زمانے میں ریڈیو کی لہروں کا ایک ایک لمحہ قابل فروخت ہے۔ کس کا کتنا سول لگتا ہے۔ کون جانے؟

وہ آٹھ گھنٹیں غزل ہیں آپ کی اور ہونٹ ہیں گلاب۔  
ریڈیو پر ملنے غزلوں کا نشریہ جاری رہا۔

ٹیوٹر کا شہر جب تک خبریں پڑھتا رہا۔ اس کی آواز ہوا رہی۔ نہ لڑکھا جٹ نہ اشتعال نہ کسی قسم کی بے بسی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو آواز کی اس معمولی لغزش سے ملازمت سے ہاتھ دھوئے دیکھا تھا۔ بہت دن نہیں گزرے جب اس کی ساتھی بڑا دکھڑے ہو رہے اپنے پروگرام کا آغاز کر کے خوشگوار لہجے میں کہتی۔

”آج جن جن کی سالگرہ ہے ان کو سالگرہ مبارک۔“  
دیکھو جوری کی طرح جب اس نے نہیں رہا ہوا فقرو بے سوچے سمجھے اسی چمکتی آواز میں دہرایا تو پروگرام کے اختتام پر لات مار کر نکال دی گئی۔

اب اخبار کے دفتروں پر آتے پڑے تھے۔ دفتر کی پیشانی پر آویزاں اخباروں کے بورڈ کوڑے کے ڈھیر میں پتھر تک پڑے۔ مخالف اس سے کسی بے خبر حالت میں آئی رہے تھے۔ صحافت کی اب مزید ضرورت نہیں رہی تھی۔ ریڈیو ٹی وی کے کمرے کے دروازوں پر رکھوں سے لگی۔ ہم بلیٹ تبدیل ہو چکی تھی۔ صرف ایک نھوت بھری دھنکار ہی ہوئی نظر میں سب دانشور مصلحون ٹھہراتے گئے۔ ہر نامور کلام ہوا۔ لی دی کوڑیوں سے اٹھا کر یہاں تک لاتے والے بیگ لٹ تھے۔ (اور ہلکے کوڑھے سے نکال کر کھڑا کرنے والا غلوں تختہ دار پر لٹ گیا تھا) ان کی جگہ ان ہی راہ داروں میں ان کمروں میں ان میزوں کے پیچھے راتوں رات بھرتی کیے چور دروازوں سے آئے لوگ سر اٹھا کر حکمرانی کرتے تھے۔ ہمارے ہاں چور بھی نہیں شہر آتا۔ وہ اٹھا کر بڑی ڈھٹائی سے اپنی قابلیت کی ڈھینگیں مارتا ہے۔ سر جھپاتا پچر آتا ہے تو وہ جس پر ظلم ہوا تھا۔

جھانکی لے ہر سائیکل والے سے ہر شہید خرید اٹھا۔ شاید افواہ ہو۔ غلط خبر چھپ گئی ہو۔ دشمن نے اثرانی ہو۔

نواز صاحب جو ہینڈل اٹھائے آتے ہیں شاید ان میں تردید ہو۔  
اس ایک رات بھی وہ جہاں بھر کے ریڈیو کھنگالنا پھرا تھا۔ شاید پاکستان نہ ٹوٹا ہو۔ شاید ہم نے ہتھیار نہ پھینکے ہوں۔ تو مگر کوئی ایسی اہم چیز نہیں۔ جس کے اندر بیٹھے حکمرانوں کو ڈراتے ہوں۔ کوئی تردید نہیں آئی۔ خبر غلط چھپ بھی نہیں سکتی تھی۔ اخباروں کی ایک ایک لائن سنسکر کی جا رہی تھی۔ وہ اخبارات جو پسند نہیں تھے۔ ہند کر کے قصہ ہی حکم کر دیا تھا۔ کچھ اخبارات اپنی سوت مر گئے۔ کتنے لوگ بے روزگار ہو گئے۔ کتنے کا نقصان ہوا۔ نہ کہیں وادریں تھیں نہ کوئی شنوائی، مصلحت کو ش برنس میں کاروبار چکا تے مصافحت کی جگہ لینے آگئے تھے۔ کوئی ایک لفظ بھی غیر محتاط اور آسانی لکھنے کا مطلب تھا کل سے یہ اخبار بھی نہیں چھپے گا۔ کوڑے لگیں گے اور قیدی بدست نہ مخلوق وہ اتنے اسحق نہیں تھے کہ حق بات کہہ کر اپنی دوکان بڑھا لیتے۔



چاہر سلطان کون تھا۔ کلمہ حق کس کو لہا کرنا تھا۔ ستر جن جہاد کہاں گیا۔ کبھی ملی فرصت تو دیکھا جائے گا۔  
 کتنی مرتبہ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کو لگا۔ اس کے پاؤں اس کا وزن نہیں اٹھا سکتے۔ آسمان کے  
 کیے پور پر "یا پاک تو" کو کبھی کوئل ہفتا پر چھانے جا رہا تھا۔ کو توڑنے میں ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ رات بیا سے  
 اونٹ کی طرح سروں پانی پی کر کے جب اس نے گھڑی میں وقت دیکھا اور آتش پر اتفاقاً اس کی نگاہ ٹھہری تو وہ جیسے  
 اس وقت سے اس لمحہ موجود تک کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کا میںوں کا اضطراب ختم ہو گیا تھا۔ بار بار جیکبہ بدل  
 کر وہ تھک کر شہل ہو چکا تھا۔ ایک طلسمی چھوٹک سے پھر کاہو کر وہ وہیں گر گیا تھا۔ انسانی کا خوف صرف اس کے  
 ہونے تک ہی رہتا ہے۔ پھر وہ ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے بیٹھے بڑے نایاب کی تو قلی ٹوپی ڈھلک کر آنکھوں پر آگئی  
 تھی۔  
 وہ جب بھی غصے میں جھلاتے ان کی ٹوپی نیچے کو ڈھلک جاتی اور عالم طیش وہ ٹوپی کو حرکت دے بغیر غصے سے  
 بڑھواتے رہتے۔

"ہم نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔" 47ء کے بعد جب اپنے بھائی کی تلاش میں علی کو جوں میں بھٹکتے  
 پھرے اور نامہ کو لے کر انہوں نے خود کو اس گھر کے لیے وقف کر دیا تھا اور ہر صبر کے لیے اپنے بقیہ ہم عمروں  
 کی طرح بس یہی ایک فقرہ ہرجملے کا توڑ تھا۔ بار بار حکومتیں ایک دوسرے کو گرائیں۔ ایوب خان آیا اور گیا۔  
 یحییٰ خان نے پاکستان کے ساتھ ایک بھیا تک مذاق کیا۔ مارشل لا، در مارشل لا، ہر حکومت کی تبدیلی پر بھناتے  
 ہونے اور ہرے اور پھر بھرتے اب تو ایک مدت سے وہ فوج کا شکار اپنے مزہ ہاتھ کو دوسرے کو لانا ہاتھ سے پیدا کر اس  
 میں زندگی کی روش پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ بیٹھے بیٹھے اعلان کرتے تھے۔ "پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔"  
 یہ جملہ ہماری میراث ہے۔ جنہوں نے علی الاعلان آخری لکھوں تک پاکستان کی مخالفت کی وہ بھی دھڑلے سے  
 اپنے جیسے پیسوں سے شروع کرتے تھے۔ انہیں ڈیپچر تک آگ اور خونیں نرس ڈوب کر لیا تھا۔  
 آج بھی دو سال پہلے جب ان پر قلعہ کا حملہ ہوا اور وہ اپنی ہوسوں پر بوجھ ہوئے تو سنی بیابانی ناکہ بیگم ان کو اپنے گھر  
 لے آئی تھیں وہ ایسی ہی تھیں بس۔

وہ سب سے زیادہ ناکہ بیگم پر ہی غم آتے تھے شوہر کی مسلسل بے روزگاری کے زمانے میں وہ ایک شوٹن سینٹر  
 چلا رہی تھیں۔ تو عین اس وقت جب وہ بچوں کی اسکول کی کلیں میں گھری بے طرح مصروف ہوتیں۔ تو گھیاں  
 ناکہ کو تنگ کرنے لگیں۔ یا اچانک ان کو یاد آجا تاکہ وہ صبح سے بھوکے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ناشتے میں پراٹھا بھی  
 آدھا چھوڑ دیا تھا کیونکہ ناکہ بیگم کی نااہلی سے وہ سخت بنا تھا اور ان کے دانشوں سے چایا نہیں گیا تھا۔ ایک جتنے والا  
 ہے اور سو بیگم بچوں کا باڈا اور سچائے بیٹھی ہیں۔  
 لیکن ناکہ بیگم کے چہرے کا اطمینان قابل رشک ہوتا۔ وہ ایک لفظ کے بغیر ان کی طرف دیکھتیں۔ وہ جانتی  
 تھیں۔ واقعات انسان کو بخ بنا دیتے ہیں اور ان جیسے بے شمار بے روزگار کیسے لوگوں کے چہرے ویسے بھی  
 ٹھنڈے رہتے تھے۔  
 ناکہ نے خبر سنی لیکن چپ سا دھلی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا جملہ اپنے مخصوص لفظوں سے شروع ہونے سے  
 رو گیا تھا۔



جب ان کا وہ منزل مکان جلا۔ وہ مکان سے بہت دور نکل آئے تھے۔ جان بچا کر نکلے انہوں نے پلٹ کر ایک

# پیارے آئیور بلیک نو مارکس کریم

بانگ برکل، ہیمپلر اور ڈیٹیکل کو بھی صاف کر کے  
 آپ کی گتھی بیک کی جاتی ہے۔ آمیزان یوسٹان اور نئے بیانات سن  
 کر بڑا ہے۔ جلد کی گتھی کو انہیں ان دونوں "Pigments" کی  
 مقدار کو ہٹا ہے۔ اگر بیانات کی مقدار جلد میں باصطافے تو جلد پر  
 ایک رنگ، چھوڑنے اور تک کالا ہو جاتا ہے۔ پارلے نو مارکس کریم  
 تھا نتیجہ لہذا انہوں نے اس کے لئے ہیں۔ جو بیانات کی  
 مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔ نتیجہ ایک رنگ، ہیمپلر، ڈیٹیکل اور نئے  
 ہے آپ کو ایک گراہ جاتا ہے۔ اس کے آپ لاتی ہے۔ نئے گتھی سن

یہ سامانہ نیکو کی اجازت کے لئے لکھا گیا ہے۔

fair clear skin

KHYBER CHEMICAL COMPANY  
 382, GPO Lahore Pakistan  
 www.parlayspk.com

ANTI-MARKS CREAM  
 NO MARKS  
 Parley



پاکستان کی سب سے زیادہ  
 اور رنگت نکالے  
 بیانات کو دور کرے



دوسری طرف ایک اور گروہ ہے۔ جو اس کی طرح کھلے دروازوں کے ٹھکانے سے بے نیاز۔ اپنی غوغائیوں میں مگن۔

یہ وہی بھائی ہے جہاں بھائیوں تک احتیاجاً ہر روز ایک شخص خود کو آگ لگا کر مار ڈالتا تھا۔ خود کو بیاہری آگ میں نہ جھونک سکے۔ وہ اپنے اندر کی آگ میں جلتے رہے۔ چتا نہیں ان کا یہ احتجاج کس کے سامنے فرما دیتا۔ حکمرانوں کے لیے تو آب زندہ ہوا مزہ دونوں حالت میں تاکارہ مخلوق تھے۔ پھر یوم السبت آیا اور انسانوں کی ہلی بند ہوئی۔ عجیب موسم تھا۔ غم کی اس جس زندہ تھا میں ایک طبقہ جشن منانا ہوا تھا۔ انہیں خوشی کس بات کی ہے؟ کلیاں ہوں سوئیاں؟

لوگ ایک دوسرے سے نظریں چراتے تھے کہ حالات سے۔ ان کے لب مقفل اور چہرے کسی بھی تاثر سے عاری تھے۔ سیاسی سرگرمیوں پر عرصہ دراز سے بندش تھی۔ ایک مختصر عرصے میں جو نئی سرگرمیوں پر نکل آیا تھا خلون پائٹے والوں کو برداشت نہیں کیا۔ وہ ان کی دیکھ بھال لے کر لے گئے۔ شاید ایک آئینہ دیکھا انہوں نے انہی میں۔ پھر پولیس ڈنڈے پر ساتی ان پر ٹوٹ پڑی۔ کچھ نے گولیاں کھائیں۔ کچھ نے کوڑے پائی خیر مجھے بدت کے لیے سلاخوں کے پیچھے بند ہو گئے۔ ایک دفعہ ان لوہے کی جالیوں کے پیچھے بند ہو جانے والوں کو حکمران اکثر اہر نکالنا بھی بھول جاتے تھے۔ قیدی اتنے تھے کہ جیلیں تنگ پڑنے لگیں۔ عورتیں قید ہوئیں۔ حتیٰ کہ محذور بچے جیلیں میں بھولے گئے۔ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنے والے مصلکوں سے اٹھا کر جیلیں میں بھولے گئے۔

سرکاری اخباروں اور نشریاتی اداروں نے انصاف کے ڈنگے بیٹے۔ اور اے بھائی۔ ”انصاف کی فتح“ فقہا پر ایک ہی طبقہ کی آواز عادی تھی۔ ایک برامرار سکوت کے ساتھ۔ اہل قلم جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انقلابی شاعروں کے لیے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی۔ اے لوگ بھی ملعون ٹھہرے جن کا سر سے سیاست سے لونی نکل رہی تھی۔ اپنا تنگ نئے نام سننے میں آتے گئے۔ دانشوروں اور بیرونی ممالکوں کو رخصت کر کے راتوں رات ان کی جگہ بھی مگر کر لی گئی۔ صحافیوں کی ایک نئی کھپ آگئی اور پلے ہو گیا کہ خلاء کسی کے جانے سے پیدا نہیں ہوتا۔

جو بچ رہے ان پر سکتے طاری تھا۔ وہ لوگ جو آزادی صحافت، انسانی حقوق اور اسلامی نظام کے لیے کھڑے ہوئے تھے ان کا نال ”مشن مکمل ہو گیا تھا کہ ٹھنڈے ہو کر بیٹھ رہے۔ ہمارے دلوں میں لوگوں کے لیے کسی سبب نفرت ہے۔ جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ ہم سے زندہ برداشت بھی نہیں ہوتے ہم اپنے لوگ مار دیتے ہیں اے جھٹل مار دیتے ہیں اور انتقام کی آگ ہے کہ کسی صورت ٹھنڈی نہیں پڑتی۔

”سارے جاڑے گزر جاتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی گزر جائے گا۔“ اس نے برہمرا کر خود کو بھڑکا تھا۔

”آج جن جن کو لگ رہا ہے وہ اس صدمے سے مر جائیں گے وہ بھی نہیں مر سکتے۔ تم تو اسی بات کا ہے کہ ہم مرتے نہیں۔ مرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ سب بھول جاتے ہیں۔ میں بھی بھول جاؤں گا۔“

اس نے ایک نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں اس نگاہ میں شکوہ تھا کہ شکر۔ بھول جانے سے پہلے وہ ایک دفعہ مکمل گروہ بنا چکا تھا۔

آخری نظر شعلوں میں بھڑکاتے آتے مکان برزائی۔ جلتی آگ میں گھس کر ملیاتی ان کا سامان اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو جس کے ہاتھ لگا اٹھا کر لے دوڑا جب دوسری منزل سے لکڑی کی بخاری بچے گری لڑاس کھلے تھے سے انہوں نے دیکھا اتنی ہی دیر میں ان کے گھر کی ہر چیز لونی بنا چکی تھی۔ اس اجڑے گھر پر آخری نظر بھی پھرواں دیکھنے کو کچھ بچا ہی نہیں سوا جلتے ہوئے بلے کے ڈھیر کے۔ وہ جلتے گئے اور جلتے جلتے اے ہی کی قافلے میں شامل ہوئے جو ان ہی کی طرح جلتے گھروں سے اپنی جان بچا کر نکل سکے تھے وہ جو ان کے کچھ نہیں ملتے تھے لیکن کاروان کی صورت میں ایک ہی جگہ سے نکلے اور ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں تھے وہ اپنے بچوں سمیت اور بیٹیوں کو ان المناک دنوں کی کافی بارہا سنا تے تھے۔ قافلہ جس کے ساتھ وہ گیارہ دن سپاں چلے اور جب ملتے ملتے ان کے پاؤں سوج گئے اور جو آس میں پھنس کر چلنے سے انکاری ہوا تو وہ جوتے پھینک کر نکلے پاؤں نکل آئے تھے۔ راستوں کے نوکیلے پتھر پیروں میں پڑے آبلوں کو پھوڑتے جن سے لیس وار موار اور کچھ لوزمین پر گرنے والی گھات لگائے بلوائیوں کے لیے قافلے کے راستے کا نشان متعین کرتا جاتا تھا۔ انہوں نے راستے میں لائیں دیکھیں۔ تھک کر بے دم ہو کر گئے مسافر دیکھے۔ پیاس سے جلتے نچے غمورقوں کے مزہ بے جان اور بے لباس جسم اور آسمان پر منڈلاتے گدھ۔ پھر پاکستان کی سرحد پر پہنچ کے سجدے میں گرتے خیف و زوار ہو جو دیکھے۔ پھر جب وہ جے میں نئی گھر کے کتے۔

”تم نے پاکستان اس لیے نہیں بنایا تھا۔“ تو ناکہ بیگم بڑی سہولت سے اس تخی کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔ اس پر بھول سنائے میں اس کے اندر ریت ناک آوازیں گونجتی تھیں۔ جیسے کوئی اندھے کوٹوں میں پتھر پھینکتے اور پلیٹ گرائی آوازوں کو رو کر تک منتارے۔ اے ان سناؤں سے خوف آنے لگا تھا۔ اے لگا کھڑکی سے بھاگتے آسمان کا رنگ بے پودہ سرخ ہے۔ بیل اور اونڈ کے زرخٹ سر جھانے 4 منہ کھڑے ہیں۔ تا موصوں ہی چلنے والی ہو اور۔ کرتی ہے۔

شہر کیوں سا میں سائیں کرتا ہے۔ اماں نے اس کو چاہی ویسے ایک لٹے کی طرح باہر نکلا دیکھا۔ ان کا رنگ فق ہو گیا۔

”عجیب آپ کو مت کرنا۔“ ان کی آواز لرزیدہ تھی۔ وہ دروازے میں ٹھہر گیا۔

”ارے کرنے کو وہ بھی گیا لیا ہے؟“ اٹا بے بس اس نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کی سائیکل کے تاراب جگمگاتے نہیں تھے۔ پیدل ہارتے گدی سے بھی جس جوں کی آوازیں آتی تھیں۔ اب اس کی بیٹھون کی کر بڑی بھی اس قدر سیدھی نہیں رہتی تھی۔ مدت سے کچھ بھی اچھا ہوا بند ہو گیا تھا۔ ماڈل ناؤن تو ویسے ہی خاموش ہوتی تھی۔ وہ ان قلموشیوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا۔ شہر سائیکل کی پلیٹ میں تھا۔ آٹو کاسر پھکائے اور اوڑھ آتے جاتے لوگوں کے سوا سڑکوں پر دور دور تک ویرانی تھی۔ لوگ شہر بھڑک کر کہاں نکل گئے آخری وہ کتے گھنٹوں سے سائیکل چلا رہا تھا اور کیوں چلا رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا۔ راستے نامانوس اور منر نہیں بے نشان۔ وہ پیسے کسی اجنبی شہر میں آبا تھا۔ وہ دوسروں سے کم اور خود سے زیادہ خفا تھا۔ وہ کسی واقف سے بھی ملنا نہیں چاہتا تھا۔ اندر اٹھتے اہل اور الاؤ اس کا تن من سگڑا ہے تھے۔

اور کسی نے خوشی کا اظہار کیا بھی تو وہ اس کا گلا دبا دے گا۔ یا کم از کم ایسی خواہش ضرور کرے گا۔ اجنبی چہرے اس لحاظ سے قابل برداشت تھے کہ اس کی طرف نہیں دیکھتے۔ اپنے آپ میں مگن اپنی دنیا گزارتے ہیں۔ ایک سناٹا ہے۔ لوگ سر جھکائے گزرتے ہیں۔ چپ چاپ۔ اس سناٹے کو کوئی توڑنا بھی نہیں۔ بے آواز آسویوں کی گونج اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح گونجتی ہے۔ جو روٹا نہیں وہ جس بھی نہیں سکتا۔



  
**Golden Pearl**<sup>®</sup>  
 COSMETICS



اس کے بچھے بند دروازے کے کواڑ کھلے۔ خاتون خانہ نے جھری سے جھانک کر کسی انجینی کو اپنی سڑھیوں پر بیٹھے چہنیں مار کر روتے دیکھا۔ لمبے بھر کو دروازہ کھلا رہا۔ اس کے بعد دروازہ ایک بے آواز صدا کے ساتھ اس پر بند ہو گیا۔



وہ جب گھر میں داخل ہوتا تب سے پہلے آبا کے کمرے میں جاتا تھا۔ لیکن وہ اپنے کمرے میں نہیں تھے وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھے۔ ڈرائنگ روم میں بھی نہیں ملے۔ ان کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ کہیں نہیں گئے تھے۔

پھر کچھ دن کے خلاف مرضی ہوا تھا شاید اور کچھ نہیں تو وہ مزاج شناس ضرور تھا۔ وہ جب اپنا احتساب چاہتے تو خود کو کمرے میں مقید کر لیتے اور ایک ایک گھر کے اپنے ان گناہوں کو شمار کرتے لگتے جو انہوں نے کبھی کیے ہی نہیں تھے گناہوں کی کتنی وہ اپنی پیدائش سے بھی قبل سے شہوں کرتے۔ جب مسلم لگ کے بجائے کانگریس کو مسلم ووٹ مل رہے تھے۔ جب علماء کا بیشتر گروپ قائد اعظم بڑھتے لگا رہا تھا۔ اور تب جب کے ہاتھ پیروں والے مسافر لیے گاڑیاں ریلوے اسٹیشن پر رکنا شروع ہوئیں تو وہ بھائی چارہ جو اس دن تھا کس کے گناہ کے حساب میں ختم ہوا۔

وہ اپنے باپ کے لیے ایک خالی کواں تھا۔ جس میں مندر سے گروہ ہریات گھر دیتے تھے ایک صدائے گمشدہ۔ وہ اپنی تاریخ کا کواہ اس کو کتنی سے بنائے ہوئے تھے شاید انہیں پھر کسی کندھے کی ضرورت ہو وہ ان کی تلاش سے باپس ہو کر اپنے کمرے کی طرف پلٹا۔ غیر ارادتی طور پر اس کا ہاتھ کھلی کے بلن کی طرف گیا۔ گئے بھر کے لیے وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا کیے اسی کی کرسی پر بیٹھے وہ جیسے خلاؤں میں نابود تھا۔ ایک دم سے اندھیرے سے تیز روشنی میں آنے پر ان کی آنکھیں چندھیا گئیں پھر ان کا زہر بکتر ٹوٹ رہا تھا وہ پھر تیز روشنیوں کی زد میں تھے اقرار میں نہیں۔

”پھر کچھ ہوا ہے؟“ وہ پریشانی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

سنائے جب سے وہ POW ہو کر واپس آئے تھے نابرا اس حالت میں آجاتے تھے ان کے دوست بتاتے تھے ابتدائی زمانے میں تو ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ اس وقت کون صحیح الدماغ تھا؟ ظالم نہ مظلوم۔

”ایہ؟“

اسے ایسا پڑا ترس آیا۔ ان کی آنکھوں میں سلاب امنڈنا تھا۔ لیکن بتا نہیں کیسا بند تھا کہ ٹوٹے میں نہیں آتا تھا۔ چونکہ مدت سے وہ دونوں ساتھ ساتھ تھے اس لیے اس نے اپنا آپ ان کے لیے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”بیٹا! یہ بزنس وال روٹی چلانے کے لیے ہے۔ لیکن اس میں آدمی ملک کے لیے کوئی بہتری نہیں کر سکتا۔ سوائے اس کے کہ وہ بھگ نہیں مانگ رہا۔ ملک پر بوجھ نہیں ہے اور اس کے طفیل چند گھروں میں چولہے جل رہے ہیں غم میرا کاروبار نہیں سنبھالو گے۔“ اس نے ان کے کاروبار سے ہاتھ اٹھایا۔



باقول تھے روہتے تھے بھگت کے نعرے لگاتے تھے کسی اور سمت نکل گئے تو اس کے سوالوں میں اضافہ ہو گیا پاکستان کیا ہے؟

اس کا بھین ناریلوں کے جھنڈ میں بچوں سے بنی تھوڑے بچوں کے درمیان چمکتے بالوں اور نمکین چہرہ بچوں کے ساتھ کھلتے گزرا تھا۔ اس کے بالوں اور چہرے کی رنگت ہاں موجود سب بچوں سے مختلف تھی۔ اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا ڈویسائل بھی ان سے جدا ہے۔ وہ کسی ہنرمیں بھی ان کی طرح کھلتا نہیں تھا۔ عمر بھر وہاں ہی رہنے کے باوجود الگ تھلک دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ساتھ کسی دوست ہم ریت میں باؤل دیا کرتے تھے۔ بھنگی ریت کی برجیاں خم ہینا بھیجتے ہوئے گولہ نما گتہ بند...

لیکن وہ سب بھی باقی باہر نکالتا۔ اقتضا کے باوجود اس کا گھر وندھاڑے جاتا۔ وہ روہتہ ہوتا جاتا۔ جب بار بار اس نے گھر بنا چاہا اور وہ بار بار گرا تو اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ جن کو پل جانے کا حکم ہاں پہلے ہی دے چکی تھی۔ وہ اتنا ناواک مزاج نہیں تھا۔ لیکن گھر کا کرنا اس سے کبھی برداشت نہیں ہوا تھا۔

اس کی اپنی زندگی بھی ریت کا گھر وندھاڑی۔ ایک دن بھی بار بار گری۔ ایک مرتبہ جب اس کے والدین ہجرت کر کے مشرقی ہاؤس میں رہنے کے لیے آئے تھے ان کے پاس پٹ بن کی سٹی تیار کرنے کا ایک چھوٹا سا کھانچا تھا اور وہ اپنے بانی سب ہم نشینوں کی طرح جھٹکے ٹھٹکے کرنے کے کاروبار میں بھی شریک تھے۔ ان کا کام چونکہ سامتھی پیمانے پر ہوتا تھا۔ اندرون پیک جھٹکے ایک پورٹ بھی کرتے تھے۔

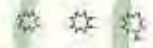
چارپائی کی سامتھی میں بروٹی بنانے والی سب سے اعلیٰ اور ان ان کے علاقے میں سٹی تھی۔ ہموار ملائم۔ ریم کے گھنے کی طرح تھی، ہوتی، جس سے تھیلیاں سب سے کم زخمی ہوتی تھیں۔ انہوں نے اپنا مختصر سا گھر آباد کر لیا تھا۔ مختصر تر کاروبار کے ساتھ۔ آبسراج الدولہ کی محبت میں بنگالہ چلے آئے تھے۔ جنگ پلاسی جنگ پلاسی کو زبانی یاد تھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ان کی محبت میں بنگالہ چلے آئے تھے۔ لیکن سراج الدولہ ان کی آنکھیں خم کر دیتا تھا۔ وہ اس کی محبت میں سب اس کی تاریخ شہادت بیان کرتے تو ہمارا حلام زمانہ سوؤں کا وہ شہر شائستگی نہ بھولتے جو اس مرد مجاہد کی شہادت پر انہوں نے لبی البید سے کہا تھا۔

نہ انہیں تو ہم قدم پر میر جعفر نے۔ حالانکہ میر جعفر صرف بنگال ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سری دفعہ اس کا گھر وندھا اگر اچھا سا بون 71 لیتے دسمبر تک اس نے اپنی میں خود کو تھما لیا۔ اب اس شخص گھڑی کے آنے سے پہلے دنیا کو چھوڑے جا چکے تھے۔ ماں کب گئی اس کے حافظے میں بھی موجود نہیں تھا۔ وہ ایسا خوش فہم تھا۔ (اب بعد ازاں اس کی بیوی نے جو اس کے لیے رائے قائم کی کہ وہ ایسا ازیت پسند تھا کہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے ہونا دیکھتا۔ پھر بھی فرار سے چھٹی ہاتا تھا۔ اس کی رنگت اور اس کا پس منظر سننے والے لوگ کب کے جا چکے تھے۔ ٹھہرے تھے تو وہ جوان جو وہ ہری موت مر رہے تھے یا وہ سرکاری ملازم جو مغربی پاکستان سے بھیجے گئے تھے۔

وہ ان کے درمیان کہیں تھا وہ نہیں جانتا۔ یہ اس کا وطن تھا۔ اور اگر وطن یک لخت وہ ہونے کا فیصلہ کر لے تو وہ اپنی وفاداریوں کو دو حصوں میں کیسے تقسیم کر سکتا تھا۔ ان آنکھوں نے بہت کچھ ہونے دیکھا۔ وہ خون بھی دیکھا جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کئی ماہی والے ہمارے تھے اور وہ بھی دیکھا جو اس بے خون کو مینے سے بچانے کے لیے بنا لیا گیا۔ پھر لوگ دیکھے۔ مسلسل گونجتے دکھائوں سے غارتوں کو طے کا ڈھیر تھے دکھا۔ دوست اور دشمن کے مرتبہ بدلتے دیکھے۔ گل کے دشمن چکری دوست ہوئے ساتھ ساتھ جیسے والے دوست دشمن کھائے۔ میر جعفر بھی ہم ہیں امین چند بھی...

ہم بھادو کوئی بنو گے۔ تم کوئی ایسا کام کرو گے جو ظالم کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تمہیں پتا ہے میں بہت بڑوں کوئی ہوں۔ انہوں نے میرے سامنے میرے بارے کی پشت بر کوڑے برسائے۔ ان کی ضمیرانی بندوبست پر تھی۔ میں ان کا ہاتھ نہیں پکڑے گا۔ خود وعدہ کرو کسی پر ظلم تمہیں ہونے دو گے؟

اس نے اندھا وعدہ کر لیا۔ حالانکہ گھوم پھر کر دیکھتا تو جہاں جہاں ظالم بلتے تھا۔ ہم سیدگی کے لیے اس کو مظلوم مہیا کر دیے گئے تھے۔ وہ وعدہ نبھانا نہیں سکتا جانتا ہے۔ لیکن کرو تو سکتا ہے۔ کون گتہ ہے رسم غلامی ختم ہو گئی توج بھی لوگ تو لوگوں کے آقا ہیں۔



جب پولیس کی وہن چمکنے والے اس کو واپس لے کر چلی تو اسے مسلمان نے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس سے بہت دور نہیں تھا۔ لیکن ایک کراس کی طرف نہ جاسکتا تھا کہ اس کی ٹانگوں سے جیسے جان سلب ہو گئی تھی۔ نہ اس کا سامنا کرنے کی اپنے اندر بہت پاتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اس کو اپنے سے آہستہ آہستہ دور ہونا مافصلوں سے دیکھتا رہا۔

ہم اگر صرف روتے رہیں گے اور کچھ کریں گے نہیں تو ظالم ہمارے آنسو پونچھنے نہیں آئے گا۔ کچھ کرو مسلمان! کچھ کرو اور نہ وہ تو کرنا چاہتا ہے کہ گزروے گا۔

جیل جانے سے پہلے اس نے آخری جملہ اس سے یہی کہا تھا جو اس کی ٹانگوں سے لپٹا آج تک اس کی بیڑیاں بنا ہوا تھا۔ جب اس کو سزا کی کھیل کے لیے جا لایا گیا تو میسوں پہلے کے اس دیے گئے حکم پر وہی لاچار سی طاری ہو گئی۔

وہی پاریں عباسی اس نے چاروں طرف سے کسی سے نہ دیکھا۔ سیاہیوں کی گاڑی تیز رفتار تھی اور وہ سب روہتہ میں داخل ہوئی اور ایک کھیل کی بے راہی کے ساتھ سفر خالی تھا۔

یہ جب چاب اپنی گاڑی میں آ بیٹھا اسٹیرنگ میٹ سے پار جیسے فضا میں وہندھی تھی۔ اسے لگا وہ گاڑی نہیں چلا سکتا۔ وندھا اسکرین جیسے پال میں جل تھل تھی۔ کہیں کوئی راست دکھائی نہیں دیتا تھا راست تھا بھی کہاں؟

ناچا تے بھی اس کی آنکھوں سے وہ قطرے چکے اور بے اثر ضائع ہو گئے۔ یہ ظالم کا راست نہیں رو سکتے چار سال کی عمر میں کھٹے پر لگی چوٹ اور اس سے زیادہ اس سے رستے خون کی دہشت سے وہ اول اول رویا تھا۔ اس کی ماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”مرد رویا نہیں کرتے۔ تم تو ہمارے مرد ہو۔“



# دُنیا کا بہترین لوٹھ پیسٹ انگلش

کیونکہ اس میں ہے لیکچوریٹو پیسٹ کے ساتھ ذہل فلورا پیڈر، تاکہ آپ کے دانتوں کو ملے  
**Maximum** Guaranteed Cavity Protection



وقت گزرنے کے بعد معلوم نہیں تاریخ نہیں یہ جی کرو اور ساتھ جلیں گے یا اپنا اپنا رول پھر بدل لیں گے۔ یہ تاریخ اہم بھی رہے گی یا کوئی نئی تاریخ لکھی جائے گی۔

آج سوڈنہ 16 دسمبر 1971ء کو پندرہ استان ان کا نجات دہندہ ہے۔ وہ ان کے حق کی جنگ لڑ رہا ہے۔ مشرق پاکستان کو آزادی دلانے کے لیے اپنے خون سے کھیل رہا ہے۔ سوال پھر اس کے گرو منڈلانے لگتے ہیں۔ وہ بنگالیوں کا خیر خواہ ہے تو پورا کا پورا بنگال کیوں آزاد نہیں کرتا۔ اپنی طرف کے بنگالیوں کو آزادی کی اس نعمت سے محروم رکھے ہوئے کیوں ہے؟ لیکن شکست خوردہ تو میں سوال نہیں کرتیں سر جھٹکایا کرتی ہیں۔

ریڈیو ڈھاکہ مدت سے بند پڑا ہے لیکن آگش وانی سے بانک شاہ کے بنگالیوں کے لیے لوگرم رکھنے کے پمفٹات نشر ہو رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے، آزادی کی اس جنگ میں اس کا نقصان ہی نقصان ہے۔ وہ بنگلہ دیش پر ایک دن بھی قبضہ نہیں رہیں گے۔ لیکن ان کا مفاد اس میں ہے بھلے سے ان کو کچھ نہ ملے لیکن پاکستان کا کچھ بھلے تو جو ظلم خود انہوں نے ڈھائے اس کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جب جرائم کی کتاب ترتیب دی گئی تو ساری کہانی فوج کے مظالم کے گرو گھومتی تھی۔ فوج جو مغربی پاکستان تھی اور جو مغربی پاکستان تھی۔ کچھ داستان ہے اور کہیں اس میں نسب داستان ہے۔

اس کا گھروندا پھر گرا۔ جب وہ ایک ٹرک میں سوار بے شمار اجنبی چروں کے ہمراہ کسی ایک کے دستخط کے بعد رہا تھی سے POW کہلایا۔ اب وہ اپنے لوگوں کی تلاش کے لیے کس کے ہاتھ دیکھے۔ ایک بڑے میدان میں بھیڑ بکریوں کی طرح گھومتے کر کے انہیں بانٹا جا رہا تھا۔ یوں دھڑکے میدان قیامت سے پہلے بھی رہا ہوتے ہیں۔ ایک ٹرک خیر ہے خوب قابو ہو رہا تھا۔ انڈین سپاہیوں کے حصار میں گھرے لوگوں پر ٹوٹ پڑنے کو بے تاب ان کو نوید دی جاتی ہے کہ کتنی باہنی والے ان کی تلم بولی گویں گے۔ اسے اس خوفناک کے لیے انہیں جبراً ساتھ فوج کا نمونہ ہونا چاہیے۔ اسٹیج پر راز روزان میں ایک عجیب سا گانا بجایا گیا۔

”مارو یا جائے یا پھوڑو یا جائے بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔“  
 انسان پر ایک وقت ایسا بھی کیا جبہ کوئی قابل ذکر مخلوق نہیں تھا۔  
 دو سال کے صبر آزما اور اذیتوں سے بھرپور طویل عرصے کے بعد جب اس نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو یقین سے سوچا۔  
 بس اب ختم ہوئی پادش سگ۔  
 ہر سنگی نشان زندہ تھی۔ نشانہ نہیں تھا مگر اس نے پلٹ کر دیکھا اور عذاب کا حصہ ہو گیا۔

ہم عجیب خوش قسم لوگ تھے۔ جب ہمیں انڈیا کے سب سے غلیظ ذروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر بھرا جانے لگا اور اس وقت تک بھرا جاتا رہا جب ہمارے پاس سانس لینے کی جگہ بھی نہیں بچی تو ہمیں کیا گمان ہوا کہ یہ ٹرک ہمیں سیدھا پاکستان لے جا کر اتاریں گے اور انہیں ہمارا کرنا بھی کیا تھا۔ لیکن جب ہم سب کو ذروں سے نکال کر کیمپوں میں بھروا گیا اور جب ہمارے کمروں پر POW کا ٹیکہ لگا تو ہمیں پتا چلا ہم قیدی بن چکے ہیں۔ مدت قید نامعلوم، جرم ہمزنا معلوم۔۔۔



ایک طرف آری گی جو بیچارہ میں بیوس ہمارے سر پر کھڑا کوئی شخص ہمیں غلیظ گالیوں سے نوازتا۔ جیت کے نشے سے سرشار اس کے سینے پر گنتوں کے نشان تھے جو شاید اس نے ہمیں شکست دے کر حاصل کیے تھے۔ ہم شکست خوردہ قوم تھے وہ ہم سے جو بھی سلوک کرتے کم تھا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پاکستان کو بھی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ قطعی غیر متوقع طور پر کیمپ سے ایک آواز بلند ہوئی۔

”ہاں پاکستان“ تھکے ہارے ہزیمت خوردہ اور باپوں حجاج میں ایک ایک ابھری۔

”زندہ باد“ چاروں اور سے اپنی طرف تھی ہوئی ہندوؤں کے لیے نیاز۔ پھر ایک مارشل لا سے دو سرے مارشل لا تک ایک وندہ وندہ بھی اس گون میں شامل ہو گئی۔ اتنے برسوں میں اس گون کی دھمک میرے کالوں کو لڑواتی ہے۔

اب مؤرخ اُمڈیا سے دوستی کا دم بھرتے ہیں پاکستان کا زندہ باد ہونا بھی اہم نہیں رہا۔ ایک وفد بھر ہم نے اپنے اپنے رول رول والے ہیں لیکن یہ دو آوازیں اس کا پچھیا کیں پھوڑتیں۔



وہ چپ چاپ ان کے قدموں میں بیٹھ رہا۔

”گیا خرچ ہے آیا“ جب سینہ بہت بو بھیل ہو جائے تو رو لیا کریں۔ رو تا کوئی بری بات تو میں میں بھی ایسے کرتا ہوں۔“

وہ دھیمے سے مسکرائے ”آج ان کا بیٹا ان کا باپ بن کر آیا تھا۔ اور وہ چھوٹے بھولے بچے کی طرح اس کے ہاتھ خوکے بس محسوس کر رہے تھے۔“

”تم نے گپ لگائے آیا تھا۔ تم کمرے میں نہیں تھے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرو کہ باپ پھر شاید یہ کیا وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔“

وہ ہنسنے لگا ”میں نے نہیں آئے تھے اور بچوں کی طرح ہمالے بنا رہے تھے۔“

وہ منظر رہا۔ وہ خود کھلیں گے۔ بہت دیر وہ اس سے اپنے راز رکھ چکی نہیں سکتے۔ وہ جانتا تھا وہ کسی تفتیش میں مبتلا ہوں گے تو اس ایک شخص کے حوالے سے۔ جس کو انہوں نے اپنے سامنے کوڑے کھاتے دیکھا اور کچھ نصیحتیں کر سکتے۔

”آج مجھے کسی نے بتایا ہے وہ ایک کتاب لکھ رہا ہے شاید وہ اس پر نڈاری کا مقدمہ بنا چاہتے ہیں۔“

”میں نے تو نہیں سنا۔“ وہ خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ”خدا آری کیسی؟“

”تمہیں پتا ہے کسی کو خدا آری کا فر قرار دینے کے لیے ہمیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کا زمانہ تو خیر کبھی کیا ہی نہیں ہے۔ تو یا اکل لا قانونیت ہے۔“

”اب جب وہ اسے گرفتار کرنے آئیں تو تم اسے پھینکا دینا ہے عہدے کا الٹا استعمال تو تم کر سکتے ہو نا؟“

مخبر سے اس بات کی مزا ہو گی۔ وہ خود کو گتے سے رہے اور عمر بھر اس سے نظریں نہیں ملا سکتے۔ طویل و عریض آسمان اس کے سر پر بنا ہوا تھا۔ جس میں سے سورج اور ستاروں سے روشنی چھن چھن کر ان کی چست پر آتی تھی۔ وہ اپنا تکیہ چھوڑ کر ان کے بازو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ کسی ہوئے یا لوں کی چارپائی جس کی پلنگی کی اور ان وہ ہر رات مومے سے پہلے خود کھما کرتے تھے۔ پھر یانوں کی چادر جو لٹری کی بیٹیوں میں کھینچی ہوئی تھی۔ ہاتھ کے وزن سے دبا کر دیتے اور جب تک مطلوبہ تناؤ حاصل نہ کر لیتے رسی کو کھینچتے جاتے۔ وہ آواز ان کی رسی پر یہ حاصل تقریر بھی کر سکتے تھے۔ اس کی ایک ایک ہنت اور گانچہ کے عیب گنوا سکتے تھے۔ وہ جب اس رسی کو بائیںوں میں لے کر کھینچتے تو اسے لگتا ہے سن کے اس کو طویل دینے کے لیے وہ رسی کھینچتے جاتے ہیں۔ ہر شام ہر سانی سے اٹھا کر وہ چارپائی چھت پر رکھی جاتی۔ سفید میز پوٹیشن پیس میز پر کلا پنکھا ایک نادر کے ذریعے سہانے تک آتا تھا۔ وہ جب سے لڑائی کی قید سے واپس لوٹے تھے۔ بند کمروں میں ان کا دم گھٹتا تھا۔ وہ ہر ممکن کوشش کر کے کھلے آسمان کے نیچے سوتے تھے۔ رات میں کسی وقت بارش برسی تو اسے کلدھے سے لگا کر چارپائی کھینچتے بارگاہوں میں آجاتے۔

وہ چپ چاپ ان کو کام کرنا دیکھتا تھا اور منتظر رہتا جب تک وہ لیٹ کر اپنا پاؤں کھینچنے کی جگہ پھیلا کر اس کو ”ہو“ بنا کر نہ کہہ دیتے۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہوتی تھیں۔ ”آپا کمانی“ یہ اس کا روز مرہ تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا اپا کی کمانی میں کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ تر وہ کاروان کی طرح متحرک تھیں۔ نہ فلمی گانوں کی طرح بلند۔

”ایک بار شاہ جہاں نے اپنی رہا لیا۔ برا ظلم بھاتا تھا ایک نہیں تھا ایک۔“ وہ منتظر سا قدرے کر سکتے۔ ”گنہگار تھا اور وہ سب گنہگار تھے۔ وعدہ کروا کر تمہارا شاہ بن گئے تو کبھی ظلم نہیں کرو سکتے۔“ کمانی کے درمیان ہندو بیوان بھی آتے۔ موز کوڑ بھی آتے۔ خود اصلاحی بھی آتی۔ لیکن وہ اس خشک اور غیر کمانی کا اس قدر مادی ہو گیا تھا کہ اس کے بغیر سو نہیں سکتا تھا۔

وہ ذرا بڑا ہوا اور ان کی چارپائی سے اتر کر اپنی چارپائی پر گیا اور وہاں سے اپنے اگ کمرے میں تو اس پر بڑا خوشگوار دکھشاف ہوا کہ اس کے آبا پرے مزے کی چیز تھے۔ کبھی ہشتے کھینچتے۔ کبھی پھیرا ایک دم وہ اپنا خول اپنے اوپر فٹ کر کے سب کی نظروں سے چھپ کر محفوظ ہو جاتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی غلیظاں انگلیوں پر کھینچتے پھر اس ریاضت سے باہر نکلتے آتے اور اس کے ساتھ آنکھ پھولی کھینچنے سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔



اس کے ماں باپ میں جھگڑا کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اختلافات کی بھرمار تھی۔ ماں کے خیال میں باپ وہی مریض تھا۔ وہ کسی ایک چیز پر اکت کر جاتا تو اس میں سے نکلیں نہیں سکتا تھا۔ وہ ان کی ضرورتیں پوری کرتے تھے لیکن محبت نہیں کرتے تھے۔ محبت انہیں کسی سے نہیں تھی۔ اس جذبے کے لیے ان کا دل باندھ تھا۔

ملا ایک پلو بیٹھے بیٹھے تھک جاتیں تو رخ بدل کر بے تاثر آوازیں دیتی جاتیں جیسے یہ ان کی زندگی کی کمانی نہیں۔ کسی ناول کا ایک باب ہے۔

”ہمت سے جنگی قیدی تو ہنی مریض بن گئے تھے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ نارمل ہونے کی طرف پلٹ آئے۔ انہوں نے واپسی کا شعرا نست اختیار نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں خود کو اذیت دینے میں مزہ آتا تھا۔“

یہ سچ ہے انہوں نے اپنے سوا کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی۔ لیکن وہ ایسے آپ کو بڑے اہتمام سے کچوکے





Bread is Life

Save the Earth. Reduce. Reuse. Recycle. Do not litter. Do not pollute. Do not waste. Do not harm. Do not abuse. Do not exploit. Do not oppress. Do not discriminate. Do not hate. Do not fear. Do not despair. Do not give up. Do not lose hope. Do not lose faith. Do not lose belief. Do not lose trust. Do not lose respect. Do not lose honor. Do not lose dignity. Do not lose pride. Do not lose self-respect. Do not lose self-worth. Do not lose self-esteem. Do not lose self-confidence. Do not lose self-belief. Do not lose self-love. Do not lose self-respect. Do not lose self-honor. Do not lose self-dignity. Do not lose self-pride. Do not lose self-worth. Do not lose self-esteem. Do not lose self-confidence. Do not lose self-belief. Do not lose self-love.

رنگتے تھے۔ کبھی کبھی وہ بے وجہ خوش ہو جاتے اور سارا دن کھٹکھٹا کر ہنستے۔ تحقیق پر معلوم ہو ماناں کے پتھر سے دوست کی کوئی ایسی خبر آئی ہے۔ وہ کوئی دوست تھا کبھی یا کوئی فرضی کر دار تھا نہیں جانتی میں نے اس کو کبھی نہیں دیکھا نہ وہ اس کو کبھی اپنے گھر لائے نہ ہمیں ان کے گھر لے کے گئے۔

طلقات ان دنوں کوئی بہت اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی اور عمر بھر کی چیخ بک بک اور زمانے بھر کی الزام تراشیوں کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ لیکن ہم دونوں ایک دوسرے پر کوئی الزام لگائے بغیر پڑھے لکھے لوگوں کی طرح علیحدہ ہو گئے۔ ہم نے تم پر بھی رستہ کشی نہیں کی۔ لیکن یہ شادی جو نکلے ایک طرفہ محبت تھی اس لیے ایک طرفہ طور پر ختم ہو گئی۔

تمہارے باپ نے تمہیں کشادہ دلی سے میرے حوالے کر کے بتایا تھا تمہارے بغیر اس کا جینا مشکل ہو جائے گا میں بھی تمہارے بغیر ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن تم اس کی وہ واحد محبت تھے جس کا اس نے اعتراف بھی کیا تھا۔ لہذا میں نے تم کو اس کے حوالے کر دیا۔ ہم دونوں نے ہمیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فیصلے غلط ہو جائیں تو ان پر ڈٹے رہنے کے بجائے اپنی غلطی مان لینی چاہیے۔

تمہاری تربیت تمہارے باپ نے بڑے شان دار طریقے سے کی ہے۔ اگر تم میں کوئی خامی رہ گئی ہے تو اس کی ذمہ داری میں ہوں۔ میں جس نسل کی پیداوار ہوں وہاں عورت کوئی اہم مخلوق نہیں تھی سوہ محض ظلم سنے کے لیے پیدا کی گئی تھی۔

میں میں بڑی خوش قسمت تھی مجھ میں نے محبت کی نوکھ سے بھانسنے کی نوبت نہیں آئی اور جب میں نے علیحدگی کا فیصلہ کیا تو میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں بنا۔  
”آپ کے زمانے میں سارا حق نہیں ہوا کرتی تھیں؟“  
”ایس ایہ کہاں کی اینٹ کہاں کا روڑہ جو اسے تم نے تم میں بھی اپنے باپ کی طرح کیزا کھلا دیا ہے۔“  
وہ زور سے ہنس پڑا۔

”حالانکہ ابھی آپ نے اعلان کیا تھا آپ نے شوہر پر کبھی الزام تراشی نہیں کی۔ پس والدہ کی لٹے یا یا کہ ہم میں سے کوئی نور جہاں وجہ انگیر نہیں۔ اور تمہوڑے بہت کھکے ہوئے تو ہم کبھی ہوتے ہیں۔ آپ ان سے خفا تو نہیں؟ یہ سچ ہے نا چاہتے بھی آپ کے ساتھ زیادتی ہوتی، لیکن جن حالات سے وہ نزرے ہیں کوئی بھی گزرتا ایسا ہی کرتا۔“  
”شاید کچھ زیادہ کرتا۔“  
”تم اپنے باپ کے بہت بڑے سپورٹر ہو فاروق؟“ وہ طویل وقفے کے لیے چپ ہو گئیں۔ ”مجھے اچھا لگا۔“



آیا کی محبت و غریب محبت اس کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی تھی۔ لیکن جب پڑیس سمجھ میں آنا بند ہو جائیں تو وہ ان سے الجھنے کے بجائے ان سے صلح کر لیتا تھا۔ کچھ تو ہو گا ایسا اس شخص میں جس کی خاطر وہ عمر بھرا اک آگ میں جلتے۔  
ایا کے ماضی میں سنانے کے لیے ایک موٹی سی کتاب جیسی تاریخ موجود ہے۔ عموماً لوگوں کے ساتھ کوئی ایک بڑا حادثہ پیش آتا ہے وہ اس کو جھیل جائے تو مجاہد، خوش اسلوبی سے گزر جائے تو شہید۔ لیکن ان کے پاس تو واقعات کی قطار تھی ایک ہجرت اور دوسری ہجرت۔





# لامہا لامہا زندگی

LAMHA LAMHA ZINDAGI

بدایات - شبہ شکیقت

فہکارہ - ہمایوں سعید، ہئاتیہ سعید، عائشہ رحمان، دانش تیمور، رشا شہابی، نائلہ جعفری، شہریار زیدی اور انیسہ شیخ

دیکھیے ہر جمعہ کی رات  
8:00 بجے

Keep Watching ARY Digital Network  
(log on to: www.arydigital.tv for further details)  
Send comments and suggestions at: feedback@arydigital.tv  
If you are not receiving ARY TV channels on your area  
please contact: ARY Distribution Department  
TEL: (021) 711-299-111 Email: dl.distribution@arydigital.tv



ایک اذیت اور اذیت۔ اور جب وہ کسی کو بتاتے ڈرا سے فخر سے بیان کرتا کہ اب اپنا مال اسباب بچا کر بھاگنے کے بجائے اپنے ساتھیوں کے ساتھ جینے مرنے پر آمادہ POW بن گئے تھے۔ تو اس کے کانچ کے زمانے کے ساتھی اگلے میں سونے کی زنجیریں دکانے کان میں ہالی پٹے ڈاک میں کی دوستوں پر تھر تھراتے ڈرا حیرت سے میوڈک کا ویو کم کر کے پوچھتے تھے "POW کیا ہے؟"

"نہو۔" وہ جوانی وضاحت پر تاسف سے کہتے۔ "لیکن یہ تو حماقت ہے اس کا فائدہ؟"

واقعی ہے تو حماقت اسے وضاحت دینے پر افسوس لاحق ہو جاتا۔ وہ ابائی ڈاکسٹری ان کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ جس میں فائدہ نقصان کے کچھ اور معنی درج ہیں۔ وہ ابائی ڈاکسٹری نہیں بدل سکتا تھا، لیکن اپنے دوست بدلنے سے بھی قاصر تھا۔ جیسے دوست وہ چھوڑ دیتا تھا، اگلے بھی اس کو ویسے ہی لیتے تھے۔ وہ اپنے وقت میں بھس کھانے پر تھے کی طرح محفوظ تھا لیکن دنیا بڑی برق رفتاری سے اڑان بھرنی آگے سے آگے نکلتی جا رہی تھی۔ اس کی ماں بچی معترض ہوئی۔ اس نے ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ رچے رچے خود کو بوڑھا کر لیا تھا۔ اس کی سوچ فرسودہ تھی۔ پرواز محمد اور خواہشات سفر اور سب سے پریشانی کی بات ہے کہ اسے خود پر کوئی مائل نہیں تھا۔

وہ باپ بیٹا ایک دوسرے کے لیے بہترین دوست تھے۔ کبھی کبھی انہیں شک ہو تا وہ باپ کے رنگ میں اس طرح رنگا گیا ہے کہ شاید محبت جیسا لانا ذوال جذبہ اسے بھی چھو کر نہیں گزرے گا اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوئی۔

دیکھ کر کچھ تو تھا کچھ تو ہو گا، اس کی سولی وہیں اٹکی رہتی۔ دنیا بھر کے اپنے سے متعلق انگریزوں سے بالاتر۔ لمانے اس کو کاروبار سے کھلا۔ "بے دخل کر دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کیوں اس کو ان کا حکم سنانے پر بھی کوئی مائل نہیں تھا۔ لیکن وہ جب لاہور آتا تو اتنے جاتے ان کے دفتر چکر ضرور لگاتا۔ کبھی صرف کافی پی کر چلا آتا۔ کبھی ان کو ساتھ لے کر کہیں کھانے کے لیے نکل جاتا۔ لیکن اس آتے جاتے جھانکنے میں وہ ان کی ذہنی سخت سے باخبر رہتا۔ وہ جب اپنے خول میں بند ہونے کی خواہش کرتے تو وہ چھٹی لے کر آتا۔ خواہ ساری چھٹی اسے اکیلے اپنے کمرے میں لپیٹی دیکھتے گزارنی پڑے۔

"تو ایک اجازت درکار تھی آپ سے؟" ان کی شکیقت میں کتنی دیر کتاہوں سے کھلیے۔ انظفوں کی خوب صورت ترتیب دیتے بیٹھے اپنے ارادے ترک کر کے اس نے آیت سیدھا سوال کر ڈالا تھا۔

"میں سر عباس و شید سے ملنا چاہتا ہوں توپ معترض نہ ہوں تو۔" کہتے دن بعد وہ آیا تھا اور اس کی آمد سے وہ کیسی عجیب مغرورانہ سی خوشی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا پاپ کش لیے بغیر واپس میز پر چپ چاپ چھوڑ دیا۔ ان کے چہرے پر کبھی سی تکلیف کا سایہ ان کے چہرے کو چھوٹا کر گیا۔

"پتا نہیں فاروق! ایک طویل وقفے کے بعد انہوں نے تمہاری سی آواز میں کہا۔" میں اس سے کیوں بھاگتا پھر تباہوں نظر میں پچھتاہ نہیں چرتا، وہ اسی شہر میں رہتا ہے، وہ چاہتا ہے، اور میں جانتا ہوں اور وہ مجھ سے تاراف نہیں ہوگا، لیکن پھر بھی..."

اسی الجھنی سی کیفیت میں انہوں نے ڈوٹے پھر پاپ کا سارا لینا چاہا۔ وہ راکھ ہو گیا تھا۔ وہ تھجلا سے گئے۔ یہ کیسی آگ ہے جو کھوں میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

"آج نے ان کا کچھ نہیں رہا ابابا! ایک مدت بعد اس نے ان سے اشتہاف کیا تھا۔"





مَرَحَبَا جُوشَانْدَه

مَنْزِلَه، زَكَام اور فَاوِجِي چَهْطِي

مرحبا جوشاندہ اب سیرپ میں بھی دستیاب ہے۔



”لیکن ان سے نظریں ہٹا کر آپ اپنا نقصان ضرور کر رہے ہیں۔ کیا وہ اپنی Suffering کے لیے آپ کو تصور دے رہا ہے؟ کیا آپ کو لگتا ہے ان کو نہیں لگتا ہو گا۔ یا کم از کم مجھے دیکھ ہی لینے دیجئے۔ ان کو ایسا لگتا ہے؟“

وہ برا ہو گیا تھا۔ ان سے اختلاف کر رہا تھا۔ اپنے فضلے کر رہا تھا۔ عجیب سی خوشی ان کی روح کو سرشار کر گئی۔ جب جب وہ برا لگتا ان کے اندر پچھنے کی خواہش جاتے لگتی۔

”ہیڈلٹ ایڈیٹر میں عجیب میں اٹھانا پڑی۔ اسے بھوانا آسان نہیں تھا۔ کس سہولت سے اس نے کہا، بھولو مت ایسی باتیں تو مجھی نہیں بھوننی چاہیں ہاں اس میں سے نکل آتا چاہیے۔“

اس نے مجھے بار بار منع کیا۔ لیکن جب میں نے اسے کوڑے لھاتے دیکھا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں اس کے منع کرنے پر تاریخ کو معاف کیے کروں۔ پولیس وین اس کو لے کر علی اور میں دینی نکل گیا۔ ایک ہجرت اور سہی ایک ن۔ جب تک ہستی لال کمال کا عاشرہ نہیں رہا میں نے پلٹ کر وہاں آنے کا سوچا بھی نہیں۔

”کیا تم نے کبھی اس کو دیکھا بھی نہیں۔“

”نہیں ایسا لیکن میں ان کو اس طرح نہیں دیکھتا چاہتا کہ ان سے کسی دانش گاہ میں علمی و سائنسی حقائق پر لیکچر سنوں یا کسی تعلیمی کانفرنس میں سوٹ پسنے عالی رنگے یا ٹیک یا بیٹی میڈیا پر معلومات بکھیرتے دیکھوں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ایسے جیسے آپ کو دیکھتا ہوں یا جیسے آپ انہیں دیکھتے ہیں۔“

آپ جانتے ہیں بابا! بیرو کو ہمیشہ بغیر میک آپ دیکھنا چاہیے۔ وہ کیسے رہتا ہے، کیسے باتیں کرتا ہے، کیا کھاتا ہے، بہت قریب سے، لیکن یا نکل لے قریبی میں۔“

”وہ نہیں فوراً پہچان لے گا۔ تمہاری شکل جی ان کن حد تک مجھ سے مشابہ ہے۔“

”اس کا مطلب میں نہایت پندرہ سم آتی ہوں۔ میں پہچان سکیں گے میں نہیں ہوتا ہوں، مجھے اپنے پروفیشن سے یہ ہی فائدہ اٹھانے میں کم از کم۔“

”صوبہ کو وہ برا قاتل آئی ہے۔ ان کے لیے میں اپنے دوست کے لیے ناقابل بیان سا سفر تھا۔“

”کھلا کرو گے؟ ہروپے کی طرح لٹلی داڑھی موچھ لگا کر نہ چلے جانا۔ احمق نہیں ہے وہ۔ ویسے بھی یہ زندگی ہے، کوئی اسٹیج نہیں۔“

”اور آپ نے کیسے توقع کرنی کہ میں ایسا احمق ہوں کہ یہ کریں گا؟“

”پھر بے سے لگتا ہے ایسا ہی کرو گے۔“

”دچلیں ایسا کیا بھی تو گلی شرط مجھ وہاں کوئی نہیں پہچان سکے گا۔“

”تم میرے دوست اور اس کے خاندان کو انڈر اسٹیٹ کر رہے ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی ہارے۔“



# کنجی حاصل آرزو کا

کھٹاک کی آواز سے دروازہ بند ہوا تو وہ جسے کسی بھی تاک خواب سے جاگی تھی۔ فرش پر بکھری تھی بڑے اور کٹھنوں پر ایک نظر ڈالی پھر کھٹوں کے بل بیٹھ کر ایک ایک کانٹہ سمیٹنے لگی۔ مگر منتشر ذہن اور مفلوج وجود نے ساتھ نہ دیا تو وہیں بیٹھ کر اپنے لگی تھی۔ جیسے کئی کھٹوں تک بھانگے کے بعد کوئی بے دم ہو کر زمین پر گرے۔ صرف آدھے گھنٹے میں اس کے اس ویل فرزندہ کمرے میں گیا تعفن سا پھیل گیا تھا۔

وہ یقین نہیں آتا کہ جسے یہ تم نے لکھا ہے سیرت فاطمہ پر تمہارے قلم سے نکلے الفاظ ہیں، کبھی غور کیا ہے کہ تم کبھی نامیائے بائیں اور دائیں لاکر لکھتے ہی ہو۔ تمہارے ہر لفظ میں زندگی سانس لیتی تھی۔ تمہاری تحریر میں ایمان اور محبت کے قصبے تھے۔ تم اپنے لیے لکھتی تھیں سیرت اور تمہارا ذات حسن تھا تمہاری سوچ کبھی کبھی اور پختگی تھی جو تمہاری تحریر سے جھانکتی تھی اور اپنا آپ متوا لیتی تھی۔ تم نے اپنی ذات کے ظاہر کوئی نہیں بیان کیا جو بھی اس چکا چوند دنیا کے ہاتھوں گروی رکھ دیا۔ سیرت! میں نے تم پر اعتبار کیا، تاکہ تمہاری ذات کے رنگ ماند نہ پڑیں اور تم نے خود ہی وہ سارے رنگ جھنڈا دیے۔

وہ خضر کے لیے ہے ہی نہیں اس کے چہرے سے بھی ظاہر تھا۔

”یہ سب میڈیا کی ڈیمانڈ تھا، اس لیے۔“ سیرت نے ہلکا کر وضاحت کرنا چاہی۔

”ڈیمانڈ؟“ خضر سستہ آہیہ نہا۔ ”تم کب ڈیمانڈ کے تحت لکھتے لگیں سیرت! تمہاری تحریر تمہاری ذات کا

عکس تھی تمہاری سوچ کی آئینہ دار تمہارے جذبات کا اظہار پھر تم کب سے اپنی سوچ اور جذبات کا اظہار دوسروں کی ڈیمانڈ کے مطابق کرنے لگیں۔“

خضر اسے آہٹ کھا کر کب کا کمرے سے خارج ہوا تھا اور اب وہ نشا کمرے میں بیٹھی اس کی آواز کی بازگشت سے لڑ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے سر پر ڈالی۔ جینز پر واٹش کرتا ہے، شہزادہ تو تک آتے بال بچہ میں وہ نازک سے برہنہ ہے، ہلکی پختگی چولہی۔

وہ کھل ایک دن اور رنگ و موٹن کے طے میں آئی اور یہ حلیہ تو اسے اس شو بڑی چکا چوند نے عطا کیا تھا۔ وہ سادہ سی الپہ اور گھریلو سی سیرت فاطمہ تو کبھی کبھی تھی۔

اسے لکھنے کا جنون تو نہیں تھا، مگر اسے لکھنے سے عشق تھا۔ وہ لکھتی تب تھی جب کوئی چیز شدت سے محسوس کرتی اور لفظ خود بخود اس کے اندر سر اٹھانے لگتے لکھنے کے لیے اسے کبھی کسی مخصوص ماحول کی ضرورت نہ پڑتی تھی، لکھیں بیٹھے بیٹھے کام کرتے ہوئے ذہن بس خود بخود ہی کسی منظر میں پہنچ جاتا، پھر کردار چلنے پھرنے لگتے، لفظ بولنے لگتے اور یوں تحریر مکمل ہو جاتی اور اگر کبھی کوئی منظر سخیہ قریح اس پر نہ بکھرا ہوا تو جیسی کنگھی بار کے ذہن کے کسی کونے میں بڑا رہتا۔ تو قییکہ وہ قلم بند نہ ہو جاتا۔ وہ لکھتی تھی، مگر صرف اپنی ذات کے لیے، مگر پھر کب تک ایسے اور کس کس کے اصرار پر وہ اپنی تحریر کو منظر عام پر لانا شروع ہوتی اسے چاہی نہ چلا۔

پھر نہیں ہوا کہ وہ تحریریں جو اس کی ذات کا عکس تھیں وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کر کے لگیں۔ کچھ وقت گزرا تو احساس ہوا کہ جس ذات اور سوچ کو کبھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ وہ کتنی دلوں کی دھڑکن ہے۔ اس کے الفاظ دلوں میں محبت کی حرارت چگاتے تھے۔ وہ محبت جو دل کے احساس سے بڑی ہے۔ وہ محبت جو رشتے کے ریشم سے بندھی ہوئی ہے۔

نشدت کو فنا کر دیتا ہے اور سوچ کو مفلوج سیرت فاطمہ کو بھی شہرت کا نشہ چڑھنے لگا تھا۔ وہ عشق جو اسے تحریر سے تھا۔ وہ اپنی ذات کے عشق میں بدلنے لگا تھا۔ ان ہی دنوں اس کی زندگی میں خضر حیات کے نام کی دستک ہوئی اور یہ پہلی دستک ہی جیسے آخری تھی۔ پھر کوئی اجنبی شہر ذات کے دروازے پر آیا۔ نہ کسی کے لیے بل کا دروازہ کھلا اور جن دنوں وہ خضر حیات کے ساتھ شادی کے خوب صورت بند میں تھی، بندھی تھی، اڑی اڑی پھر رہی تھی، ان ہی دنوں اسے ایک بہت نامی گرامی ڈراما ڈائریکٹر کاٹھن آیا۔ وہ اس کی تحریر پر ڈراما بنا چاہ رہے تھے اور یہ خواب اس کے لیے کتنے راستہ دکھائے۔

شہرت کا نشہ ایک بار پھر سے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ مختلف چینلوں پر چلنے والے ڈرامے شو بڑی چکا چوند روختیاں تقاریر اور اور ڈرامے ایک نیا ہی جہان تھا جو اس کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ اور پھر اس جہان میں سیرت فاطمہ کی ذات کو کوئی اسے برابری نہ چلا، اس کے تو بس خواب تھے اور وہ تھی کی طرح ان خوابوں کے تعاقب میں اڑی پھر رہی تھی۔

کب اس تکی کے رنگ اڑھے خیر ہی نہ ہوئی۔ خضر نے کبھی اسے کسی کام سے نہ روکا تھا۔ مگر اب شاید اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ کبھی تو وہ آئینہ لیے اس کے روبرو آکر اٹھا ہوا تھا اور اس آئینے میں اس کا چہرہ کتنا جیسا تک تھا۔ اس چکا چوند دنیا کے پیچھے جو سیاہی تھی وہ سیرت کو اپنے چہرے پر چھپا ہوتی نظر آ رہی تھی۔

وہ دنیا میں تبدیلی لانے چلی تھی، اپنی سوچ سے اپنی

تحریر سے، اور کتنے کچے تھے اس کے رنگت جو بس دنیا ہی تیر لی۔ پابند پڑ گئی۔ وہ تو خود سہرا بدل گئی تھی۔ وہ ساری باتیں وہ سارے کام جن سے، کبھی اسے شہرت تھی وہ سارے اس نے اپنا لیے تھے۔

وہ اٹھ کر ڈرننگ ٹیبل کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ دوپٹے سے بے نیاز یہ وہ تھی جس نے کبھی سر سے دوپٹہ ڈھکنے نہ دیا تھا۔ وہ اضطرابی انداز میں اور ڈرننگ کی طرف بڑھی، کتنے ہی خائفانہ لگا لگانے کے بعد اسے بیک کمر کا دوپٹہ ملا تھا۔ کانٹے ہاتھوں سے اونٹ اڑھنے کے بعد اس نے ڈرننگ ٹیبل سے ٹیل پائس ریموور اٹھایا اور کیونکس صاف کرنے لگی۔ یہ کام کرنے کے بعد اس نے ہیر منڈ میں بال بکترے پھر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مگر کوئی کجا تھی ابھی بھی کوئی کئی تو تھی جو اسے محسوس نہ ہو رہی تھی۔

تھک کر وہ دوبارہ کمر بیٹھ بیٹھ گئی۔ ظاہری طور پر وہ خود کو بیل بھی لیتی تو وہ اب پرانی سیرت فاطمہ نہیں رہن سکتی تھی۔ جو جس کا دل بیار اخصا جس کی سوچ خوب صورت تھی۔ اس سوچ نے جیسے اس پر جتوں سوار کر دیا تھا۔ سارے سوزے اس نے پھاڑ ڈالے تھے۔ اسے پورا مومن کی سی ڈیر تو ڈالی تھی۔ وہ چیخ کر رو وہی تھی۔ وہ اب کبھی نہیں لکھ سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے اندر کی رائز مرنی ہے۔ خود کو کھودنے کا پتہ پتہ تا اب کبھی اسے لکھنے نہ دے گا۔ وہ اب کبھی قلم اٹھاتی نہیں سکتی تھی۔





# قافلے راہ بھول جاتے ہیں

اس نے اس کی تصویر کو دیکھا اور مسکرا دی۔  
 ”قافلے راہ بھول جاتے ہیں۔“ تصویر کے نیچے  
 لکھی یہ عبارت وہ اس اس کے ہاتھ کی تھی جنہوں نے  
 ہمت۔ بے تحاشا محبت کی تھی بائبل خان سے اور ہمیشہ  
 اتنے وثوق سے یہ بات کہنا کرتے۔  
 ”ہمارا بائبل خان محبت کرنے کے لیے ہی بنایا گیا  
 ہے۔ وہ اتنا حسین ہے کہ اس کے حسن و جمال کی تعجب  
 تابک کے سامنے نگاہ نہیں ٹھہرتی۔“  
 ”یسا حسن کہ خالق کی تخلیق سے پیار آجائے۔“  
 پیش کتنی محبت ہو آرتی تھی ان کے گھٹے میں۔  
 ”جب ہماری ڈالے بڑی ہو جائے گی تو ہم اس کا  
 بیابان خان سے کریں گے۔“  
 ”وہ بھی بائبل خان کی طرح سے ہی خوب صورت  
 ہے۔ تاہم اس میں؟“ وہ جھٹک کر پوچھتا اور وہ اس میں  
 اسے جھٹک کر چوم لیتے۔  
 ”وہ بھی خوب صورت ہے۔ مگر اپنے بائبل خان  
 کی تو بات الگ ہے اس کا کیا مقابلہ۔“  
 ”بائبل خان اپنے سے تم خوب صورت لڑکی سے  
 شادی نہیں کرے گا۔“ ”جو اب؟“ وہ نخوت سے کہتا اور وہ  
 سانس ہتے جاتے پھر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے  
 اور کہتے۔  
 ”تجھ سے زیادہ حسین لڑکی کا ملنا مشکل نہیں  
 ناممکن ہے پتہ اس لیے تو ڈالے سے ہی بیاہ کر لیتا۔ اتنا  
 حسین من موہنا چہو بس ایک ہمارے بائبل خان کا ہی  
 ہو سکتا ہے جسے وہ کہہ کر قافلے راہ بھول جائیں۔“

”قافلے راہ کیوں بھول جاتے ہیں وہ؟“ وہ  
 معصومیت سے پوچھتا اور وہ مسکراتے لگتے۔  
 ”توہ جب کسی شاہکار کو تخلیق کرتا ہے تاہم پتہ اس  
 کی مخلوق کو خود بخود ہی اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہ  
 بھی قدرت والے کی ایک قدرت ہے۔ اس نے حسن  
 کو ہر کسی کی کمزوری بنایا ہے۔ جیسے میری کمزوری تیر  
 محبت جو ہے تاہم پتہ بڑا ہی ہے۔ وہ اور اب کھا خفیہ ہے  
 پیازوں سے گھریں نگار اور۔“  
 ”دوانتے جاتے اور ان کی کی جرات توڑتی اس کی  
 کچھ میں آتی تھی۔ وہ لگتے ہی لمحے کسی کھیل میں مگن  
 ہو جاتا اور وہ اس میں اپنی کسی کتاب کے مطالعے میں  
 جبکہ ڈالے سوچتی رہتی قافلے راہ کیسے بھول جاتے  
 ہیں؟“

دو سائیس کی وفات کے بعد بائبل خان پر جانلی کے  
 لیے ہوش میں ہی مقیم ہو گیا۔ وقت گزر گیا۔ وہ  
 ایک بہت عام ساون تھا جب وہ اپنے کالج فیلو سے قونسل  
 لینے اس کے گھر آیا تھا۔ اس کی دستک کے جواب میں  
 دروازہ ایک بوڑھی خاتون نے کھولا۔  
 ”ارسلان ہے! مجھے اس سے کام تھا۔“ ”بڑھیا کی  
 بغور جائزہ لیتی نظروں سے جڑبڑو تاہم گڑبڑا کر بولا تھا۔  
 ”وہ نہیں وہ گھریہ نہیں ہے تم کون ہو؟“  
 ”میں بائبل خان ہوں وہ آئے تو اس سے بتا دیجئے گا۔“  
 وہ ہانسنے کو بلاتا تھا جب بڑھیا نے بے سمانتہ پکار لیا

تھا۔  
 ”نمبر آجاؤ۔ اس کا انتظار کرو آتا ہی ہو گا۔“  
 انہوں نے اسے بلا کر چائے پنی پانی تھی۔ تب ہی  
 تھوڑی دیر بعد ارسلان بھی آیا۔ اسے دیکھ کر واقعی  
 حیران ہوا۔  
 ”جیسے وادی نے ہٹھالیا تھا چائے بھی پلائی۔“  
 اس کے کمرے میں آکر وہ مزے سے بولا۔  
 ”مگر نے کون سا سحر بھونک دیا ان۔ وہ تو کسی انجان  
 کو گھر کے آس پاس بھی بھٹکنے نہیں دیتیں؟“ ارسلان





دوران تعلیم ہی اسے فلم میں کام کی آفر ہوئی تھی تو اس کی بنیاد وجہ اس کی بے تحاشا مروت و جہالت ہی تھی۔ باہل خان نے اس آفر کو قبول کیا اور کسی کے ظم میں لائے بغیر پہلی فلم سائن کر لی۔ جو پاسکس انس پرو پاکستان کی تاریخ میں کامیابی کے تمام ریکارڈ توڑ گئی۔ اور بیس سے گویا اس کی شہرت و کامیابی کا آغاز ہو گیا۔ اسے دھڑا دھڑا فلموں میں سائن کیا جانے لگا۔ راتوں رات میں وہ سیلوی بن گیا مگر وہاں کی طرف سے اتنا ہی شدید ری ایکشن سامنے آیا تھا۔

ایا تو یا قندہ ناراض ہوئے اور اسے کہنے لگی مینا نہ گھنے کا حکم سناؤ۔ ساتھ ہی علق کرنے کی بھی ہدایت دی۔ وہ ایسا لازی کر لڑتے آ کر جو اس کی ہاں اڑے نہ آجاتیں۔ یہ لہاں ہی نہیں جنوں نے اپنی مسلسل کوششوں سے بایا کے دل کو اس کی طرف سے صاف کیا تھا۔ اس کی بے دریغ کامیابیوں کے جھنڈے گڑے دیکھ کر بایا کول بھی سچ گمراہ بھی اسے سوانگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ نہیں کیا تو ڈالے آفریدی نے جو اس کے گسے چاچا کی بیٹی تھی اور اس کی بچپن کی منگ بھی۔

باہل خان کا ارادہ ہی کہاں تھا اس سے شادی کرنے کا۔ نہ اس کی ڈالے سے کوئی بینائی و انتہی تھی۔ ان کے ہاں پردے کی بہت سختی تھی اور اس نے تو بچپن کے بعد ڈالے کو بھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر اس سالی شام جب اس کی بہن کی شادی تھی اور وہ اس روز شوٹنگ سے فارغ ہو کر واپس چلی آیا تھا چونکہ روٹانے کے لیے ہی ساری شاینگ کر کے لایا تھا جب ہی میرا اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”روٹی اور کھوکھی خوب صورت شاینگ کی ہے تمہارے لیے۔ کیا اب بھی خفا ہی رہو گی؟“ ہاتھوں میں موجود شاینگ پیکر بیڈ پہ اچھالتے وہ فوراً آگے بڑھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑی لڑکی کے گلے میں بازو جاگل کر رہا ہوا شوٹی سے بولا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے جھٹکا لگا تھا۔

سے فاصلہ برحواں باہل خان تو اس کے حسن کی چٹکا چوند سے بہت کھڑا رہ گیا تھا۔ جبکہ وہ اسے تیز نظروں سے گھورتی کمرے سے نکل گئی۔

”لالہ! اسے اس کتے سے روٹی کی آواز نہ نکالا جو اسی بل و اش روم سے نکلی تھی اسے دیکھ کر خوشی سے چلتی آ کر اس سے پٹ گئی۔

”آپ آگے ہیں؟ مجھے یقین نہیں آ رہا؟“ روشی اس کا بازو دھا کر بولی وہ جیسے چونک گیا۔

”یہ لڑکی کون تھی روشی! چو ابھی کمرے سے گئی ہے؟“

”کون؟ آپ ڈالے کی بات کر رہے ہیں؟ آپ کو نہیں پتا وہ آپ کی منگ تیرے ہے۔“ وہ شرارت سے آنکھیں نیچا کر بولی اور باہل خان بری طرح سے چونک گیا۔

”یوں میں سہرا چاچو کی بیٹی؟“

”ہاں تو اور کہا۔“ وہ چپٹے لگی۔

”کیسی لگی آپ کو؟“ اور اس سوال پر وہ چونک گیا تھا۔

”اب بھی آپ کو اس سے شادی نہیں کرنی؟“ وہ شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ حیران ہوا۔

”ہاں بتاتی ہیں آپ بچپن میں کسی کما کرتے تھے کہ اپنے سے زیادہ حسین لڑکی سے شادی کریں گے۔“

”تو کیا وہ نہیں ہے؟“

”نہیں۔۔۔ وہ آپ سے کم خوب صورت ہے لالہ!“ روٹانے وٹوں سے بولی تو وہ مسکرا دیا تھا۔

”پھر بھی اب مجھے اس سے شادی کرنی ہے۔“

”اوسے ہوئے۔“ روشی کے لہجے میں متقی خیرتی تھی وہ مسکراتے ہوئے پٹ گیا۔

پسندیدگی پہنچا چکا تھا ڈالے نے اسے سرخروں پر روک کر اس سے کہا تھا اور وہ جوتے چلا اور سر اٹھایا تھا یوں روکے چلنے پر ششدر رہ گیا۔

”بوجہ پوچھ سکتا ہوں؟“ اس کا لہجہ ناچاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا۔

”یہ چھٹی وجہ نہیں ہے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی۔“ ”ہو لالہ! اس کے لہجے میں حقارت ہی حقارت تھی۔ باہل خان لنگ ہونے لگا۔

”اس نا پسندیدگی کی وجہ؟“ وہ جیسے طیش سے بھرنے کو تھا۔

”اور بھی ہیں مگر سب سے اہم اور بڑی وجہ آپ کا شوہر میں ہونا ہے؟“ اس نے اسی انداز میں کہا باہل خان ٹھنڈا سا سن بھر کے رہ گیا۔

”تم میری بچپن کی منگ ہو۔ میں تمہیں چھوڑنے والا نہیں ہوں۔“ ڈالے کے چہرے کا تاثر پڑھنے لگا۔

”یہ قانون قدرت ہے باہل خان! کہ باک و امن خور توں کے لیے باک و امن مروت مجھے ایسا شخص ہے قابل تحمل ہو سکتا ہے جس کا کردار مخلوک ہو۔ جس گندگی سے منسلک ہو تم وہاں ہر قسم کی برائی نہ کھریا جاتا ہے غیر عورتوں کو اتنے دھڑلے سے گلے کا ہار بنائے پھرتے ہو اور اس برائی سے بچے ہو گے۔“

”آج تک گمراہ تیر چلائی رہی اور ضبط کی سرخیوں سے باہل خان کا چہرہ انکار ہو گیا۔ اور اس بل جب وہ اسی غموت سے پٹ کر جاری تھی باہل خان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک ٹھٹکے سے اپنے مقابل بھیج دیا تھا۔ ابھی وہ سنبھل رہی تھی۔ پائی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا۔

”باہل خان نے بارنا نہیں سیکھا ہے ڈالے میم! ہم آپ کو جیت کر دکھائیں گے۔ چیلنج کرتے ہیں آپ کو۔“

وہ اس جھٹکے سے سنبھلی نہیں تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر مشتاقا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ دانت بیستی رہ گئی۔

جاتی تھی اس کے انکار کو تب بھی اہمیت نہ دی جاتی اگر جو بچپن میں اس کے ساتھ منگنی نہ بھی ہوئی ہوئی۔ پھر اب تو سوال ہی بیدار نہ ہوا تھا۔

باہل خان کے ایک بار کہنے کی ہی ضرورت پیش آئی۔ اور ان کے نکلنے کی تاریخ ضرور کہہ دی گئی۔ وہ تو صرف آنسوؤں پہ اختیار رکھتی تھی موٹل کھول کر آنسو بہاتے۔

انہی بستے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ بہت باری ہوئی کیفیت میں تھی جب وہ بہت انتہا سمیت اس کے کمرے میں چلا آیا تھا۔ برابر بیڈ کے کنارے نکلتے ہوئے اس کے آنسوؤں کو بہت نرمی سے اپنی پوروں پہ صیغ کر آسکتی سے گویا ہوا تھا۔

”باہل خان اتنا رازاں تو نہیں ڈالے آفریدی کہ دینا مانگے تمہیں ملے اور تم رب سے شاکی ہو کر رہو۔“

”اس سے اندازہ کرو کہ تم اس سے زیادہ کم تر حیثیت رکھتے ہو میرے نزدیک کہ میرے جیسی صابرو شاکر لڑکی بھی رب سے شاکی ہو کر رہ پڑی۔“ وہ حواسوں میں آئی تو اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے ناگوار سی سے بولی۔

”ایک دنیا بولی ہے باہل خان کی اور تم۔“

”مائی فٹ! میرے لیے تم قابل نفرت ہی ٹھہرو گے۔“

اس کا لہجہ بیٹوز تھا۔ باہل خان نے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھا اور ہونٹوں کو سختی سے سمجھ لیا۔

”ایک بات یاد رکھنا ڈالے آفریدی! باہل خان کبھی ہارا نہیں ہے۔ ابھی ہی دیکھ لو بیانیانا تمہیں اپنا؟“

اس کے لہجے میں موجود غم کو پا کے ڈالے زہر خند انداز میں ہنس پڑی تھی۔

”میرے وہودیہ اجارہ داری حاصل کر کے تم کیا سمجھتے ہو باہل خان! فتح کر لیا مجھے ارے بے وقوف، جیت تو لوں گی ہوتی ہے اور ڈالے کا دل تم سے۔ بیش نفرت کرے گا۔ سن لو تم۔“ وہ اس کی بات سن کر مسکرایا پھر قہقہے سے گویا ہوا تھا۔

وہ اپنی حیثیت سے گو کہ بہت اچھی طرح آگاہ تھی

وہ کونسا کہانے کے انداز میں چلی تھی اور سرعت



”بازل خان والوں کو جیتنے کے فن سے آگاہ ہے لغت محبت میں بدل ڈالے گا چنچ کرتے ہیں۔“ نزال نے نخوت سے سمر جھٹک دیا۔ بازل خان کچھ دیر اسے تکتے رہنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”یار رہا ہوں۔ رخصتی اس لیے نہیں کرواؤں گا کہ مجھے بھی آپ کے وجود کو محبت کے بغیر مانا اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے جفا کر کہا اور پلٹ کر چلا گیا۔



پھر ایک سال چپ چپاتے گزر گیا۔ وہ فلموں میں اور بھی مصروف ہو گیا۔ مبارک کا اتنا ہوا جاتا تھا۔ بابا اسے گاؤں کا پکڑ لگانے کا کہہ رہے تھے مگر اس کی مصروفیات ہی ختم ہوتے میں نہ آتی تھیں۔ مگر پھر وہ ماں کے اصرار پر گاؤں آیا کہ روٹانے کے ہاں بہت پیاری سی بیٹی نے جنم لیا تھا۔ ایک یار پھر وہ دھیروں تھانف کے ساتھ آیا تھا۔ جنہیں یاد کر بھی اس میں روشنی فوش نہ ہو سکی۔ ”اس شہرت اور دولت کی چکاچوند نے ہم سے ہمارا لالہ چھین لیا ہے۔ کتنا کم دستیاب ہوتے ہو۔ شادی کے بعد اب دیکھ رہی ہوں۔“ روشنی کی شکایتیں ختم ہونے میں نہ آئی تھیں۔ وہ بس سنتے ہوئے مسکرائے گیا۔ ”شادی بھی اوجھری کی درد نہ ڈالے گی وجہ سے ہی بھاگ بھاگ کر آتے۔“

”رخصتی کرادیں؟“ ماں نے پوچھا اور اس نے ایک بار پھر ٹال دیا۔ ایلینے نزال سے ملاقات کا ارادہ ضرور باندھ لیا تھا۔ مگر اسے چاچو کی طرف جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ صبح جب وہ حویلی کے پائین باغ میں رائیڈ ٹک کر رہا تھا اس نے نزالے کو گیٹ سے اندر آتے دیکھا تھا۔

سیاہ بلوچی کڑھائی والی چادر میں اس کی دوھیا پر نکت لٹکارے مار رہی تھی وہ اپنے دھیان میں مگن تھی اس کی موجودگی سے بے خبر رہی اور اسے مہسوت ہو کر تلتے بازل خان کو اچانک شہرت پہ آکسا گئی

بازل خان نے گھوڑے کو ایڑھ لگائی اور دوڑا تا ہوا اس کے نزدیک لے آیا۔ ہاویں کی آواز پہ وہ چونکتے ہوئے متوجہ بھی ہوئی مگر اس کے ارادے کو نہ جان پائی تھی۔ جب ہی اس کے جھانسنے میں آگئی۔ اگلے نئے وہ ہوا تھا جو کم از کم نزالے کے گمان تک میں نہیں تھا۔ اس کے قریب لا کر گھوڑے کی رفتار بھی کرتے ہوئے اس نے ذرا سا جھک کر نزالے کو اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا اور دوسرے پل وہ اسے اپنے ساتھ گھوڑے کی پشت پہ سوار کر لیا تھا۔

نزالے حیرت اور بے یقینی سے چند لمحوں کو حرکت بھی نہ کر پائی جبکہ بازل خان ہستے ہوئے اس پہ جھک آیا تھا۔ ”ہیلو مائی سوٹ ہارٹ! کیسا لگ رہا ہے پہلی بار اپنے شوہر کے ساتھ نزدیک آتا؟“

اس کے شوخ لہجے میں معنی خیزی تھی۔ نزالے کی حیرت تمام ہوئی تو مایوس کو شہر پریم کے زبان اور تکانے لے لے لیا۔ وہ ایک دم پھیرے ہوئے انداز میں اس کی پانوں کے حصار میں چلی گئی۔ ”ارے رے اپنے ساتھ مجھے بھی گراؤ گی ڈار لنگ! آراہ سے پیار سے۔“

اس کی مزاحمت کے جواب میں وہ مصنوعی گھبراہٹ سے بولا تو نزالے کا اشتعال اور بڑھ گیا۔ ”تمہیں جرات کیسے ہوئی اس قدر کھنیا حرکت کی؟ اتار دو مجھے فوراً۔“ میں تمہاری فلم کی ہیروئن نہیں ہوں جس کے ساتھ تم جیسی مرضی چپ حرکت گزرو اور میں آگے سے دانت نکال کر تمہاری حوصلہ افزائی کروں۔“ وہ دانت پیس کر پھینک دیتی تھی۔ مزاحمت ہنوز جاری تھی جس میں انصاف اس کے بازوؤں پہ کئے مار کر اور تانوں سے کھینچ کر لیا گیا تھا بازل خان نے ٹھنڈا سا سانس بھرا۔

”تم شوہر والوں سے اتنی متفر کیوں ہو آخر یہاں کام کرنے والا ہر ایک ٹریڈ ایکٹس لازمی نہیں کہ اتنی سسطی سوچ ہی رکھتے ہوں۔“ اس نے گویا اپنی پوزیشن کی

سلیٹر کرنا چاہی۔ ”بازل! مجھے اتار دو پلیز! اس پہ اثر نہ ہو تا دیکھ کر وہ رد اپنی ہو کر بولی تھی۔

نخوت شرم اور غم و غصے سے اس کا برا حال ہونے لگا تھا۔ مگر کوئی دیکھ لیتا تو لگتا نط تاثر پڑتا اس کا۔ اور ایک یہ تھا احساس ہی نہ تھا گویا اسے۔

بازل خان نے کچھ کہے بنا میلے گھوڑے کو روکا پھر سہارو لے کر اسے نیچے اتارنا چاہا مگر وہ اس کا ہاتھ جھکتی خود ہی نیچے گوی تھی۔ اور جب تک وہ اندر آیا وہ واپس جاتے کو بھی تیار تھی۔

”تم ہی جلدی کیوں سارہی ہو بیٹھو نا؟“ روشنی اس کے اٹنے پیروں کو روکی تھی۔ ”جیران ہو کر بولی تھی۔ بازل خان نے بغور اس کی اٹھتی گرتی پگلوں کی جھالوں کو دیکھا۔ پتا نہیں کس احساس سے اس کا چہرہ بے تحاشا سفسخ ہو رہا تھا۔

”دو نہیں۔ میں پھر اچھا لگی۔“ اس نے نرمی سے کہا تھا اور چائے کو پلٹ گئی۔ ”چلو میں پھوڑا آتا ہوں۔ چاچو چچی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

بازل خان کی نظریں اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ دروازے سے اس کے ساتھ ہی باہر نکلا۔

”اس زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ جواباً بھڑک اٹھی۔ بازل نے نظریں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”ایسا رویہ کب تک رہے گا نزالے؟“

”ہیشہ! امداری زندگی۔ میں کبھی تمہاری بی بی رانی نہیں کروں گی۔ خود سوچ لو تمہیں کیا کرنا ہے۔“ وہ سختی سے اپنی آگے بڑھ گئی۔

بازل خان کی سوچی نکاہیں اس کے اٹتے قدموں میں اٹھ کھیں جو ہر لمحہ فاصلہ بڑھا رہے تھے۔



اسے حویلی سے آئے چھ ماہ ہو رہے تھے۔ وہ اتنا

بددل ہوا تھا کہ وہ بار بار پلٹ کر وہاں گینا ہی نہیں۔ اب تو بابا اماں کے ساتھ چاچو بھی اسے بلانے لگے تھے مگر وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے ٹالے جاتا۔

”بازل! تم نے رخصتی بھی کرانی ہے کہ نہیں؟“ وہ ایک دن اماں نے تنگ آکے اسے خود فون کر لیا تھا۔

”مجھے تو کرانی ہے اماں! آپ اپنی بہو سے پوچھیں اسے کب کرانی ہے۔“ وہ بے دلی سے بولا تو اماں نے جواباً اسے گھر کر ڈالا تھا۔

”اچھا میں! اب اس نہالی یہ الزام نہ رکھو نہ سہو تو تب بھی نہ بولی تھی جب تم نے ایک دم نکاح کا شہر شا پھوڑا تھا۔ اب بھلا اعتراض کیوں کرتے کی؟“

اور ان کے اعتماد و یقین یہ وہ ٹھنڈا سا سانس بھر کے رہ گیا۔ اماں کا فون بند کرنے کے بعد اس نے اسی وقت نزالے سے رابطہ کر لیا تھا۔

”مختصر! امیری اماں کو اب میری شادی کا شوق ہو رہا ہے۔ بناؤ کب آؤں؟“

”میری اجازت سے کرو گے نا تم؟“ وہ جواباً طنز سے پھینکی تو بازل خان مسکرایا۔

”رضامندی سے تو کروں گا یا ر! ایس ڈیڑھ سال سے انتظار کی سہیل یہ لڑنا ہوا ہوں۔“

”مگر ایسا ہوتا تو پھر تمہاری منکوحہ نہ کہلا رہی ہوتی۔“

”اس کا مطلب رخصتی کرالوں تمہیں کوئی اعتراض نہیں؟“

جواب میں اس نے ہنسا کر فون بند کر دیا تھا۔ بازل خان نے سیل فون ہاتھ میں لیے کچھ دیر سوچا پھر ایک نظم ٹائپ کرنے لگا۔

میرے ہاتھ پر لکھ دو فیصلہ جو اپنی کا اتنا مختصر لکھنا چھٹی مختصر تمہے مجھ سے محبت کی اتنا مختصر لکھو فیصلہ جدائی کا جتنی میری سانسیں ہیں۔

فیصلہ جدائی کا کر طویل لکھو گی تب میں پڑھ نہ پاؤں





میرے جینے میں کئی قابل قدر آہنم شامل کر دیے تھے اور جہاں تک تعلق ہے حسن کا تو خود بصورت تو میں تھی لیکن جتنی حسین اپنی شادی پر لگی اس کی بڑی وجہ میری لیسٹ فرینڈ تاجبہ تھی جو شہر کے سب سے

ویسے تو وہ صرف میری بیویوں میں تھی لیکن مجھے اس سے شدید ترین چڑھائی تھی۔ اس "سپر" کی وجوہات جاننے کے لیے آپ کو میرے ساتھ ماضی قریب میں ایک جہاں ادا فی پڑے گی۔ تین برس پہلے جب میں بیاہ کر دنیاجب ہاؤس "انٹی توپوری کالونی میں میرے حسن کی وجوہات اور جینے کے چرچے پھیل گئے تھے۔ حالانکہ میرا مہنگا کچھ اتنا امیر و کبیر نہ تھا مگر آٹھ بن بھائیوں میں آخری نمبر ہونے کی وجہ سے مجھے جینے میں کھول کر دیا گیا۔

ابھی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جینے رہے تھے مگر ایک دو برسے پر ہی سہت لے جانے کے پکڑ میں "بن" بنو بیوں بھائیوں' بھائیوں نے

ابھی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جینے رہے تھے مگر ایک دو برسے پر ہی سہت لے جانے کے پکڑ میں "بن" بنو بیوں بھائیوں' بھائیوں نے

ابھی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جینے رہے تھے مگر ایک دو برسے پر ہی سہت لے جانے کے پکڑ میں "بن" بنو بیوں بھائیوں' بھائیوں نے

ابھی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جینے رہے تھے مگر ایک دو برسے پر ہی سہت لے جانے کے پکڑ میں "بن" بنو بیوں بھائیوں' بھائیوں نے

ابھی تو اپنی استطاعت کے مطابق ہی جینے رہے تھے مگر ایک دو برسے پر ہی سہت لے جانے کے پکڑ میں "بن" بنو بیوں بھائیوں' بھائیوں نے

گئے تھے۔ ماؤ جی کی حالت بھی بے حد خراب تھی۔  
"پر۔۔۔ دینے کے لیے آئے لوگوں کو بوجھ کر وہ خود کو نقصان دلا کر لے کر وہ واقعی ہی مڑ گیا ہے۔ مگر تین تھاکہ آکر نہ بیٹا۔"

وہ جس سے ایک مدت اس نے اس لیے نفرت کی تھی کہ اس کے خیال میں وہ بھٹک گیا تھا گمراہ ہو گیا تھا جس کے ساتھ وہ بھی گمراہ ہو جاتی۔ گمراہ گار ہو جاتی۔ مگر اس گمراہ انسان کو ایک لمحہ ہدایت کا تمام گناہوں سے پاک کر گیا تھا۔

شہنشاہ کے حلقے میں اس مرتبہ وہ جس علاقے میں گئے تھے وہ سیلاب زدہ علاقے سے نزدیک ترین تھا۔ شونگ کے دوران ان تک یہ اطلاع پہنچی تھی کہ اس گاؤں کی شہر کا بند ٹوٹ گیا ہے۔ ایک افراد انگری کے عالم میں ان کی ساری ٹیم وہاں سے اپنی جانیں بچا کر بھاگی تھی سوائے بائبل خان کے۔ اس نے وہاں آفت اور

مریشانی میں کھیرے لوگوں کی جانیں بچانے کی مقدور بھر کوشش کی تھی۔ اور اس کوشش میں ہی وہ اور بہت سے قیمتی اہل جان جانے والے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا۔

نیوی پہ اس کے جذبے کو اس کی بیٹی کو سراہا گیا تھا۔ چار دن بعد جب اس کی نفس ناموت میں بند کر کے حویلی پہنچائی گئی تو سفر آخرت کی اس کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

پھولوں کی پتیوں کے درمیان گہرا اس کا چاند چہرہ ڈالنے نے دیکھا تھا اور کہیں گی نہ رہی تھی۔ وہ چلا گیا اور جاتے جاتے اس سے کیا وعدہ بھرا گیا۔

وہ ایک بار پھر جیت گیا تھا۔ ڈالنے کے دل کو اپنا گردیدہ کر کے جو کلام اس کا قول نہیں کر سکا تھا۔ اس کا آخری فعل کر گیا۔

اب وہ اسامیں کی بات سے وہ بھی متفق تھی۔ ہاں وہ ایسا تھا کہ اسے دلچسپ کر قافلے آج بھی راہ بھول جاتے تھے۔ وہ بھی راہ بھول بیٹھی تھی۔

میں تو میں جدائی کے فیصلے کو پڑھتے تک زندگی کا ساتھی ہوں  
زندگی تمہاری ہے  
اس نے نظم ڈالنے کے نمبر پہ سٹڈ کر دی تھی جسے ڈالنے نے سرسری پڑھا اور اگلے لمحے اسے ڈیلیٹ کر دیا تھا۔

یہ ایک عجیب دن طالع ہوا تھا۔ بے چینی حد سے موات بھی اسے عجیب خواب نظر آتے رہے۔ جن کی وہ ہشت کا احساس ابھی بھی دل میں موجود تھا۔ وہ بے گل سی ہوتی پھرتی رہی تھی دن گزارا شام و صبح گئی۔ اسے بے چینی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

اباں بیاہاں تک کہ ماؤ اور تائی بھی تھیک تھے۔ وہ دو باہر صبح سے فون کر کے ان کی خیریت دریافت کر چکی تھی۔ ایک چکر بھی ان کے پاس لگا گیا تھا۔

مغرب کی لڑائی کی ریکارڈنگ میں گوجی تو اس نے خود کر کے نماز کی نصیحت بائبل نہ دیا مانگ رہی تھی جب اس کے سواش کی تکلیف ڈالنے سے بچتی چلی گئی۔

گھبراتے دل کے ساتھ سیل فون تک آئی پھر ناؤ جی کے گھر کا تھا اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔  
"ڈالے پتر اتنے نیوی لگا یا؟ خبر سنی؟" دوسرے سمت تائی جی بائبل کی اماں تھیں۔ اونچی آواز میں زور زور سے روتے ہوئے وہ گھبرا سی گئی۔

"نہیں تو امان! خیریت کیا ہوا؟"  
"ہم لٹ گئے ہیں ڈالے! برباد ہو گئے۔ بائبل۔۔۔ میرا بائبل مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" وہ اسے بتاتے ہوئے پھیٹ پھیٹ کر رونے لگیں اور ڈالے کو جیسے کہتے ہو گیا تھا۔

یہ زندگی جس کی آنکھوں میں ہر دم مسکراتی تھی مگر گناہے یقین کرنا محال تھا۔ ایک قیامت تھی جو ناگہانی ٹوٹ پڑی تھی۔ تائی اماں کو ہدیائی دورے پڑنے





مشورہ ہوتی بار بار میں بطور پہلو کام کرتی تھی اس نے اپنا سیکھا ہوا سہارا ہنر مجھ پر آزمایا ڈالا تھا۔ ہر دیکھنے والے نے مجھے دل کھول کر سراہا تھا میں حق سمجھ کر اپنی تعریفیں وصول کرتے ہوئے خوب مغرور ہوئے جا رہی تھی مگر صرف دس دن بعد شہلا نے مجھے منظر نامے سے دھکیل کر میری جگہ ہتھیالی تھی۔

شہلا ”نجیب ہاؤس“ کے عین سامنے والے ”ارشادولا“ کے ارشاد کی بیوی بن کر آئی تھی۔ جس طرح نجیب گھر کے بڑے بیٹے تھے اسی طرح جب بہن بھائیوں میں ارشاد بھائی کا نمبر بھی پہلا تھا۔ میری طرح شہلانے بھی پہلی بیوی بن کر سسرال میں قدم رنجہ فرمایا تھا۔

آستے سامنے کے گھروں میں مثالی تعلقات تھے۔ نجیب کے ٹھیک دس دن بعد ارشاد کی شادی ہونا طے پائی تھی اور جس طرح نجیب کی شادی میں ان لوگوں نے کھلے دل سے شرکت کی اسی طرح ارشاد بھائی کی شادی میں میرے سسرال والے بھی پیش پیش تھے بلکہ

کئی بات تو یہ ہے کہ اس شادی میں شرکت کر کے مجھے بھی برا مزا آ رہا تھا۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ جیزبری کے کاندرا جوڑے پہن کر میں خوب بن بھن کر اپنی محاسن مندوں کے ساتھ ارشاد بھائی کی مایوں ’مندگی میں شرکت کے لیے جاتی تھی۔ اس پر یوں کی لڑکیاں ’بائیاں جب میری تعریف کرتیں تو سبوں خون بڑھ جاتا لیکن جب شہلا بیاہ کر ”ارشادولا“ آئی تو میرا سبوں بردھا خون جل جل کر آجھا گیا۔

ماتا اور خوب صورت تھی اڑنگ بھی گورا چٹھا، توش بھی جھلکے تھے گلاب ایسی بھی کوئی ایسرانہ تھی کہ ہر کوئی صرف اسے دیکھنے کا مشتاق اور ہر زبان پر صرف اسی کے حسن کے تذکرے ذمہ کی تعریف میں ہر کسی نے ارشاد بھائی کی امی کو چاند سی بھولانے پر مبارک باد دی اور میں اپنی ساس کے پہلو میں بیٹھی منتہم ہی رہی کہ کوئی آنکھ اٹھا کر مجھے بھی دیکھے اور

سرا ہے مگر آج میری ساری تیاری اگارت چلی گئی تھی۔ شہلا کے سامنے میرا حسن ماند پڑ گیا تھا۔ ”سسرال نکال بیوٹی پارکروالوں کا ہے اصل شکل تو دو چار دن بعد بتا چلے گی۔“

لوگوں کے ہنصرے سن کر میں نے دل ہی دل میں خود کو تسلی دی مگر دو چار دنوں میں مجھے خود کو پتلا چل گیا کہ میری یہ خوش فہمی شخص غلط فہمی تھی اس بات کا احساس مجھے سب سے زیادہ میری چھوٹی منہ نے دلویا تھا جو بھنگا بھنگا کر ”ارشادولا“ جاتی تھی۔

’سچ ای ارشاد بھائی اتنی حسین ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ابھی انہوں نے عمر کی تمنا کے لیے وضو کیا تھا۔ بغیر میک اپ کے دھلا دھلا چہرہ بالکل چاند کی طرح چمک رہا تھا۔“

یہ میری چھوٹی منہ تھا تھی۔ ہر وقت رسالے ہاتھ میں رہتے تھے ’مانتھہ کلاس کی بچی اور کیسے تشبیہ استعاروں کے ساتھ اس کے حسن کے قصیدے پڑھ رہی تھی مجھے دل میں خوب تو جڑھا۔

”ارشاد بھائی تو معمولی شکل و صورت کے ہیں۔ آئی کو سوچ سمجھ کر رشتہ کرنا چاہیے تھا ایسی لڑکیاں شوہر کو مٹھی میں کر کے سسرال والوں کو گھاس بھی نہیں ڈالتیں ’بچتہ میں کی نویدہ آئی اب ہر کوئی میری طرح تو سسرال میں گھلا نہیں رہتا نا۔“

رات کو میں نے نجیب کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا انہوں نے فوراً ”گردن ہلا کر میری بات کی تائید کی۔

ایک وہی تو تھے جو اب تک میرے حسن کے امیر تھے۔ اپنی بڑی بہنوں کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اور خوب تازہ انداز دکھا کر میں نے نجیب کو دس پندرہ دنوں میں ہی اپنی سٹھی میں کر لیا تھا۔

اور اگلے دن کا ڈر ہے گھر پر صرف میں اور میری ساس ہی موجود تھے جب ارشاد بھائی کی والدہ ایک ڈونگہ ہاتھ میں کپڑے خراں خراں تشریف لائیں۔ شہلا کا کھیر میں ہاتھ ڈلایا ہے۔ میں نے کہا چلو

مجھے میں کھیرناٹہ آؤں پہلی بار میری ہونے کچھ بنایا ہے۔“ نویدہ آئی نے مسرور سے انداز میں آگاہ کیا تھا اور میں جو اپنی ساس کے پاس بیٹھی بڑے اطمینان سے باخبر، فائل کر رہی تھی اس اطلاع پر ذرا چونک کر نویدہ آئی کو دیکھا۔

”اتنی جلدی بھی کیا تھی۔ ابھی تو شہلا کی شادی کو محض ہفتہ ہوا ہے ساری عمر بڑی ہے کام کاج کے لیے۔“ میری ساس بھلی ہنس خاتون تھیں انہوں نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے بھی اچھی سمجھ ہوئے کے ناتے زور شور سے سراہا کر ان کی تائید کی۔

”اسے میں تو متوجہ کر رہی تھی پر اس اللہ کی بندی کو کون سمجھائے اس کا بس چلے تو کچھ والی سچ ہی مجھے بچن سے نکال کر خود ناشتہ بنانے لکھی ہو جالی۔ بڑی مشکل سے ہفتہ بھر کام کاج سے روکا ہے اسے۔ کتنی سے بچے تو سارے انگلوں کاج چلے جاتے ہیں آئی مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مٹھی رہوں اور آپ کام کاج میں لگی رہیں جس آج صبح سے ہی بچن میں گھس گئی تھی پہلے منڈول نویدوں کو ناشتہ بنا کر دیا پھر کھیر چھوڑے پر چھا دی۔“ نویدہ آئی نے پرست انداز میں میری ساس کو اپنی ہمو کی کر دی سے آگاہ کیا۔

”ہو نہ کہنی میسنی نہ ہو تو۔۔۔ ہمیں کب ایسے پتلے آتے تھے سسرال والوں کو قابو میں کرنے کے۔ میری شادی کو دو دو ڈھائی ہفتے ہونے کو آ رہے تھے اور مزید دو ڈھائی ہفتے تک میرا کھیر تو کیا کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالنے کا کوئی ارادہ نہ تھا کراس سے پشتر کہ میری ساس دل ہی دل میں شہلا کے ساتھ میرا مزاج نہ کر کے اسے اضافی نمبر بیتیں میں نے مارے ہاندھے گھر کے کام شروع کر دیے۔

یہ تو ایک چھوٹی سی مثال تھی شہلا سے چڑنے کی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ شہلا کے ساتھ میری چڑ میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ اگرچہ منہ پر میں اس سے خوش دلی

سے ہی ملتی گھرتی ہی دل میں خوب فدا کھاتی۔ میرے سسرال والے اس چڑ کا بنیادی سبب تھے۔ میں برائی بتاتی وہ چپ کر کے کھا لیتے۔ دو دن بعد شہلا برائی کی پلٹ بیٹھتی تو سب ایسے چٹھارے لے کر کھاتے جیسے زندگی میں پہلی بار برائی نصیب ہوئی ہے۔

میں منگے ٹیلر سے کپڑے سلوائی مگر نہ صرف میری بندیں بلکہ اس پاس کی سب ہی عورتیں شہلا کی ڈور ٹنگ اور ڈور ٹنگ کے قصیدے پڑھتیں۔ اس کا اخلاق اس کی مہمان نوازی، اس کا کھیرا، سلیتہ، خوب صورتی، غرض خوبیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا جو دنیا جہاں کو اس میں نظر آتا۔

میں لاکھ کو شش کرتی کہ کسی طرح کسی بھی معاملے میں شہلا پر سبقت لے جاؤں مگر ہر بار تاکا ہی مقدر بنتی ہر دو دنوں کی شادیوں کو سوا سال ہوئے کو آ رہا تھا مگر اتفاق سے ہم دونوں کی گوہر زخالی تھی پھر آخر قدرت کو میرے اوپر رحم آ گیا۔ میں نے ”نجیب ہاؤس“ کو وہ خوش خبری دے دی جس کے وہ شادی کے دوسرے مہینے سے ہی منتظر تھے اور شہلا جانے اس معاملے میں مجھ سے پندرہ دن پیچھے کیوں رہ گئی۔ جی ہاں ٹھیک دو ہفتے بعد ”ارشادولا“ کو بھی خوش خبری مل گئی تھی۔

وہ ہفتوں تک میں نے بستر سے بچے قدم نہ اتارا تھا۔ ریسٹ کے متعلق ڈاکٹر کی ہدایت کو میں نے ذرا وضاحت سے اپنے سسرال والوں کے گوش گزار کر دیا تھا۔ وہ لوگ اتنے خوش تھے کہ میرے سارے ناز نخرے خوشی اٹھانے کو تیار تھے مگر کبھی نہ جانی پھر اس شہلا کی بچی نے مجھے ہیڈ روم سے نکال کر دواد بچن میں پہنچا دیا۔

خوش خبری ملنے کے اگلے ہی روز حلیم بنا کر ہمارے گھر تشریف لے آئی۔ میری ساس نے سمجھایا کہ ”اب زیادہ مشقت طلب کام کرنے سے گریز کرو۔“ تو ہنس کر کہنے لگی۔

”گھر کے کاموں میں کیسی مشقت آئی اور ویسے تو امی میرا بہت خیال رکھ رہی ہیں آج حلیم مجھے گھونٹنے



بھی نہیں دی لیکن میری ڈاکٹر نے خود کہا ہے کہ گھر کے کلام کالج میں حصہ لینی رہیں گی تو ایکٹو رہیں گی۔ طبیعت خرابی کو زیادہ سرپر سوار کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس بھاری اور ذلتی چیزیں اٹھانے سے کریز کریں۔ میڈیسیاں آرام سے چڑھیں اتنی برابر رست کریں اور ڈاکٹر پر توجہ دیں۔

اب میری ڈاکٹر نے بھی ہدایت تو کچھ اسی قسم کی دی تھیں مگر شملہ کو کیا ضرورت تھی یہ ہدایت نامہ ہمارے گھر آکر نشر کرنے کی ہو ویسے وہ اگر نشر بھی کرتی تو مجھے اس کی تقلید کرنا ہی پڑتی کہ بالکل سانس والے گھر میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ اس کا کوئی عمل میرے سرسرا والوں سے پوشیدہ نہ رہتا تھا اور وہ بظاہر مجھے کچھ نہ جانتے تھے مگر میں جانتی تھی کہ دل ہی دل میں ہریل میرا اور اس کا موازنہ جاری رکھتے ہیں۔

خیر شملہ کی باتوں پر عمل کرنے کا نکتہ یہ ہوا کہ میں واقعی آخری صبح تک ستر رست اور ایکٹو رہی اور جب نارمل ڈیوڑھی کے بعد ریان میری گود میں آیا تھا تو ساری کانٹیں دور ہو گئیں۔

شملہ بے چاری کی قسمت میں سب سے بڑی کھلی تھی۔ اس کا مزہ بڑے آپریشن سے ہوا۔ بچے تو خیر دونوں ہی پیارے تھے مگر میرا ریان ہمارے لیے بڑا خوش بخت ثابت ہوا۔ نجیب کی - مرنی جو گزشتہ کسی برسوں سے اٹکی ہوئی تھی ریان کی بیدارش کے اگلے ہی مہینے ان کی برو موٹن ہو گئی۔ ترقی کے ساتھ ساتھ خواہ میں بھی ٹھیک ٹھاک اضافہ ہوا۔

بیٹے کی ماں بننے کے بعد سرسرا میں تو میرے قدم ویسے ہی مضبوطی سے جم گئے تھے۔ اب میاں کی کمالی کا زخم بھی تھا۔ میں جیسے چاہتی پیسے لٹانی کسی کی مجال نہ تھی کہ روک ٹوک کر کے شملہ پر اپنی برتری ثابت کرنے کے بھی اب میرے موقع تھے۔ آئے روز نئے کپڑے سلا کر میں بہت اہتمام سے میچنگ جیولری اور میک اپ کے ساتھ شملہ کے گھر کا رخ کرتی۔

اسے اپنی ذات پر توجہ دینے کا اب کم ہی موقع ملتا

تھا۔ حمزہ تو اگرچہ زیادہ تر اپنی دادی کے پاس ہوتا لیکن شملہ بچے کی طرح ہنسی مسکراتی سب کی فرمائشیں پوری کرتی جان میں ہی موجود ہوتی۔ مانا کہ اس کے سرسرا والے ہر وقت اس کی شان میں رطب اللسان رہتے مگر ایسی تعریفوں کا بندے نے اچار ڈالنا ہوتا ہے کیا۔

میں نے تو اب بچن کا رخ کرنا خاصا کم کر دیا تھا۔ بس جب بھی نی دی پوئی کو لنگ شور کھ کر ہی سی رہی پڑائی کرنے کا دل چاہتا تو میں بہت اہتمام سے وہ چیز نکالتی تھی اور شملہ کے گھر تو حضور بھی جیتی تھی۔

میرے سرسرا والے اٹھکے چھپے الفاظ میں شملہ کی کفایت شعاری کی میرے سامنے مثالیں دیتے مگر اپنی روش بدلنے کا پیرا کوئی ارادہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کمانے والا میرا میاں تھا میں جیسے چاہتی پیسے خرچ کرتی اور آج کل تو میں نجیب کے سر پر ایک اور بڑا خرچہ ڈالنے والی تھی۔ ریان کی پہلی سالگرہ آنے والی تھی اور میں یہ سالگرہ بہت دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی۔ کچی بات تو یہ ہے کہ پہلے میرا خیال تھا کہ گھر میں سالگرہ کی پہلی سی تقریب منعقد کر کے میں اور نجیب کسی شخص سے ہوسل میں ڈنر کرنے جاؤں۔ مہمانوں کو انوائٹ کرنا گھر کی نئے سرے سے صفائی، شپنگ، سالگرہ کا انتظام نرمی دو سہری ہی تو تھی لیکن اس روز میں نے شملہ کی باتیں سن لیں۔

میری ساس کے پاس محلے کی عورتیں کمیٹی ڈالتی تھیں۔ شملہ بھی کمیٹی کی باقاعدہ ممبر تھی۔ پرانی کمیٹی ختم ہو کر نئی کمیٹی شروع ہوئی تو پر جیال ڈالنے کے بعد پہلا ممبر شملہ کا نکل آیا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تھما اٹھا تھا۔

"اللہ نے کیسے میری دعا میں سن لیں۔ اس مہینے مجھے بیسوں کی اشد ضرورت تھی حمزہ سال کا ہونے والا ہے کب سے سوچ رکھا تھا کہ اس کی پہلی سالگرہ۔" وہ میری ساس سے مخاطب تھی اس کی بات اوصوری ہی تھی کہ اندر کمرے سے ریان کے روئے کی آواز آئی۔ وہ جینا سیکھ رہا تھا اور شاید چلتے چلتے گرا تھا

میں ایک عمر اور گئی شملہ کی اوصوری بات سے میں نے پورا نتیجہ اخذ کر لیا تھا۔ وہ کمیٹی کے ممبروں سے اپنے بچے کی دھوم دھام سے سالگرہ منانا چاہتی تھی۔ فطری جتن اور حسد سے مغلوب ہو کر میں نے فوراً "ای مریان کی سالگرہ شان دار طریقے سے منعقد کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ ویسے بھی مریان کی سالگرہ حمزہ سے دس دن پہلے ہوتی تھی میں اپنے بیٹے کی سالگرہ اتنی دھوم دھام سے منانا چاہتی تھی کہ شملہ لاکھ کوشش کرے پھر بھی وہ میری منعقد کردہ تقریب کی برابر ہی نہ کر سکے۔ میں نے سالگرہ کے انتظامات اور اخراجات کا تخمینہ لگا کر خرچوں اور مہمانوں کی فہرست نجیب کے حوالے کر دی۔

"تو خرچہ؟" یارا تم بیٹے کی سالگرہ کر رہی ہو یا شادی۔" نجیب لٹو لٹو کر چیخا ہی تو پڑے میں نے سخت برا مانا تھا۔

"کیسے باپ ہیں آپ بیٹے کی پہلی سالگرہ ہے۔ آپ کو کوئی ارمان ہی نہیں۔"

"اریان ہے یا باپو! میں نے ریان جیسے تمہارا بیٹا ویسے میرا گھر سالگرہ برائے خرچے کی کوئی تنگ بھی ہے نہ پورے نئے فلور کسٹن پھر کھانے کا مینو تو دیکھو مٹھن برائی بکڑھانی گوشت عمیر، گولڈ ڈر ککس اور سوٹ اور مہمان سار خرچہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔" جانے نجیب آج اتنی پس و پیش کیوں کر رہے تھے۔

"رہنے دیں نجیب۔ آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی بات نہیں میں اپنی سونے کی بالیاں بیچ دوں گی جو میری اپنی نے ریان کی بیدارش پر مجھے دی تھیں سچے کی پیسے خوشی پر آپ اتنی تنگ دلی کا مظاہرہ کریں گے میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

میری آنکھیں بھر آئی تھیں اور حسب توقع نجیب ان بھرے ہوئے تین کٹوروں کی تاپ نہ لپائے تھے۔ "اچھا روتی کیوں ہو" میں دفتر سے لوٹ پکڑ لوں گا جیسے مرضی سالگرہ منانا۔" نجیب کی طرف سے گرین سگنل ملنے کی دیر تھی کہ

میں نے سالگرہ کی تیاری شروع کر دی۔ سب رشتہ داروں نے جیسے والوں کو فون کھڑکا دیا جو نزدیک رہتے تھے انہیں گھر جا کر انوائٹ کیا۔ محلے میں بھی سب کو مدعو کیا خصوصاً ارشاد بھائی کی پوری ٹیلی کو مدعو کیا تھا۔

سالگرہ کی تقریب میری خواہش کے عین مطابق بہت شان دار طریقے سے منعقد ہوئی تھی۔ سب مہمانوں نے سالگرہ کے انتظامات پر تقریب منہ کے سامان اور پر تکلف کھانے کی دل کھول کر تعریف کی۔

میں خود پار سے تیار ہونے کے بعد ہی خوب صورت اور اسٹائلش سی ساڑھی میں بلوس ادھر سے ادھر چمکتی پھرتی مہمانوں سے تعریف وصول کر رہی تھی۔ شملہ بھی ذرا سی دیر کو آئی تھی۔ ریان کو پیار کرنے کے بعد مجھے گفت پیک تھمیا پھر فوراً "ہی جانے کی اجازت مانگی۔"

"ارے ابھی سے کیسے واپسی نہ کیگ کٹا کھانا لگا میں تمہیں ایسے کیسے جانے دوں۔" میں نے انگوٹھ سے کہا۔

"میں ضرور رہتی ہوں ابھی ابھی آپ جانتی ہیں آج ارشاد کی چھٹی سے امی کی طرف گئے بہت دن ہو گئے آج وہاں جانے کا پروگرام ہے۔" اس نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"وہ چھاپو جیسے تمہاری مرضی۔" میں بظاہر مسکراتی مگر اندر سے تملاتی "ہو نہ نہ جل گئی ہے۔" خیر میرا مقصد تو پورا ہو گیا تھا۔ شملہ نے دیکھ لیا تھا کہ ریان کی برتھ ڈے پارٹی کس قدر شان دار تھی وہ بے چاری لاکھ کوشش کرتی اپنی کمیٹی کے سارے پیسے پھونک دیتی پھر بھی اس پائے کی تقریب منعقد نہ کیا پتی۔

اور اگلا پورا ہفتہ میں منتظر رہی کہ شملہ کے ہاں سے بھی حمزہ کی سالگرہ کا بلاوا آئے مگر یہ انتظار انتظار ہی رہا۔ شاید بے چاری نے اپنا راز ہی لہتی کر دیا تھا۔ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی تھی مگر وہ چار دن بعد کی بات تھی جب ارشاد بھائی کی ای خان سے ڈھکی ایک ڈش





Thank You Doctors!  
Thank You Nurses!  
Thank You Mothers!



4 Crores Babies Bottoms Touched & ... Still Counting



Prevents & treats nappy rash.

ریشٹل کے 25 سال ہونے کی خوشی میں شامل ہو جائیں!

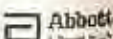
اپنے بے بی کی تصویر اس پتے پر بھیجیں  
اور ایک خوبصورت تحفہ پائیں۔

P.O. BOX No.  
17B42  
Karachi.

Abbott Pakistan Private Limited  
Abbott Laboratories Pakistan Ltd.  
Plot No. 17/B, Sector 17, F-7/2, Islamabad

Net Weight 100gms  
Net Weight 100gms  
Net Weight 100gms

© 2011 Abbott



انہما کے تشریف لائیں۔  
"آج کیا بنا لیا شملانے؟" میری ساس نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔  
"آج شملانے میں قصائی نے بنا لیا ہے۔" کوئٹہ آنٹی نے بھی مسکراتے ہوئے ڈس میری ساس کو تھمائی۔  
"مزہ کا عقیدہ تھا۔ آج ابھی ابھی قصائی کوشت بنا کر گھریا ہے۔ میں نے کہا ابھی رشتہ داروں اور غریب غریبا میں تم لوگ خوب بانٹ آنا میں تو مٹھے کے گھروں میں کوشت تقسیم کر دیتی ہوں۔" اس بار نویدہ آنٹی نے وضاحت کی تھی۔  
"مزہ کا عقیدہ؟" چھا ماشاء اللہ مبارک ہو نویدہ! "میری ساس نے خوش دلی سے انہیں مبارکبادی تھیں۔  
"خیر مبارک بہن جس کیا بتاؤں اس اللہ کی بندی کو شوق تھا کہ مزہ کا عقیدہ ہونا چاہیے۔ شکر ہے اللہ کا۔ آج اس کی خواہش پوری ہو گئی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اللہ کی بندی کی اصطلاح وہ پیار سے اپنی ہو کے لیے استعمال کرتی تھیں۔  
"اگر مزہ کی پیدائش کے وقت برا آپریشن نہ ہوا ہوتا تو ساتویں دن ہی عقیدہ کی سنت ادا کر لیتے مگر یہ پرائیویٹ اسپتال والے بل بھی تو اتنا لمبا چڑا بنا دیتے ہیں۔ اس وقت کنجائش ہی نہ بنی مگر شملانے دل میں فحاش رکھی تھی کہ جب بھی کنجائش نکلی۔ عقیدہ ضرور کرے گی لیکن آپ کو تو پتا ہے کہ چالوروں کے رشتہ آسانوں کو بچھو رہے ہیں۔ ارشاد کی خواہ میں سے کب بچتا ہے میں نے بہت دفعہ سمجھایا کہ بچی کیوں اتنا سوچتی ہے عقیدہ کوئی فرض تھوڑی ہے مگر کبھی کسی امی اللہ نے صحت مند اولاد سے نوازا ہے اتنی بڑی نعمت پر شکرانہ تو واجب ہے نا بچہ اللہ نے بھی اس کی سن لی۔ اس کی خواہش تھی۔ ساگرہ والے دن ہی عقیدہ ہو جائے اسی مقصد کے لیے کیٹی ڈالی تھی۔ پسلا ہی نمبر نکل آیا۔"  
ارشاد بھائی کی باتوں والی تفصیل سے بات کرنے کی

عادت تھیں اور میری ساس بہت اچھی ساری طرح کوئٹہ سے کہ آج میری ساس تھیں بھی دونوں کی گفتگو کی جانب ہی لگی ہوئی تھی اور بھی بھلا ایسا ہوتا ہے تاکہ کوئی بڑی سے بڑی بات بھی آپ کے دل پر اثر نہیں کرتی اور ابھی کسی کی کئی چھوٹی بات شاہہ کر کے آپ کے دل پر لگتی ہے تو شاید وہ بھی کوئی ایسا لمحہ تھا۔  
ہر پار میرے سسرال والے شملانے اور میرا موازنہ کرتے تھے مگر آج میں خود شملانے کے ساتھ اپنا موازنہ اور موازنہ کے بعد محاسبہ کر رہی تھی۔ اللہ نے صحت مند اولاد سے تو مجھے بھی نوازا تھا۔ کتنا پیارا، گھیلو گھیلو سا بچہ تھا میرا میری آنکھوں کی ٹھنڈک ریان اولاد کتنی بڑی نعمت ہے اس کی قدر تو کوئی کسی بے اولاد سے پوچھے اور جب اللہ نے مجھے اس بے پایاں نعمت سے نوازا تو کیا مجھے اس طریقے کے مطابق اللہ کی بارگاہ میں شکر ادا نہ کرنا چاہیے تھا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا؟  
بہتہ سیکھے ریان کی پہلی ساگرہ وجوم وھام سے منانے کے چکر میں میں نے بلا مبالغہ ہزاروں روپے خرچ کر ڈالے تھے۔ اگر کسی کی استطاعت نہ ہو تو لوگ بات مگر میرا شمار ایسے لوگوں میں تو نہ ہوتا تھا پھر جانے کیوں میرے ذہن میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ ساگرہ کے بجائے عقیدہ زیادہ ضروری اور باعثِ ثواب ہے۔ ارشاد بھائی کی والدہ تو تھوڑی دیر بعد چلی گئی تھیں مگر مجھے سوجوں کے گرداب میں الجھتا چھوڑ دیا تھا۔  
اور اگلے دن میں انیسویں راکس چکن روٹوں کی پلیٹ لیے شملانے گھر جاری تھی۔ آج میرا مقصد اس نئی دیکھی کا شملانے پر عبور لانا ہے۔ گھر گزرتا تھا بلکہ میں شملانے کے ساتھ اپنے تعلقات بہتر بنانا چاہتی تھی۔ دل سے بہتر۔ کیونکہ عقل کی بات کسی سے بھی بتا چلے اسے پلو سے بانڈھ لینا چاہیے اور شملانے کے پاس میرے مقابلے میں عقل کی وافر مقدار موجود تھی۔  
تین برسوں میں آخر میں نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی اور یہ عقل مندی کی جانب میرا پہلا قدم تھا۔





عفت سے پاپٹا

# جڑی بوٹی دارہ کی دھولکے

ماقتی۔ بس ایک اسجیدہ۔ وہ خود یہ قابو پاتے ہوئے  
تکے میں منہ لے سکے اٹھی اور باہر سیاہ رات  
دھیرے دھیرے گزرنے لگی۔ کسی کی مجبوری کسی کی  
بے بسی کا خیال کیے بغیر۔



”لو لڑکیاں تو اپنی شادی کی خبر سن کے کھل اٹھتی ہیں  
ذرا اس کی شکل دیکھو جیسے شادی نہ ہوئی کوئی سزا سزا دی  
ہم نے اسے۔“ آپا کے آتے ہی اپنی حسن طرح شہریار  
ہو گئیں زینبہ اور بھی بزمرد ہوتے لگی۔  
”بھیک ہو جائے گی امی جی باہو لڑکیاں اپنے بیٹے  
سے زیادہ الیچ ہوتی ہیں ان کے ساتھ یہ ہی مسئلہ ہوتا  
ہے۔ خواتین کو الیچیشن لے لیتی ہیں۔“ آپا نے ایک

اکتوبر کے اوائل میں دن تیزی سے سمٹنے اور  
راتیں بڑھنے لگی تھیں۔ وہ رات جو ادھر آنکھ لگی اور  
ادھر سمٹ ہوئی کی نفسیاتی ہوتی تھی اب آتی تو یوں لگتا  
جیسے جسم ہی نہ ہوگی۔ آٹھ بجے تک عشا کی نماز سے  
فارغ ہو جانے کے بعد زینبہ کو لگتا اس پر امتحان کی  
گھڑی آن پہنچی ہے۔

جوانی کی شینڈل بہت بدست اور مدہوشی سے بھر پور  
ہوتی ہے پھر کہیں اسے رات شروع ہوتے ہی خوف  
اور دباؤ نے گھیرنے لگتے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر بے چینی سے کہہ نہیں پدتی رہی۔ دل  
تھکا کہ کسی طور جین ہی نہ لے رہا تھا اور آٹھ۔ آنکھ  
تھی کہ خشک ہی نہ ہوتی تھی۔

”یا خدا! اے میرے خدا! میں تجھ سے کچھ نہیں

مبھرتا ہوں





بھیجی نظر کتاب سامنے رکھے خاموش بیٹھی، ذہنی پر  
ڈالتے ہوئے امی کو تسلی دی۔  
"سنتھن لے لیتی ہیں یا دوسے دیتی ہیں؟" امی نے تیز  
لہجے میں کہا۔

"جب سے شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے مجال سے  
جو اس نے ایک بھی کام میں خود سے بڑھ کے دیکھی ہی  
ہو۔ تم بھی روز بروز سراسر سے نہیں آسکتیں، میں  
ایکلی جان کہاں تکسکے لکھوں؟"

"چلیں۔ کر لینے میں عیش و عشرے بھی اس پار میں  
پورے ہفتے کے لیے کئی ہوں۔ جتنی ہو سکی تیار  
کردا کے جاؤں گی۔" آپا نے انہیں غصہ ڈالنے کی  
کوشش کی۔  
"وہ کیوں کوئی شہ رخ اور بھڑکیلے سے کیڑے نہیں لینے  
کسی کے پر جھی لکھی مچلی ہے سب ہی بہت  
ڈرنٹ اور سوور سے ہیں۔ بس امی کو سامنے رکھ کے  
شہیننگ کرنی ہے۔" امی ہنسنے لگی۔

ان کی گفتگو کو ایک ہی ٹریک پہ چٹا دیو کے زہن کا  
طی بھر سائی۔  
"کہنے کو یہ میری ماں۔ مجھے جتم ہونے والی میری  
رگ رگ سے واقف اور یہ میری ماں جانی جس سے  
کوئی خدشی، کوئی غم میں نے کبھی نہیں چھپایا اور اب یہ  
دونوں سب جانتے بوجھتے ایسے انجان بن رہی ہیں جیسے  
مجھے۔ میری خواہش کو جانتی ہی نہیں۔" وہ کتاب بند  
کرتی اٹھ گئی۔

"کل سے تم بھی ہمارے ساتھ بازار جاؤ گی۔ اپنی  
شاپنگ تم اپنی پسند سے کر لینا۔" آپا کو وہ نظر آئی مٹی  
تھی۔

"ہونٹ۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ  
پھیلے۔ "ہند؟ میری پسند کا کیا ہے کیا شادی آپ کی  
پسند نے لوگ آپ کی پسند کے تو پھر کیڑے میری پسند  
کے کیا معنی رکھتے ہیں۔ صرف آپ لوگوں کے شو کو  
کانیاب کرنے کے لیے؟" وہ اس قدر رکتا بولے گی یہ  
نہ تو انی کے ذہن میں تھا اور نہ ہی آپا کے پہلے تو وہ

شہد رانی رہ گئیں۔  
"بہت اچھا۔ تم آرام سے گھر بیٹھو۔ میں اور امی  
خود ہی سب کچھ کر لیں گے۔" آپا نے تیزی سے ہاتھ  
ہلا کر امی کو ہاتھ بھی بولنے سے روکا اور قطعیت سے  
بولیں تو وہ اپنی پستی وہاں سے چلی گئی۔

"دیکھ رہی ہو اس کی حرکتیں۔" امی نے جانے  
اپنے غصے کو کیسے جتن سے کشورل کیا تھا اس کے ہتے  
ہی پھٹ پڑیں۔

"اور توہ امی! کچھ جو صلہ وہ آزما رہی ہے، کچھ آپ  
آزما میں گی، سبھی بات آگے بڑھے گی تاہم آپا نے  
انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بڑھنے لگیں۔  
"وہ اپنا نہیں میرا جو صلہ آزما رہی ہے۔ غضب خدا  
کا ماں باپ نہ ہوئے دشمن ہو گئے اس کے۔ مانا کہ  
بات طے تھی اس کی مسجد۔ مگر منہ زبانی ہی ناگوں  
ساقط کر توڑا ہے ہم نے خدا خواستہ۔"

"پھر بھی پانچ سال ہو گئے تھے بات ہوئے کچھ تو  
اثر لیتا ہی تھا اس نے اور باقاعدہ مٹتی تھی۔ منہ زبانی  
بات پانچ سال تو نہیں رہتی تاہم آپا نے زہن کا دفاع  
بھی بہت مزور رکھے میں کہا۔ اس گھر میں جو مقام امی  
اور ابو کا تھا اسے چیلنج کرنے کی جرأت کسی میں نہ  
تھی۔ بلکہ ابو کے رعب تک تو بعد میں بات چیت  
پہلے جو معاملہ امی کے کورٹ میں اپروہ ہوا تھا۔

"فصل باتیں مت کرو فارہ۔ ابھی کمزور سوچ کی  
ہے یہ لڑکی۔ ہم نے بات طے کی تھی، ہم نے قسم  
کروی۔ وہ تین میں نہ تیرہ میں۔ خا! مجھوا اثر لے بیٹھی  
ہے۔" انہوں نے اپنی ہی کہہ کر رہی سے سر جھٹکا۔  
"ہمیں چھوڑو میں اسے کل کو جب اپنے گھریار والی  
ہو جانے کی تو بے گئی اپنی باضی کی بے وقوفی پر اور ویسے  
بھی کامران کافی اچھا بندہ لگتا ہے۔ اور سب سے بڑھ  
کے یہ کہ اتنی بڑھی لکھی فیملی تینوں بھائی بڑھے کھسے،  
جہنیں بھی لائق فائق اور بھابھیاں بھی اس کامران جل  
گیا کامران کے ساتھ تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" آپا  
اور زہنہ کے بیچ قاسم تھا۔ اس طرح وہ آیا سے پانچ

سال چھوٹی یعنی پانچ سال کے فاصلے پر تھی۔ یہ فاصلہ  
دو چار سال کم ہو یا تو شاید وہ زہنہ کو زیادہ جاننا نہیں۔  
دل پہ لکھی تحریریں کسی ریبوسے مٹائی جا سکتیں تو  
پھر دوتا کاٹے کا تھا۔ وہ بھی دل پہ لکھا اسپر کا نام مٹا کر  
آرام سے کامران کا نام چڑھا لیتی۔

مگر کوئی بھی تو ریبوس نہیں تھا ایسا۔ یہاں آکر سائنس  
فیل ہو گئی تھی۔

آپا کی باتوں نے امی کو وقتی طور پر بھلا دیا مگر زہنہ  
سے وہ کچھ زیادہ خوش نہ تھیں۔ حسب سے چھوٹی  
ہونے کے باعث وہ ان کے رعب میں تھی اور لاڈلی  
بھی۔ ان معنوں میں کہ تقریباً ہر فرمائش ہی پوری کی  
جاتی تھی کہ معاشی حالات اچھے تھے اور اب جب  
موضوع آیا تھا تو۔

چیلنج پر آمد کے کی ٹھنڈی سیڑھی پر بیٹھے جھنوں پر  
سر رکھے وہ آبدیدہ تھی۔ پانچ سالوں سے وہ ایک ہی  
شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ ملتی چلی آ رہی تھی اور  
وہ شخص تھا ہی اس قابل کہ وہ اس کی ہمراہی پر فخر کرتی۔  
خوشنما آنکھوں والا وہ شخص۔ کئی دنوں میں اس کے  
دل میں گھر گر گیا تھا۔ اس نے آپا کو موند میں تو کتے  
ہی آنسو پیلوں کی باز توڑ کر اس کے رخسار چھو کونے  
لگے۔ ہند چیلوں تھے کئی سانس منظر جاگ اٹھے تھے۔



فقط پانچ سال پہلے ہی کی بات تھی۔ جب گھر پھر میں  
لاؤ لے بیٹھے عاصم کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔  
تب زہنہ، ایف اے کے ایگنیز سے فارغ ہوئی  
تھی اور ساتھ ہی گھر میں بلکہ اس کے ہوش میں یہ پہلا  
بڑا فنکشن ہو رہا تھا۔ فارہ کی شادی ایف اے کے  
فوراً بعد ہی ہو گئی تھی مگر جو پیش اور پھر پوسٹ  
گر جو پیش کی فخری اس نے شادی کے بعد لی تھی۔

"زادگی ماں کو میں مہینہ پہلے ہی گھر لے آؤں گا۔"  
عاصم زادگی کا بھی لاڈلا رہا تھا۔ تو عازم بیگم یعنی اس کی  
ماں ہی ان کے ساتھ نہ رہ پائی تھی اور ان کے سب

سے بڑے نور نظر شہیر احمد کو لے کر پڑے بھلا تھے سے  
الگ گھر میں آئی تھیں۔ کئی بات تو یہ تھی کہ بچوں میں  
سے کسی کا بھی دادی کے گھر کے بغیر گزارا نہیں تھا۔ مگر  
جب باپ ہی اس بات کو سمجھ نہیں پارا تھا تو وہ ماں کا  
شکوہ کیا کرتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو غلط فہمیوں میں  
بھیال کر شوہر کے دل کو انہوں نے اچھی طرح بھرا یا تو  
پھر نیچے علیحدہ گھر کی صورت میں نکلا، جہاں عازم بیگم  
نے ٹھکنے سے اپنی حکومت چلائی۔ شوہر کو انہوں  
نے ابھی تک اپنی آنکھوں دیکھی اور کالوں سنی تک  
رکھا ہوا تھا۔ جو وہ نہیں اسی کے مطابق وہ فیصلہ جاری  
کرتے تھے۔

اور اب عاصم کی بیٹی۔ انہیں قطع نہ بھائی۔  
"کوئی ضرورت نہیں ہے گھر کو لوگوں سے بھرنے  
کی۔" انہوں نے تیز لہجے میں کہا تو عاصم نے احتجاج  
کیا۔

"نوائے لوگ امی؟ میں وادی اماں کی بات کر رہا  
ہوں ہمارے باپ کی ماں۔" اس کے برامان جانے پر وہ  
سنبھلیں۔

"تیسرے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی نئے سرے  
سے گھر کی سنبھنگ اور بینٹ وغیرہ ہونے ہیں۔ اس گھر  
میں رہ کر ہی ہم نے یہ سب گرائے، لائے میں انہیں  
کہاں سنبھالنے پھر میں گے اچھا لگے گا ایک سے  
دوسرے، دوسرے سے تیسرے کمرے میں شفٹ  
کرتے۔" انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی۔ اب پتا  
نہیں یہ منطبق عاصم کے دل کو لگی یا نہیں، مگر حال وہ  
خاموش ہو گیا تھا۔

اس کے بعد گھر کی سنبھنگ بھی تبدیل ہو گئی اور  
بینٹ ڈسپیر کا کام بھی پھر ایسا لگا۔ مگر وادی اماں شادی سے  
شخص ایک ہفتہ پہلے ہی آئیں۔ وہ بھی عاصم کے پر زور  
اصرار پر۔



"زہنہ! میں صدقے جاؤں اور تو آمیری چلی۔  
باشاہ اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ اوھر! نظر! اور دل



شہ۔ وہ ہندی والے روز تیار ہو سکے آتی ہی تھی جب واہی اہل نے اس کی بلا میں لیتے ہوئے پتا نہیں کیا کچھ بڑھ کے اس پر بھونکا۔ کنڈن کے دیدہ زیب کام سے سچا سچ گلہ گالنگا اس کے ہار روپ کو چار چاند لگا رہا تھا۔

”کیا کر رہی ہیں واہی اہل! میں نے تو میک آپ بھی نہیں کیا۔“ وہ شرمناک کھسائی۔

انہوں نے اس کی ادا پرواری جاتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

”میری شہزادی کو ان مصنوعی چیزوں کی ضرورت ہی کہاں ہے؟“

وہ بڑی بے تابی سے اپنے پوتے کا انتظار کر رہی تھیں۔

”خدا کے لیے واہی اہل! مجھے امتحان میں مت ڈالیں۔ باقی جان سے بہت ڈرتا ہوں میں۔“ وہ اسے عالم کی شادی میں شرکت کی پروا نہ دیتے دے رہی تھیں جس کے جواب میں وہ فون پر ڈرتے ہی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

”بھٹا ہم لوگ بندوں سے ڈرتے ہیں انتہا خدا سے ڈرنے لگیں تو جتنے جائیں۔“ وہ ناراض ہوئیں تو وہ خوب ہی ہنسا۔

”بس۔ میں کچھ نہیں جانتی تو شادی پہ آرہا ہے۔“ انہوں نے اب کے رعب و جمابا۔ یہ شادی سے دو روز پہلے کی بات تھی۔

”ہی آ رہی ہیں“ بلکہ سبھی گھر والے ایسے میں میری کیا ضرورت ہے جھلا۔“ وہ کئی کترا رہا تھا۔ عافیہ بیگم کی طنزہ گھنگو اور لیے دیے انداز سے سبھی گھبراتے تھے اور بے جس طرح وہ الگ ہوتی تھیں وہ بات کسی کو نہ بتواتی تھی۔ واہی اہل کے دکھ کو سب اپنا دکھ مانتے تھے۔

”نو بھلا۔ ہر کسی کی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ تم نہ آنے تو تمہاری ہی اپنی جگہ۔“ وہ غلا ہو گئیں۔

”مسئلہ کیا ہے واہی اہل! سیدھی بات بتائیں۔

آپ جانتی ہیں۔ نیا نیا ڈاکٹر بنا ہوں، چھٹی ملنا بہت مشکل ہے۔“ لکھ بھر خاموش رہنے کے بعد وہ مہمانانہ انداز میں بولا تو کچھ سوچنے کے بعد وہ برادری سے بولیں۔

”ایک لڑکی دکھائی ہے تجھے۔“

کیوں۔ کیا مرض ہے اسے؟“ وہ چونکا۔

”اللہ نہ کرے۔“ وہ وہیل کر بولیں اور اسے ڈانٹ دیا۔

”سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“

”اب ڈاکٹر ہوں تو ڈاکٹری نظری سے سوچوں گا۔“

وہ ہنسا۔ اس کی ماؤں جب حمل ہونے والی تھی۔

”اچھا بیٹی کی سے میری بات سنو۔ زینبہ کو دکھانا ہے۔“ وہ بالآخر بولی ہی نکلیں۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ حیران ہو کر وہ پھر سے کہہ گیا۔

پھر ان کے ذمے فوراً ہی بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ خیر تو ہے۔ سالوں ہمارے ساتھ رہ کے کئی بے پرواہی بھائی ہے۔“

”لو۔ اسے دیکھیں بھائی کو تین سال ہونے کو آئے تب لوں جماعت میں تھی اور اب بارہ پڑھ چکی ہے۔“ وہ نفاخر سے بولیں تو اسے ہنسی آئی۔

”واہ۔ پرانا تیرا دل ہے۔“

”خدا کا نام ہے ہو؟“

”رہے نہیں واہی اہل! ابھی کوئی بھی لڑکی جو تین سال پہلے لوں میں ہوئی اب تک وہ بھی بارہ پڑھ چکی ہوئی۔ آپ کی پوتی نے کیا کمال کر لیا جھلا۔“

”بے وقوف! شکل و صورت، رنگ و ہنک کی بات کر رہی ہوں۔“ انہوں نے بلا لطف اسے لٹا ڈاچھر شد آگئیں لیکن میں بولیں۔

”اتنی نازک اتنی پیاری، طبیعت اس سے زیادہ بیٹھی۔“

”ہوگی۔ بلکہ وہ پہلے بھی ایسی ہی تھی۔“ اسے اسے کو تین سال پہلے والے چودہ سالہ زینبہ یاد آئی۔ جو اسے بہن بھائیوں میں سب سے پیاری اور اتنی ہی ڈرپوک سی

تھی۔

”ایک تو میں تمہاری اس بحث کرنے والی عادت سے بہت تنگ ہوں۔ آئیے وہ تمہارے باپ کو ایک کی دس نہ جائیں تو کتنا۔“ انہیں غصہ آ گیا۔ اپنے تئیں وہ اسے اتنی اہم معلومات دے رہی تھیں اور وہ کسی کھاتے میں نہیں لے رہا تھا۔

”اچھا سو رہی۔ کان پکڑتا ہوں۔ بلکہ کہتی ہیں تو مرغا بن کے حاضر ہو دل گا آپ کے پوتے کی شادی میں۔“

وہ شرارت سے بولا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ سیدھے سیدھے انسانوں کی طرح آؤ۔ اتھے سے کپڑے پہن کے زینبہ کو بھی تمہیں دکھانا ہے نا! ان کے کہنے پر وہ ٹھٹھا کا۔

”یہ کون سی نئی رسم نکلی ہے واہی اہل؟“

”واہی کا اذیتا تو مان رکھو گے نا۔ وہ تمہارے ساتھ بہت اچھی لگے گی۔“ وہ مصحوبیت سے بولیں اسے خاموش رہ گیا۔

”مجھ کو میں بتا رہے تھے۔ رکھ چکی۔ مگر میں بیٹی کے ہم سے بندھا جائے گا تو اسی زمانے میں کھار اس کی شکل دیکھ لیا کروں گی۔“ بیٹے کے ذمہ پر وہ ابدیدہ ہونے لگیں۔

”وہ بہت چھوٹی ہے مجھ سے واہی اہل!“ اسے درحقیقت کوئی ہنسا نہ ہو جاتا تھا۔

”نہ میرے بچے اتنی اچھی اٹھان ہے اس کی رنگ۔“ وہ قد کاٹھ سب تیرے ساتھ بیٹنے والا ہے جو! وہ جو تھان چکی تھیں ان کے لمبے سے جھلک رہا تھا۔ اسے گہری سانس بھر کے رو گیا۔

وہ یہ بھی جانتا تھا کہ واہی اہل کے لب و لہجے کا یہ مان کہ اسے ان کی بات ہر صورت مانے گا اس کے ماں باپ کا دیا ہوا تھا۔ یقیناً! امی اور ابو اس بات پر راضی تھے تب ہی واہی اہل اسے اور ان آفر کر رہی تھیں۔

اور خود تو وہ ان کا فرماں بردار تھا ہی۔

”لو کے۔ اب جبکہ آپ مجھے پھانسنے کا ارادہ کر رہی ہیں تو میں بے چارہ کیا کر سکتا ہوں سوائے سر نہر

کرنے کے۔“

”ہیں۔ سہنڈر۔ کابے کا سٹنڈر؟“ واہی اہل اتنی حیرانی سے پوچھنے لگیں کہ اسے کواپنے توتھے پر قابو پانا محال ہو گیا۔



واہی اہل سے عافیہ بیگم کی کم ہی بنتی تھی وجہ یہ کہ بڑے بزرگوں کی طرح واہی اہل کو بھی اپنے بچوں کو اچھے اور مفید مشورے اور نصیحتیں دینے کا شوق تھا مگر کیا کیا جاتا ہے جب بچوں کو اس کی قدر ہی نہ ہو۔ مگر بظاہر وہ واہی اہل کے سامنے بالکل چپ رہتیں البتہ شیر احمد تک۔ اپنے الفاظ میں ہر بات پہنچانے سے ہرگز نہ چونکتی تھیں۔

”یہ میں ہی ہوں تو برداشت کر رہی ہوں شیر!“

**یادوق قارئین کے لیے سالانہ بک سیل**

- مشہور و معروف مصنفین کی علمی، ادبی، اسلامی کتب
- مشہور شعراء کے شعری مجموعے
- مقبول مصنفین کے ناول
- اور ناولٹ کے مجموعے
- بچوں کے لیے کہانیاں
- 50 فیصد تک خصوصی رعایت
- خریداری کے لیے تشریف لائیں

**مکتبہ عمران ڈائجسٹ**  
**37 - اردو بازار کراچی۔**



شہزادہ غنیمت کے عالم میں وہ یہ بات جتنا ہرگز نہ بھولتی تھیں۔

”وہ کون سا پیشہ کے لیے ہمارے ساتھ رہنے آئی ہیں شادی کے دن گزار کر لو پس چلی جائیں گی۔“ شہزادہ احمد بھی یوں بولے جیسے کسی اور کی ماں کے متعلق گفتگو ہو رہی ہو۔

مگر عاصم، زینبہ اور قاسم کی تو موبیں ہو گئی تھیں۔ وہ تینوں ہی واوی گے لاڈلے تھے اور ان کی آمد پر خوش تھے۔ ناشتے میں واوی کے ہاتھ سے نئے کھنکھنے کے پیرائے اور چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی حلویہ۔ اس عمر میں بھی وہ بچوں کے لیے کمر کس کے پکان میں کھس جاتی تھیں۔ عاقبہ بیگم اپنے بچن میں انہیں باکر خونیا کے کھونٹ بھر کے رہ جاتی تھیں۔ بچوں کو الیست گھر کتی۔

”کیا ابی! اتنے عرصے کے بعد تو اتنی مزے کی چیزیں کھا رہے ہیں۔“ عاصم منہ پھٹ تھا۔

”وہ ہر شے الٹ پلٹ کر دیتی ہیں۔ میرے بچن کا انہیں کیا پتا، کوئی ای چیز کہاں رہتی ہے۔“ وہ اپنے غصے پر قابو پا کر بولیں تو وہ ہاتھ ہلا کر کہنے لگا۔

”قونٹ ہو رہی۔ چیزیں ہیں تو بچن میں ہی تا!“

”مگر مجھے یہ بے ترمیمی بالکل پسند نہیں۔“ وہ تنک کر بولیں۔

”تو آپ ان کے ساتھ کھڑی ہو کر میں تا! وہلپ کے لیے بچن میں۔“ مشورہ منٹ تھا۔ وہ جل کر رہ گئیں۔

”ساتھ ہی کھڑے ہونا ہو تا تو الگ نہ ہوتی۔“

”یہ تو آپ کی گھنٹی سے تا!“ وہ چل پڑا تھا۔

”کیا؟“ وہ اس کی زبان درازی پر حیران ہوئیں۔ وہ باہر جا رہا تھا۔

”یہ تو آپ کی گھنٹی سے تا!“ وہ چل پڑا تھا۔

”کہاں رہ گیا یہ سچو کا بچہ!“ واوی امان کو ایک ہی فکر کھانے جا رہی تھی۔ اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی بیٹے چکے تھے۔ اسپتال میں ایمر جنسی کیس سے نمٹنے کی وجہ سے وہ لیٹ تھا۔

”تین سالوں میں ان کی شادی تو ہوئی تھیں پھر بچہ کون سا واوی امان؟“ زینبہ نے انہیں چھیڑا تھا۔

”شادی بھی ہو جائے کی جلد ہی۔“ وہ مسکرائیں اور بے حد پار سے اسے دیکھا۔

”چلو بھئی۔ اب لکھنا ہے سب گاڑیوں میں بیٹھو۔“ عاصم ٹیبلٹ اندر آتے ہوئے بولا۔

ایمر ایڈووکیٹ شلوار میں وہ بہت پینڈ سم لگ رہا تھا۔ اور کٹے میں ڈالا وہ اپنے نماضافہ، زینبہ کو اس قدر خوب صورت لگا تھا کہ اس نے صاف کہا تھا۔

”یہ بعد میں میں لوں گی اور اس کے ساتھ میوٹ میچنگ کر کے سلواؤں کی۔“

”مہو سکتا ہے عیب کا بھی یہ ہی خیال ہو۔“ وہ شرارت سے جانتا تھا۔ وہ واوی امان کو عاصم کی گاڑی میں بٹھانے لگی تو عاقبہ بیگم نے اسے اشارہ کیا۔

”ادھر کدھر۔ ادھر کوئی اور گاڑی دیکھو۔ مجھے ابھی بیٹھنا ہے۔“

”جگہ ہے تا اندر۔ آپ بھی بیٹھ سکتی ہیں۔“ وہ دو دھیال والوں کے متعلق ماں کی تنک دہی اور بغض سے اچھی طرح واقف تھی۔ نرمی سے بولی تو وہ دانت پیس گراسے گھورنے لگیں۔

”میں جلدی سے واہش روم سے ہو آؤں۔“ وہ کھڑکی میں جھک کر واوی امان کو ہاتھی لہنگا سنبھالتی تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔ تقریباً سبھی گاڑیوں میں بیٹھ چکے تھے اور جو کھڑے تھے وہ بھی جگہ دیکھ کر بیٹھنے کی تیاری میں تھے۔ نوکریوں کو ہدایات دے کر عاقبہ بیگم ہائل ناخواستہ واوی امان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

بجیوری بھی اگر عاصم اس گاڑی میں نہ ہوتا تو وہ بھی اس گاڑی میں نہ بیٹھتیں۔

انہوں نے عاصم سے کہا۔ اس کا دوست ڈرا ڈرا ٹونگ سیٹ پر تھا۔

”سب بیٹھ گئے گاڑیوں میں؟“ واوی امان نے پوچھی مرتبہ پوچھا تھا۔

”بیٹھ گئے ہیں امان ہی! آپ آرام سے بیٹھیں۔“ عاقبہ بیگم اندر سے چڑھتی تھیں۔ بد زبانی نہ کرنے کا تہیہ کرنے کے باوجود بے زارمی ان کے منجے سے ظاہر تھی۔

”بھئی اور کاسٹریس، ہجرت بیٹھے آجھا پوچھا کھنڈ تو گئے گا نا۔ کوئی بیٹھے رہ گیا تو مشکل ہوگی۔“ وہ صبح کہہ رہی تھیں۔ عاصم نے ان کی تسلی کے لیے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کے دیکھا۔ سب گاڑیاں چلنے کو تیار تھیں۔

”اے لہ۔ وہ اپنی زینہ کہاں ہے ہاتھ روم گئی تھی۔“ واوی امان کو پھرتے خیال آیا۔

”اوفوہ! امان ہی! انہی تک ہاتھ روم میں تھوڑی بیٹھی ہوگی۔ آگے بیٹھ گئی ہوگی کسی گاڑی میں چلو اب عاصم سمہارے سر کا ہار بار فون آ رہے اور پورے

”جے“ ضبط کر کے کہتے بھی انہیں غصہ ہی لگتا تھا۔

”ایک بار دیکھ لوں۔“ عاصم تہذیب تھا۔

”اب کہاں ساری گاڑیاں چیک کر دے گاڑیوں کے ساتھ بیٹھ گئی ہوگی، بچی تو نہیں ہے کہ بیٹھے رہ جائے چلو تم۔“ وہ چڑھ گئیں۔

”خدا معلوم۔“ واوی امان متفکر تھیں اور ان کی باتوں پر عاقبہ بیگم کا بارہا ہی اور ہاتھ۔ وہ تین گاڑیاں ان سے آگے نکل گئی تھیں۔

”تو کرب و خوف تو نہیں تا جنہوں نے دروازے بند کیے ہیں۔ خود س کو بٹھایا ہے میں نے۔“ عاصم نے ماں کا موڈ خراب ہوتے دیکھ کر اپنے دوست کو گاڑی چلانے کا اشارہ کیا تھا۔

”سب تو ٹھیک ہیں میں فقط زینہ کی بات کر رہی تھی۔“ واوی امان کے دل کو جانے کیسا وسوسہ لگا تھا۔ ہولے سے بولیں تو عاقبہ بیگم گردن جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔ بیٹھے ہوئے لب اور ماتھے کی تیوری

ان کے موڈ کی مہاری کہانی بیان کر رہی تھی۔ وہ کھری سانس لے کے رہ گئیں۔

اور واوی امان کے وسوسے بے جا نہیں تھے۔ زینبہ واقع گھر میں ہی گئی۔ وہ واہش روم میں داخل ہوئی اور دھڑکوں کو ٹالے لگانے کا کام شروع ہو گیا۔ واہش روم سے فارغ ہو کر وہ جلدی سے ڈرائیو تک کی طرف آئی اور اپنا کچر اٹھا کر بال سیٹنے لگی۔

”بھاڑ میں جائے فیشن، وہاں جا کے کھول لوں گی۔“ کھلے یالوں سے اسے شدید گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ آئینے میں خود پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کے وہ بڑی اور دروازے تک آئی تا ب ہاتھ رکھا اسے گھمایا۔ گھر وہ اپنی جگہ سے نہلا، ایک بار دوبار مہا بار۔ اس کا دل خوف سے دھڑک اٹھا۔ اسے خیال آیا سبھی گاڑیوں میں بیٹھنے والے تھے کہیں۔

”ای۔ ای۔ قاسم۔ عاصم بھائی! وحشت کے عالم میں اس نے دوکول ہاتھوں سے دروازہ کھینٹ ڈالا۔ ہاتھوں کی تکی چوڑیاں ٹوٹ کر اسے زخمی کر گئیں، اسے اندازہ نہیں تھا ابھی تو وہ ایک انجانے سے خوف کی زو میں آئی ہوئی تھی۔ وہ اوپر ہی کمرے میں بھی بھٹک رہی تھی وہی لگا کے بیٹھی صغراں تک آواز پچی۔

”اے نوری! اوپر دروازہ نہ بج رہا ہے کوئی۔“ اس نے اپنی بیٹی سے کہا تو وہ بیڑھیوں تک ٹٹی۔

”ہائے میں مر جاؤں! پتا نہیں کون رہ گیا ہے اندر۔“ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا پھر دھڑ دھڑ مگرتی بیڑھیوں چڑھ گئی۔

”کون ہے اندر؟“ نوری نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے باگلوں کی طرح دروازہ کھٹکھٹا بنا رہ گیا۔

”مر جاؤ تم نوری! اور واہش کھولو۔“ وہ اندر سے چلائی۔

”ہاں۔ زینہ بی بی!“ نوری نے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ پھر بے چارگی سے بولی۔

”دروازہ کیسے کھولوں جی چاہییاں تو بی بی جی ساتھ



لے گئی ہیں۔

”مجھے نہیں پتا تو زور دو روزہ۔“ وہ غصے سے چیخی،  
توہری نے لے کر صوبوں بھائی جاکے ماں کو ساری بات بتائی تو  
وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئی۔

”تو کرو گیل لی لی کی اپنی دھی کو گھر بھول گئی۔“  
”ادونف۔ افسوس کا وقت نہیں ہے زینبی لی لی کو  
کمرے سے نکالنے کی سوچو۔“ نوری جھنجھائی، مگر  
بھڑاں کے وجود کی طرح اس کا داغ بھی موٹا تھا، کھس  
تیشی رہی تو نوری پھیرے اوپر بھاگی، جب ہر زینبہ دروازہ  
باز کر داری تھی۔

”وہ لوگ تو کب کے نکل گئے زینبی لی لی اب میں  
بھلا کیسے دروازہ کھولوں؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

اندروہ رو رہی تھی۔  
اپنا گھر اپنا کمرہ تھا، مگر آج پتا چلا تھا قید ہونے کا  
احساس خوف دلاتا ہے، جگہ کوئی بھی ہو اس سے فرق  
نہیں پڑتا۔

”اب ایسا کرو یا کوئی میں جاؤ، میں لان کی طرف  
سے سیڑھی لگاتی ہوں یا کوئی کے ساتھ۔“ اچانک  
نوری کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، پرخوش سی بولی تو  
زینبہ کا بھی کچھ دل بھرنا۔

”جلدی سے آؤ، میں جاتی ہوں یا کتنی میں۔“ نوری  
قلا نہیں بھرتی نیچے بھاگی۔

”ماں دروازے کی کھٹکی بچ رہی ہے، وہ تو دیکھ لے  
کون آیا ہے، میں سیڑھی لگا کے لی لی کو نیچے اتار  
لوں۔“ نوری نے غصے سے ماں سے کہا جو پر شوق انداز  
میں لی لی وی میں لگی ہوئی تھی۔ یہ وقت اٹھی اور منہ بتاتی  
پیرانی گٹ کی طرف قصہ کہا۔ نوری اسٹور سے فل  
ساتر لکڑی کی سیڑھی تقریباً گھسیٹ کر لائی اور لان  
میں یا کتنی کے ساتھ لگا رہی۔

زینبہ یا کتنی ہی میں کھڑی تھی۔ لہنگا پہنے ہوئے  
سیڑھی اترتا گیا جان جو کھوں کا کام ہے، یہ اسے ابھی پتا  
چل رہا تھا۔

”واہ۔ تم نے یہاں آ کے کیا مرسس میں کام  
شروع کر دیا ہے۔“ وہ ابھی آخری سیڑھی پر ہی تھی کہ

غیر متوقع سہانہ آواز سنا، اس لیے ابھری۔ اس نے لان  
میں چھلا نک لگائی اور ناگوار سی سے منہ کے نہ کہا۔  
”اسجد بھائی۔“ اس نے فی الحال روئے کا ارادہ ملتوی  
کر دیا۔

”میں گھر میں ہی رہ گئی ہوں۔“ منہ بسور گرا سے  
اطلاں دی۔

”وہ تو میں بھی رہ گیا ہوں، مگر اللہ کا شکر ہے قید و بند  
کی صعوبت برداشت نہیں کرنی پڑی۔“ وہ مسکرایا۔  
”اب کیا ہو گا فون کر کے بلوائوں کسی کو، وہ تو آ رہے  
راستے تک پہنچ گئے ہوں گے۔“ اسے روتا آنے لگا۔

”میں آتے ہوئے زینبی کر رہا تھا، مگر میٹ ورک  
بڑی تھا۔ ابھی شاید کل مل جائے۔“ اسجد نے اچھی  
نگاہ اس کی سوچی ہوئی آنکھوں اور سرخ ہوتی ناک پہ  
ڈالی اور عاصم کا نمبر ملانے لگا۔ ”مرے۔ یا راکھان  
ہو تم، ہم تو نکل لے لے، حد ہوتی ہے سستی کی۔“ عاصم  
لانن ملنے ہی خفگی سے بولا۔

”تیزی کی بھی ایک حد ہی ہونی چاہیے۔ اب ایسی  
جی کیا جلدی دے لے، جیسا کہ میں تو چاہتی ہی ہوں  
تھے۔“ وہ ہنسا تھا، زینبہ کو اور رونا اپنا خفگی سے اسجد کو  
دیکھا۔ اس کے لیے یہ مذاق کی بات تھی۔

”کون۔ کس کا کہہ رہے ہو؟“ عاصم چونکا۔  
”زینبہ شیراز۔“ وہ مزے سے بولا۔

”دھت تیرے کی، داوی الما ٹھیک کہہ رہی  
تھیں۔ وہ داتش روم گئی تھی اور میرے خیال میں سب  
تالے لگا کے نکل آئے۔“ وہ پریشان ہونے لگا۔  
”ڈورٹ وری، وہ میرے ساتھ آجائے گی، پیچھے  
کہاں تک ہو تم لوگ؟“ اسجد نے اسے تسلی دیتے  
ہوئے معلوم کیا پھر بولا۔

”گو کہ پھر رابطہ کر دوں گا، ابھی لکھتے ہیں ہم۔“ وہ  
موبائل جیب میں ڈالتا زینبہ کی طرف متوجہ ہوا۔  
نوری جس کی زخمی کلائیوں دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔  
”یہ؟“ اسجد نے پھنویں اچکا تھی۔

”زور سے دروازہ بجایا تو چوڑیاں لوٹ گئیں۔“ وہ  
شرمندہ سی ہونے لگی۔ اسجد بھائی سے تین سالوں کے

بعد پہلی ملاقات، وہ بھی اس انداز میں اس نے کبھی  
سوچا نہیں تھا۔ اسجد نے وہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے اس کے  
زخموں کو صاف کرنے کے بعد فی الحال ان پر سنی  
پلاسٹک لگا دی۔

”ابھی نام نہیں ہے۔“  
اسجد نے اسے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ منہ بسور آتی چل  
پڑی۔

”یہ آپ می گاڑی ہے؟“ سیاہ کلڈس کی چمک  
ڈنگ اسے پسند آئی تھی۔ فرنٹ سیٹ سمجھاتے ہی  
پر شوق انداز میں پوچھا تو وہ اگلی سٹیشن میں چابی گھماتے  
ہوئے بولا۔

”میں کیا شکل سے چور لگتا ہوں؟“  
”یہ میں نے کب کہا؟“  
”تو پھر اطمینان رکھو، یہ میری ہی گاڑی ہے۔“ سفر  
شروع ہو گیا تھا۔

ان کا بھی اور گاڑی کا بھی۔  
”تو سب میں نے تمہارا کمرے کے خیال  
سے پوچھ لیا تھا۔ یہ تو میں کہا کہ کسی کی پوری کر کے  
لائے ہیں۔“ وہ اترا سنی سے بولی۔  
”بہنسی تم کون سا کھتے اترا جاتی ہو۔“ وہ آرام سے  
بولا۔

اور یہ گفتگو تو اک پمانہ تھی، اسے جانے کا۔  
تین سال پہلے کی زینبہ بچی تھی اور یہ زینبہ ایک  
کھلتا ہوا گلاب جو ہر سوا اپنی دھیمی مہک بھیر رہا تھا۔  
تین سال پہلے ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی اسجد  
نے شاید ہی بھی زینبہ سے بات کی ہو۔ ایک وجہ تو یہ  
کہ وہ منڈیکل کانسٹیبل تھا، اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا  
کہ گید رنگ میں شریک ہو سکتا، اور مزہ کہ وقت ملتا  
بھی تو زینبہ اپنے ہم عمر گرنز کے ساتھ گیمز میں  
مصروف ہوتی۔ بھلا اسے منڈیکل فاسٹل ایئر کے  
اسٹوڈنٹ سے کیا پوچھی ہو سکتی تھی اس عمر میں؟؟ اور  
اسیجہ۔ جو رزلٹ آنے کے بعد ہاؤس جا ب شروع  
کرنے والا تھا، وہ بھلا نوں کلاس کی وہ بھی، مگر کیا سوچتا۔  
(پر یہ داویاں بھی تا بڑی مزے کی شے ہوتی ہیں۔)

اپنی سوچ پر اسے خود ہی ہنسی آئی تھی۔  
”جانتی ہوں، اب اسجد بھائی ہیں، چچا جان کے  
بڑے بیٹے، ڈاکٹر بن گئے ہیں، بلکہ اب ہاؤس جا ب  
کے ہیٹ کرنے کے بعد اپنا ٹھیک اسٹارٹ کرنے  
والے ہیں۔“ وہ خفگی بھرے لہجے میں بولی تھی۔  
”ارے واہ۔ تم کوئی جا سو رہے ہو۔ بڑی انفارمیشن  
د رکھی ہے میرے متعلق۔“ وہ ہنسا۔

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟؟“ اس نے نکھیسی  
نظروں سے اسجد کو دیکھا۔  
”میں تو یا نکل سیریس ہوں۔ تمہیں اپنا مذاق اڑانا  
محموس ہو رہا ہے؟“ وہ مصحوبیت سے پوچھنے لگا۔

”یہ سب مجھے داوی الما نے بتایا ہے، مجھے کوئی  
شوق نہیں آپ کی جا سوئی کرتے کا۔“ وہ پر مچی تھی۔  
”ٹھیک کا ڈاؤرنہ تمہاری معلومات سن کر تو مجھے  
شہ ہوا، اس اندر زور لداؤں نے تو تمہیں میرے پیچھے  
تھیں لگا دیا۔“ وہ باز نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایسا ہی تھا۔ خوش دل، خوش مزاج، ہر ہمار طبیعت  
کا مالک، اتنا تو زینبہ بھی جانتی تھی۔ حالانکہ عافیہ بیگم  
ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ان میں دوسرے کزنز سے  
خاص کھلنے ملنے نہیں دیتی تھیں۔ اب بھی وہ اسی صوف  
میں تھا۔

مگر وہ اپنی طبیعت کا کیا کرتی، تمہاری بے حد جذباتی  
اور ہر وقت رونے کو تیار۔  
”مجھے کیا ضرورت ہے آپ کے پیچھے لگنے کی؟“ وہ  
قدرے خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی، پھر یاد آنے پہ  
اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”آپ جیسا تا، آپ کو کوئی لیڈی ڈاکٹر پسند نہیں  
آئی۔ داوی الما تو ہر وقت آپ کی شادی کی باتیں کرتی  
رہتی ہیں۔“ اسجد نے گہری سانس بھرتے ہوئے نونیز  
گلاب کے سے روپ والی لڑکی کو دیکھا اور پھر مسکرا  
دیا۔

”اس کی نوبت ہی نہیں آئی، داوی الما میرے لیے  
ایک لڑکی پسند کر چکی ہیں۔“  
”اچھا۔؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”آپ داوی الما کی پسند



سے شادی کریں گے؟

”جی ہاں ہے۔“ وہ اسی طرح گھماتے ہوئے منقلم بنا۔

”چسپ چاہے کسی اندھی کئی سے بیاد ورس۔“ وہ مذاق اڑانے لگی۔

”اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”چلتیں۔ میں بات کروں گی وادی اماں سے۔ آپ تو بڑا کٹر ہیں۔ لڑکیاں تو ہنس کے آپ سے شادی کرتے کو تیار ہو جائیں گی۔“ وہ فرار خدی سے بولی۔ وہ ہنس پڑا۔

”انگریجھے تو ایک ہی لڑکی سے شادی کرنی سے نہایت وہ ہنس کے کرے یا روکے۔“ سراسی طرح چلی پٹلنی باتوں میں تمام ہوا۔ ”العبت میرج ہال۔“ پتلیج کرا سجد نے اپنے چھوٹے بھائی احمد سے کنفرم کیا۔ سب اوپر والے ہال میں تھے۔



ای نے اسے دیکھتے ہی وہ لہے لہے کہ خدا کی بنا۔ ”میرا کیا قصور ہے۔ خوب ہی روزانے الگ کر کے چلی آئیں۔ میں تو بتانے گئی تھی۔“ اس کے آنسو پٹے کو تیار تھے۔

اور اس پر کو بھی شاید اسی بات کی توقع تھی۔ وادی اماں کو چھوڑتی تھی۔ ان کی طرف آیا۔

”مائی جان کیا کرتی ہیں۔ یہ بے جا رہی تو پہلے ہی پریشان ہے۔ بالکنی کے ساتھ سیڑھی لگا کے انار ہے ملازم نے۔ آپ کو تو شکر کرنا چاہئے خدا کا کہ نوکر گھر میں موجود تھے۔ اگر سبھی ساتھ آجاتے تو کیا ہوتا۔“ وہ انہیں شانوں سے تھامے شانمت سے موقع کی سنگینی سے آگاہ کرنا انہیں گھنڈا کر گیا۔

اس پر کاہ کالی خاطر کرتی تھیں۔ (ڈاکٹر جو بن رہا تھا۔) ”چلو اب موڈ ٹھیک کرو۔ دلہے کی بہن ہو۔“ عافیہ بیگم نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا۔

”اور یہ ہاں تو کھو لو۔“ سیلا تو نہیں کرج۔“ ”ای۔“ وہ وہ ہانسی ہونے لگی۔

”مواں بطور خاص تیار ہی اسے زہر لگتی تھی۔ بندہ ہر وقت کا تنس پھر تارے کہ لڑکوں کی ماں میں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی۔ وہ اپنے کچھو کی طرف ہاتھ بڑھائی تنم کی گئی۔ اس حد نے اسے اشارے سے منع کر دیا تھا۔

”ابھی گری لگ رہی ہے مجھے۔“ اسے ہمانہ سوچہ گیا تھا۔ عافیہ بیگم کو اور غصہ آیا۔

”تو جو بال کھول کے پھر رہی ہے۔ انہوں نے اے ہی لگاوار گھے ہیں کیا۔“ زینہ کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھر آئے۔ اور سے اسجد کی موجودگی۔

”او فو۔“ مائی جان کیا کرتی ہیں۔ اسے لکشن انجوائے کرنے دیں۔ اپنے دھنک سے۔ ”وہ فوراً ہی اس کی مدد کو آیا تو ہائل تا خواستہ انہوں نے اسے چھٹی دی۔

ان کی بہن شادی سے عاصم کی شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں اور ان کا لائق اور قابل بیٹا انجینئر ساتھ تھا۔ ان کا بیٹا ارادہ تھا کہ وہ اس بار خود ان سے زینہ اور عافیہ کے رشتے کی بات کریں گی۔ مگر یہ زینہ کی

بھی۔ مجال کسی ذرا برابر بھی منتقل پکڑی ہو۔

”تھینک یو اسجد بھائی۔“ زینہ نے نزل سربد کی رسم سے فارغ ہونے کے بعد موقع پائی لیا تھا۔

”جھاڑی۔ وہ کس لیے؟“ اسجد نے اس پر تشش سی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھی سے روکھا۔

”آپ نے امی کی ڈانٹ سے بچایا اور کیا۔“ وہ فکرت تھی۔

”تمہیں اکثر ڈانٹ پراتی ہوگی؟“

”اور تمہیں تو کیا سب سے زیادہ زینہ یہ مت کرو۔“ زینہ ایسے کرو زینہ وہاں مت جاؤ۔ اس سے ملو اس سے نہ ملو۔“ وہ طویل مٹی پھر خوب ہی کہنے لگی۔

”آپ کی شادی کے بعد شاید میں گھر میں ایک ہی لڑکی رہی ہوں اس لیے۔“

”پھر تو تمہیں مائی جان کی ڈانٹ سے بچانے کا کوئی مستقل حل نکالنا پڑے گا۔“ وہ سکرانے لگا۔

وادی اماں اپنی ٹیمیل پہ بیٹھی دور ہی سے دونوں کی بلائیں لے رہی تھی۔ بلکہ چچی جان کو بھی دکھایا کہ ان

وادی کی بوزی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔

”چھا۔ وہ کہے؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”وہ ایسے کہ ہم تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔“ وہ آرام سے بولا۔

”الف۔ وادی اماں کے ساتھ میرا کتنا ہی چاہتا ہے نا۔ میں پھر سے اس گھر میں واپس چلی جاؤں۔“ وہ کھل اٹھی۔

”لو۔ وادی اماں کہاں سے آئیں در میان یہ آفر تو میں کر رہا ہوں۔“ وہ آرام سے بولا تھا زینہ بے ساختہ بولی۔

”آپ کے ساتھ بھی چلے گا۔“

”گو کہ۔“ وہ مٹ اینڈ سی۔ ”وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ اور پھر وادی اماں کے ہانپے ان کے پاس چلا گیا۔

”اب بتاؤ، کیسی لگی زینہ؟“ وادی اماں پر جوش تھیں۔ چچی جان بھی پاس ہی بیٹھی تھیں۔

”لڑکی تو ٹھیک ہے۔ لیکن لڑکی کی اماں ذرا ٹھیک ہوئے وہی نہیں ہیں۔“ وہ ہلکے ہلکے لفظوں میں گویا اپنی مصامتھی بیان کرتے ہوئے ماں سے پوچھنے لگا۔

”شریم کرو۔ بڑی ہیں وہ اور پھر بیادہ کے تو زینہ کو اتا ہے۔“ چچی جان نے اسے گھر کتے ہوئے ساتھ ہی شاید خود کو بھی سکڑی دی۔

اور عافیہ بیگم جس پیکر میں تھیں وہ کسی کو بھی خبر نہ تھی۔

واپسی یہ زینہ چچی جان کی فیملی کے ساتھ ان کی گاڑی میں تھی۔ وادی اماں واپسی پر بھی عاصم ہی کی گاڑی میں براجمان رہیں۔ جس پر عافیہ بیگم بس ڈانٹ کچکاچکا کہ رہ گئیں۔ اب انہوں نے جو کیزے ولسن والوں کے انتظامات میں نکالنے تھے وہ آزادی سے نہیں نکال سکتی تھیں اور نہ عاصم کو ہی سنا تیں۔



اگلے روز پارات بھی بہت دھوم دھام سے ہجرت

کے ”العبت میرج ہال۔“ چچی۔ وہ لہا والوں کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ عافیہ بیگم نے مسلسل اپنی آبا رائفہ کو ساتھ رکھا ہوا تھا۔ انہیں وہ وہی پردہ کو کول دے رہی تھیں جو ہونے والی سحر سن کو دینا چاہیے۔

”بیگم عاصم کی سسرال والوں کو بھی توجہ دو دلسن؟“ وادی اماں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ اندر سے جل اٹھیں۔ پھر ان کے قریب ہو کر تافراخ سے بولیں۔

”بہنی والوں کو کیا توجہ دینی یہ کیا کمر سے لانی بیٹی کو بیادہ کے لے جا رہے ہیں اور وادی بات اپنی تو عبادہ سے رشتہ طے کر رہی ہوں میں زینہ کا۔“ وادی اماں کی رنگت بدلتے لگی۔

”زینہ کا مجھے تو تم نے نہیں بتایا؟“ چچی جان نے ان کے ہاتھ پر اپنا نسلی امیز محبت بھرا ہوا ڈالا۔

”ابھی بتا تو رہی ہوں۔ خط میں تو نہیں لکھ سکتی تھی نا! اللہ نے چاہا تو آپا مٹنی کر کے ہی جائیں گی۔ عبادہ کو اگلے مہینے چھٹی مل جائے گی۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں کتنی جان چھڑاتی وہاں سے چلی گئیں۔ مگر وادی اماں کے دل کو روک لگا گئیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں اماں! ہم نے کون سا رشتہ ڈال دیا تھا۔ ابھی تو محض سوچ رہی تھی۔“

چچی جان کو بھی افسوس ہوا۔ زینہ انہیں بھی بہت عزیز تھی۔ مگر ساس کو صدمے کی گرفت سے آزاد کرانا بھی بہت ضروری تھا۔ موٹلے کھٹکے لہجے میں بولیں۔

”خدا اس کے نصیب اچھے کرنے میری توجہ ہے بہترین جگہ پہ اس کی شادی ہو۔ مگر عبادہ تیں صرف اس لیے کہتی ہوں جی بہت نیک اور سادہ طبیعت کی ہے۔ ماں والی تیزی و تندہی تو اس میں آئی ہی نہیں۔“ وادی اماں طول و افردہ تھیں۔

عافیہ بیگم کی بہن بھی ان ہی کار تو تھیں، اسٹینس کانسٹس اور ”میں“ میں جٹا۔ چائیں زینہ جیسی سیدھی سادی معصوم لڑکی کا کیا حال کرتیں۔ جسے ماں نے ہمیشہ شیرلی کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پالا تھا اور وہ

ہم وقت گھبرائی ہو کھلائی ہوئی رہتی تھی۔



”بھی اسجد سے نکل کر مت کرنا“ بچے کا دل بڑا ہوگا۔“ انہوں نے چچی جان سے کہا تو انہوں نے فرماں برداری سے لایات میں سر ہلادیا۔

عاصم نہایت شان و شوکت سے عروہ کو بیاہ لایا۔ زینبہ اور فاریہ نے پانی کزنز کے ساتھ پیکے گھر پہنچ کر دلہن کو خوب صورت سارلیپیشن دیا۔

”مبارک ہو عاقبہ! آج تم بھی بیوی کی ساس بن گئیں۔ خدا تم دونوں کو اتفاق و سلوک دے اور اس گھر کو خوشیاں نصیب کرے۔“ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے وادی اماں نے عافیہ بیگم کو دعاوی تو وہ بل کھا کر رہ گئیں۔

”یہ تو طہر کے تیر چلانے میں کوئی تانی نہیں رکھتیں۔“ ان کی آپا نے متہ زبانا تھا۔

زینبہ اب عروہ کے پاس محشی بیٹی تھیں۔ نئی بھانجھی والا شوق اور ایک خوب صورت دلہن کو اتنے پاس سے دیکھنا سے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چچی جان اور ان کے بچے گیٹ روم میں رہا شوق پڑ رہے تھے۔ ان کی واپسی و عروہ کے بعد ہونا محشی جبکہ وادی اماں زینبہ کے کمرے میں تھیں۔

”سن لیں تم نے اپنی وادی کی سنہری باتیں۔“ ان کے جانے ہی عافیہ بیگم تڑخ کر عاصم سے بولیں۔ جو خود اپنے کمرے میں جانے کو پر تول رہا تھا۔

”کیا۔ کیا کہا انہوں نے؟“ وہ لاعلم تھا۔

”اے لو ساری دنیا نے سنا، بس اسی سے نہیں سنا جو طلعتوں کا باعث بن رہا ہے۔“ وہ چمک کر بولیں۔

”ہیں۔؟“ وہ حیران ہو کر اپنی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”اور کیا۔ مبارک دے رہی تھیں کہ ساس بن گئی ہو۔“ کڑوے لہجے میں بتایا تو وہ ہنس دیا۔

”تو کیا غلط کہہ رہی تھیں۔“

”تم نہیں سمجھتے ان کی چالاکی کو، ان کے اندر کیا ہے وہ میں جانتی ہوں۔ طہر دے رہی تھیں کہ اب تو تم بھی ساس بن گئی ہو، اب دیکھا ڈرا کیا ہوتا ہے۔“ انہوں نے اپنا اخذ کرہ مطلب بیان کیا تو عاصم دنگ رہ گیا۔

گیلا۔

”کیا کرتی ہیں ای، وہ تو دعائیں دے رہی تھیں۔“

”بچے ہو تم انہیں۔ مجھ سے پوچھو جو ان کی ساری چالوں کو جگت کے آئی ہوں۔ وہ کیوں دعائیں دے رہی تھیں یہاں کون سا ہم بندوقیں کے کھڑے ہیں، ہو سکے لیے جو وہ اتفاق سلوک کی دعا کر رہی تھیں۔“ وہ جل رہی تھیں سنگ رہی تھیں۔

عاصم ہاں کی اس تنگ نظری اور خود سے اخذ کیے تجزیات کو سن کر دل ہی دل میں استغفار پڑھ کے رہ گیا۔ پھر انہیں ہلانے لگا۔

”بزرگوں کی دعاؤں سے گھر میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ اب آپ بھی تو ہمارے لیے دعائیں کرتی ہیں نا۔“

”ان کی طرح دکھاوے نہیں کرتی۔ دل میں ہی مانگ لیتی ہوں خیر و برکت۔“ وہ تنگ کر بولیں۔

”اچھا چلیں تھک ہے۔ بہت تاہم ہو رہا ہے رست کریں۔“ آپ بھی تھک گئی ہوں گی۔“ کالانی پر مجرہ محشی لہڑکی پر ایک نگاہ ڈال کر اس نے بات سمجھی تو انہوں نے بے نیے کو گہری نگاہ سے دیکھا۔ حالانکہ وہ کئی بار سے

ان کی بے سرو پائے جارہا تھا مگر اب اسے اپنے کمرے میں جانے کی جلدی ہوئی تو انہیں بہت غصہ ہوا۔

”ہاں اپنی وادی کے خلاف تم کیوں کچھ سننے لگے، ماں ہی غلط ہے تمہاری۔“

”یہ کب کہا میں نے؟ چلیں اگر ان کی کوئی بات آپ کو ٹھیک نہیں لگی تو اب غصہ تھوک دیں۔“

”وہ چار روز میں وہ چلی ہی جائیں گی اور پھر یہ کوئی وقت ہے اس طرح کی باتوں کا۔“

عاصم نے اسے کمرے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ چلبلا کر بولیں۔

”ہاں۔ اب تم لوگ ماں کو پڑھاؤ گے، ابھی سے وقت ختم ہو گیا ہے تمہارے پاس میری باتوں کو سننے کا۔“

”اؤ فوہ آئی و کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ وہ ہلانے لگا۔

”ٹیک دینا دیکھی ہے میں نے جیٹا! میں تو تمہارے

بیویوں کی دھمک سے تمہارا موہ پیمان لیتی ہوں۔“

عاصم نے گہری سانس بکھری۔

دھیان کے سارے دھاگے اس عروس جان کی سوچ سے لٹھے ہوئے تھے جو اکیلی کمرے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ایسے میں عافیہ بیگم کی یہ بے وجہ نکلا اسے سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

”اچھا۔ میں آپ کے پاس بیٹھ جاتا ہوں جو باتیں کرنی ہیں کریں۔“ وہ سکون سے کتا سوئے گی طرف بڑھا تو وہ مسکرائیں۔ کھل کے مہمانیت سے۔

”نہ بیٹا! تمہاری نئی فوہلی دلہن کمرے میں تمہارا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں تو صرف تمہیں ماں کے حقوق کی اولت بتا رہی تھی۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے شب بخیر۔“

وہ اطمینان سے کتھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ عاصم کی پر مسوچ نگاہ نے ان کا چہرہ کیا تھا پھر وہ سر جھٹکتا خوش کن سوچیں لے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

www.pkdig.com

دلہن کی تقریب کے بعد عافیہ بیگم سے صبر نہیں ہو سکا، ان کی شدید خواہش تھی کہ وہ رات بے عمامہ اور زینبہ کے رشتے کی بات کریں اور گھر میں موجود رشتہ داروں (خصوصاً مسرالی) کی موجودگی میں ہی بات طے ہو جائے اور مشہور بھی ہو جائے کہ عافیہ بیگم کا داماد بچہ سن رہا ہے۔ انہیں ایک سو بیس فیصد یقین تھا کہ رات بے عمامہ آیا بھی یہ نبی چاہتی ہیں، چھی تو وہ زینبہ کے صدر سے وادی پانی رہتی تھیں۔

”کاش ایہ میری بیٹی ہوتی۔“ کتھی ہی یار وہ کہہ چکی تھیں۔ حالانکہ اپنی وہ بڑی بیٹیاں وہ بیاہ چکی تھیں۔ بس حال اسی یقین کے تحت انہوں نے وادی اماں کے سامنے ہی اس رشتے کی بات چھیڑ دی۔

”اب بہنوں میں کیا پردہ جھگ۔ آپ نے پوچھا یا میں نے بات ایک ہی ہے۔ چھی ایک سے ایک رشتہ پڑا ہے میری زینبی کے لیے مگر میں نے کہا پہلا حق آیا کا

بے عمامہ سے بڑھ کے مجھے کوئی نہیں۔“ ان کا بات کرنے کا طریقہ بھی انہوں کا تھا۔ اور سے مانگ رکھنے والا۔ وادی اماں نے اسے اسے اپنی بہو کو دیکھا۔

”ہاں، لو بھلا، ایک سے ایک رشتہ بڑا ہے، تو کہیں بات طے کر دو نا خیر سے ایسا کر چھی ہے، دو سال تک شادی کرونا، پچھتہ پچھتہ دار بھی ہو جائے گی۔“ یہ آپا صاحبہ کا صاف جواب تھا۔

عافیہ بیگم کو جوہر کا لگا ہے یقین سے بہن کو دیکھا۔

”بھئی، ہم تو بچوں کی پرند کو تڑخ دینے والے لوگ ہیں۔ عمامہ کی بات تو بھائی صاحبہ کی نرا سے طے ہو گئی۔ امریکن فیشن سٹلی ہے اس کی۔ فون یہ تو بات کر چکی ہوں میں، سوچا تھا باقاعدہ منٹنی ہوگی تو خبر کروں گی، خیر، زینبی کے لیے کون کون سا رشتہ ہے؟ اتنی پیاری بچی سے ماشاء اللہ۔“

اگر عافیہ بیگم کو ”خیر، زینبی کا“ لالچ تھا تو ان کی بہن بھی ”امریکن فیشن سٹلی، ہولڈر ہو“ کے خواب دیکھ رہی تھیں۔

اگر تو ایسے ہیں یہ مت توڑ انکار ہوا ہوتا تو وہ بدولت کر رہی جاتیں مگر اماں جان کے سامنے عافیہ کی تو شرمندگی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔

اور آپا کی زینبہ سے محبت کا پھول تو کھل ہی چکا تھا۔ اب بھی اتنے پیٹھے لہجے میں پوچھ رہی تھیں، گویا تمہیں اڑا رہی ہوں کہ کون سا ”ایک سے ایک اچھا“ رشتہ موجود ہے۔

ان کی پیشانی چمک اٹھی۔

”رشتے تو کبھی بہت اچھے ہیں بیٹا! مگر عافیہ کا دل تھا کہ ایک بار اپنی آپا سے پوچھ لوں تاکہ کل کو وہ شکایت نہ کریں ورنہ عمامہ اسی لیے رکی ہوئی ہے یہاں کہ عافیہ ہاں کرے تو وہ زینبہ کو اسجد کے نام کی انگوٹھی پہنانا کے ہی جائے۔“ وادی اماں کی بات تھی یا دھماکہ، عافیہ بیگم سن رہ گئیں۔

”اچھا۔ عمامہ۔ آپ کی چھوٹی بہو؟ کیا کرتا ہے۔ سرکاری نوکری ہے یا پرائیویٹ؟“ وہ سرسری انداز میں پوچھ رہی تھیں۔



"ماشاء اللہ سے ڈاکٹر ہے اسجد۔ اب تو اپنا کھینک بھی بنالیا سے اس نے۔ کچھ عرصے تک مزید پڑھائی کے لیے امریکہ بھی جائے گا پھر آگے ان شاء اللہ اسپتال بنائے گا۔ مریضوں کے مفت علاج کے لیے۔" وہ سادگی سے بتا رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔" رافضہ بیگم کو شرم آئی تھی۔ ادھر عالیہ بیگم کے دل کو بھی سکون ملا۔ دادی اماں نے موقع پر عزت رکھی تھی۔

لوریہ اسجد۔ اتنا قابل ڈاکٹر بن چکا ہے اپنا کھینک بھی بنالیا۔

"چیلو۔ فی الحال تو وقت گزرے بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ وہاں ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود انہوں نے نہ تو عایدہ کو اور نہ ان کے بچوں کو کبھی کسی کتنی میں شمار کیا تھا۔ انہیں یہ تو پتا تھا کہ اسجد ڈاکٹر ہی پڑھ رہا ہے۔ مگر اس کی کامیابیوں کا شمار نہیں رکھا تھا۔

علاوہ جس بات کو وہی پر وہ سمجھ رہی تھیں اسی کو کھول کر دادی اماں اور عایدہ نے زینبہ کے سر کی چادر بنادیا۔ شہیرا اسجد سے بات کر کے انہوں نے عالیہ کی طرف دیکھا۔

وہ کبھی سرسالی رشتہ داروں کو مت نہ لگائیں۔ مگر ڈاکٹر داماد نے بہت کچھ بھلائے۔ راج پور گریڈ اور پھر زینبہ بھی کس کھاتے میں تھی، شخص ایف اے۔ "دادی کی لڑائی دادی ہی کے پاس جائے گی تو کسکی ہی رہے گی۔" انہوں نے مویچا تھا اور پھر تو کچھ ان کی اپنی سن نے کیا تھا۔

"بڑی دھوم دھام سے شادی ہوگی میری بیٹی کی۔" انہوں نے بتایا تھا۔ ابھی تو فی الحال سب کے سامنے بات ہی طے ہوئی تھی۔ آپا سے ان کا دل اچھا ہو گیا۔ زینبہ تک خیر پڑی تو وہ دم بخود ہو گئی۔

"تو یہ وجہ تھی اس سوال کے پیچھے؟" اسے خیال آیا۔

مگر کچھ خاص قبلیتنگز نہیں ہوتیں۔ وہ اس سے پورے دس سال بڑا تھا۔ اور اس نے سب سے کبھی بھی اسجد کے بارے میں اس سچ پر نہیں سوچا تھا۔

چچی جان نے اسی وقت اسجد کو فون کر دیا کہ آگے روزہ دوبارہ آجائے۔ ویسے اٹینڈ کرتے ہی وہ واپسی کے لیے نکل گیا تھا۔

\*\*\*

افرا تقری میں بھی چچی جان اور ان کی بیٹی نمرونے جو شاپنگ کی وہ ڈائننگ رنگ سمیت ہی بہت شان دار تھی۔ منگنی کے سوٹ کے علاوہ بھی زینبہ کے پانچ خوب صورت جوڑے تھے۔ معہ بیچنگ جیوری زینبہ ابھی ہوئی تھی۔

"اتنی جلدی؟"

"تو اور کیا بیٹی ہو سکے بیارہ چاؤ کی۔ فی الحال صرف منگنی ہو رہی ہے۔ چار پانچ سال پڑھ لو پھر شادی ہوگی۔ تب کون سا ڈاکٹر بننا ہوگا تمہارے لیے۔" وہ آپا سے جلی بیٹھی تھیں۔ شکر اللہ کر کے کوئی قابل داماد ملا تھا۔ تو اس پہ بھی یہ اتنا کافی کرنے لگی تھی سو انہوں نے بھارت دیا۔

"میں نے کون سا شرط رکھی ہوئی ہے ڈاکٹر کی۔ وہ ختم ہو گئی۔ شام کو اس کی منگنی کی شان دار سی تقریب منعقد کی گئی۔

اسجد بہترین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا اونچا لہبا وجہ سے سر ابا سب میں نمایاں تھا۔ نمرونے اسے لاڈلے بھائی کی عمر نہیں کر کے دس بی زینبہ کا دل بھی دھڑکا ہی دیا۔ اس پر اسجد کی حکم کھلا فرمائش۔

"انگھو بھی میں خود پہناؤں گا۔ دادی اماں کی مجلسیتر تھوڑی ہے۔" وہ بہت کاغذ زنت تھا۔

"مجھے شرم آئے گی۔" زینبہ کو ایک دم سے اس پچویشن کو قبولے میں وقت پیش آ رہی تھی۔ ابھی کل تک تو کسی نے زینبہ کی شادی کا نام تک نہ لیا تھا اور آج وہ یوں ہی سنو رہی کسی کے نام ہونے جا رہی تھی۔ "اے کونو ایک بار انگو بھی پین لو پھر یہ شرم ورم اتنی بند ہو جائے گی۔" اسجد نے نمونے کے ہاتھ پیغام بھیجا دیا تھا۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب وہ نو سو پیر اس کے ساتھ

آکر بیٹھا۔ زینبہ کا دم حلق میں اٹکنے لگا۔

اسجد تو بھائی تھا۔ اسجد بھائی اور اب یہ نیا روپ وہ کچھ عجیب سی کیفیت کا شکار ہو رہی تھی۔

"اجازت سے دادی اماں؟" اسجد نے انگو بھی تھاٹے ہوئے شرارت سے پوچھا تو عالیہ بیگم مسکرائیں۔

"اجازت ہے تو یہاں بیٹھے ہو بیٹھائی!"

"تھینک یو آئی جان!"

اس نے زینبہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اور پھر اسے ایک دم سے لٹھیرا پر اٹھوس بھی کر لیا۔

"چیلو بیٹی۔ تم تو تونے بیٹھ گئے ہو۔ بہت بھاری ہاتھ ہے۔" عاصم نے شرارت سے کہا تو وہ ہنس۔

"یہ لو شروع ہو گئی ان کی ڈاکٹری۔ بھائی صاحب یہ آپ کی سسرال ہے اسپتال میں۔" اسجد سے چھوٹے اصرار سے اس کی توجہ دلائی۔ وہ انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔

ادھر زینبہ کا دل بہت سچ سچ کر دھڑک رہا تھا۔ ایسے سرد پڑتے ہاتھ پر اس کے مجھبوط ہاتھ کی کرسی اسے اچھی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

"چلو جی۔ کیا یاد کریں گی زینبہ بی بی! آج تک تو ڈاکٹر نہیں لیتے ہی آئے ہیں۔" اس نے شوخی سے کہتے ہوئے انگو بھی زینبہ کی خروچی انگلی میں ڈال دی۔

دی۔ زینبہ نے فوراً اسے ہاتھ لٹھیرا بھی ہٹنے لگے۔ "اسے بھی صرف میرے کی انگو بھی کا انتظار تھا۔" قاسم نے کہا۔ تو زینبہ کو کسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ خیر قاسم سے تو وہ اچھی طرح ٹھٹ بیٹھی۔

فونو سیشن 'مردی میٹنگ۔ ایک لمبا سیشن، مگر سب بہت انجوائے کر رہے تھے۔

اس طرف سے انگو بھی پٹانے کی باری پر شہیرا اسجد کو آگے کیا گیا۔ "آپ کہاں رحمت کریں گے تایا جان۔" میں لڑتی ہی سے پٹن لول گا۔

اسجد نے بڑی ہمدردی دکھائی تو انہوں نے ہنستے ہوئے ڈی زینبہ کو پکڑا دی۔

"میں نہیں۔" وہ منہ مائل۔

"خیر دار۔" اسجد کی طرف متوجہ تھا۔ وہ تھملائی۔ "یہ اچھا رعب ہے انہی سے اپنی من

مائیاں۔"

"چیلو بیٹی۔ زینبی انگو بھی پٹانو۔" عروہ نے کہا تو وہ انگو بھی ہاتھ میں لیے منتظر ہو گئی کہ ابھی وہ ہاتھ آگے کرے گا۔

"کیا سوچ رہے ہو یا ر! بلکہ اب تو سوچنے کا نام نکل چکا ہے۔"

عاصم نے اسے یاد دلانی کرائی تھی۔ اسجد نے مسکراتے ہوئے ہاتھ آگے کیا تو زینبہ نے بغیر دیکھے انگو بھی پٹانے کی کوشش کی۔ مگر انگو بھی آگے جانے سے انکار ہی۔

"یہ پھول ہے۔" وہ ہار گئی۔

"یہ پھول نہیں انگو تھا بہت بڑا ہے۔" نمونہ کی بر جستگی پر توجہ دیا تو وہ یہ دیکھ کر شرمندہ ہوئی کہ وہ بنا دیکھے انگو ٹھے میں رنگ ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب اس نے بہت احتیاط سے اسجد کی انگلی میں انگو بھی ڈال دی۔

"تھینک یو۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ نگاہ زینبہ پر تھی۔ زینبہ نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہاں اپنائیت کے سارے رنگ تھے۔ زینبہ کو لگا وہ اسجد کے ساتھ خوش رہے گی۔

\*\*\*

آج ان کی واپسی تھی۔

"زینبہ فارغ ہو؟" وہ بیٹھ شیت چھا کر فارغ ہی ہوئی تھی جب نمرونے دروازہ کھول کر اندر چھا کیا۔

"ہاں ہاں آجاؤ۔" وہ ٹکے سیٹ کرتے ہوئے نوٹوکاری سے پولی۔ نمونہ اس کی ہم عمر تھی اور اس سے دوستی بھی بہت تھی۔

"السلام علیکم۔"

غیر متوقع آواز۔ وہ اچھل کر پٹی۔



یہاں نمبر کی جگہ اس کے بھائی صاحب موجود تھے۔  
 اِدھر اُدھر نگاہ گھماتے کرتے کا جائزہ لیتے۔  
 "وہ نہ ہو۔" زینب بھگالی۔  
 "پہلی لڑکی دیکھی ہے جو منگیتری بجائے منہ کا  
 انتظار کر رہی تھی۔" وہ لب مکمل طور پر اس کی طرف  
 متوجہ تھا۔

اسے ٹوٹ کے شرم آئی۔  
 "اب بتاؤ خوش ہو سکتی ہے؟" وہ اس کے سامنے  
 کھڑا تھا۔  
 "جی نہیں۔" زینب کو اپنی ناگہان کی لرزش اچھی  
 طرح محسوس ہو رہی تھی۔  
 "یعنی کہ ناخوش ہو؟"  
 "مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ سادگی سے  
 بولی۔

"اچھا تو اب پوچھ لیتے ہیں۔" وہ اس کی صاف گوئی  
 سے متحفظ ہوتے ہوئے بولا۔  
 "زینب! اِسجد سے شادی کرو گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔  
 "نہیں۔" بے اختیار ہی اس نے کہا تھا۔ پھر اس  
 کے تاثرات دیکھتے ہوئے رضاحتاً بولی۔  
 "ابھی منگنی ہی ٹھیک ہے، مجھے براھمن ہے۔"  
 "نہیں نکس گا۔" اِدرا دیا تھا تم نے مجھے۔" وہ ہنسا  
 تھا۔

اور لب۔  
 اب وہ نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں تھا۔ نہ اس ملک  
 میں اور نہ ہی زینب کی زندگی میں۔  
 وہ اپنے کمرے میں بتر اندھیرا کیے اِسجد کی یاد میں رو  
 رہی تھی۔ اس کے دل میں بیٹے والا اس کی دھڑکنوں کو  
 نئے انداز دکھانے والا پسلا شخص۔ جسے اس سے جدا  
 کر دیا گیا تھا۔

کُل تمہاری سانس اور منہ آ رہی ہیں۔ ولیمہ کا رنگ  
 خریدتا ہے۔ تمہیں مانتے لے جانے کے لیے کہہ رہی  
 تھیں۔ "امی نے اسے بتایا تو وہ ساکت رہ گئی۔

(تو رنجی جدائی اِجھڑا)  
 وہ کھانا چھوڑ کے اُٹھ گئی تھی۔

"زینب! عافیہ بیگم نے پیچھے سے پکارا، مگر وہ  
 جو اس میں ہی کہاں تھی۔ اوپر ٹیرس کی سیڑھیوں پہ آ  
 بیٹھی۔

وہ بے بس ہو گئی تھی حالات کے سامنے۔  
 "یونی چھوڑو، نہ تھا تو میرے دل میں نے جذبے  
 کیوں چگائے تھے اِسجد! میں تو کورا کھنڈ تھی۔ اس  
 اپنی بچیوں کی داستان لگہ کے اب بے بس ہے تماشاً  
 دیکھ رہے ہو۔ آ کیوں نہیں جاتے مجھے سب سے چھیننے  
 کے لیے۔" اسے روتا آ رہا تھا۔  
 اسے سال بھر پہلے کے دن یاد آئے، جب  
 گرینویشن کے بعد جب چچی جان کے بعد اصرار پر وہ  
 ان کے ہاں وہ ہسٹل کے لیے گئی تھی۔

وہ سترے دن۔  
 اس کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی۔

ادھر عاصم کی شادی کے بعد گھر میں عروہ کی شکل  
 میں گویا ایک رونق آ گئی۔ ہنسی مسکراتی ہر لب چمکتی  
 عروہ۔ جہاں عاصم کی جینت بیوی بنی وہیں زینب اور قاسم  
 کی دوست نما بھائی۔۔۔

ہنہ بھری میں وہ جیسے اس گھر کی ایسا گلین بن گئی  
 جو گویا سالوں سے نہیں رہتی آئی ہو۔  
 اصل مسئلہ تب شروع ہوا جب عروہ نے پکچن میں  
 پاؤں رکھا۔

"امی! آج میں پاؤں؟"  
 ہانڈی میں بنا زلال کرتی عافیہ بیگم سے اس نے بڑی  
 چابست سے کہا تو پہلے تو وہ حیران ہو میں پھر صفا چٹ  
 انداز میں بولیں۔

"تمہیں یہ میں خود کر لوں گی۔"  
 "کوئی بات نہیں۔ میں بھی تو قادر غنی ہوں۔"  
 وہی ہوؤں والا گھر واری کا نیا نیا شوق۔ گھروالوں کو  
 اچھا نکلا کروا پانے کا معصوم ساشوق۔

"تمہارے وقت گزارنے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔  
 جا کے ٹی وی دیکھ لو۔" وہ بڑی مصروفیت لانا ہر کرتے  
 ہوئے کہہ رہی تھیں۔

اور عروہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کیوں پر اپنی اچانک واری  
 چاہتی ہیں۔ وہ تو وادی المل کو پکچن میں برداشت نہ کرنی  
 تھیں، کیا یہ کل کی کچھو کچھ کریں۔ اسے تو وہ اول روز سے  
 اس کی حد میں رکھنا چاہتی تھیں۔  
 اور پھر روزانہ ہی ہوتے لگا۔

سب کے لیے ناشتا تک وہ خود بناتی تھیں۔  
 سامانے عاصم اور عروہ کے اسے اپنا اور عاصم کا ناشتا  
 بنانے کی اجازت تھی۔ اس کے علاوہ وہ جانے برتن  
 دھوئے یا ماس کے سر پہ کھڑی ہو کے سفالی کرانے اور  
 کپڑے دھوانے وغیرہ بیگم کا روبرو نہ تھا۔  
 انہوں نے ابھی تک عروہ کو ہانڈی نہ پکانے کی وجہ  
 نہیں بتائی تھی۔

"وہ ہم دونوں کو زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کا موقع  
 دینا چاہتی ہیں جان!" عاصم کو اپنی اچھی بتائی تو وہ اسے  
 بانہوں کے کھینچے میں لیتے ہوئے بولا۔  
 "بڑی اندر کی کوڑی لائے ہیں حساب!" اسے ہنسی  
 آئی۔

"شکر کرو اتنی اچھی سانس لی ہیں۔ ورنہ بسو کو  
 ستانے کا سب سے اچھا طریقہ ہمارے معاشرے میں  
 یہ تھا ہے کہ اسے جو لے کے آگے مستقل کھڑا  
 کر دو۔" عاصم نے بات کو سرسری انداز میں لیا۔  
 قریب تنگ پکچن عافیہ بیگم ہی نے سنبھالا ہوا تھا، سو  
 عروہ کا یہ مسئلہ گھر میں سے تو شاید ہی کسی کو سمجھ میں  
 آتا۔

"مگر میں بھی کچھ پکانا چاہتی ہوں۔ گھروالوں کے  
 لیے۔ آپ کے لیے پھیرا اتنا دل چاہتا ہے کہ آپ  
 میرے ہاتھ کا بنا کھانا کھائیں۔ جی میں بہت اچھا کھانا  
 پکاتی ہوں۔" وہ ابھی ابھی سی کہہ رہی تھی۔ عاصم  
 مسکرایا۔  
 "پلو ٹھیک ہے، میں امی سے کہہ دوں گا۔ کل سے  
 کھانا تم ہی بناؤ گی۔"

"امی! مادرائس تو نہیں ہوں گی؟" اسے حد شدہ لہجے  
 ہوا۔  
 "نہم آن رو باوہ پھلا کیوں تھا ہوں گی، بی بی ہو ہو اس  
 لیے تمہارے خمرے اٹھا رہی ہیں۔"

عاصم نے اسے سمجھایا تو وہ شانے جھٹک کے رہ  
 گئی۔  
 "پکچن کا اکتا خیال ہے اور شوہر کی کوئی پروا نہیں ہو  
 تمہاری ایک نظر کو ٹرس رہا ہے۔"  
 اس نے انداز بدلا تھا۔ کمرے میں عروہ کی قفل  
 کرنی ہی کو بیج آ گئی۔

انفس کے لیے نکتے سے پہلے عاصم پکچن میں آیا؟  
 جہاں عافیہ بیگم فرنگ میں موجود سبز یوں کا جائزہ لے رہی  
 تھیں۔

دیکھا بات ہے، کچھ چاہیے؟" انہوں نے اس کی  
 موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے پلٹ کر دیکھا اور  
 پوچھا۔  
 "خدا حافظ کہنے آیا تھا۔" وہ مسکرایا۔

"اچھا۔ دھیان سے جانا اللہ حافظ۔" انہوں نے  
 اسے اللہ کی امان میں سونپتے ہوئے اپنا مشغلہ جاری  
 رکھا۔  
 "آج کیا کھنے والا ہے؟" وہ جیسے بہ سبیل تذکرہ  
 پوچھنے لگا۔

"گوشت کا ایک پلٹ رکھا ہے، امی کے لیے سبزی  
 دیکھ رہی تھی۔ کیا خیال ہے گو بھئی ڈال لوں یا سبز؟"  
 انہوں نے ہاتھ ہوتے اس کی رائے چاہی تو وہ چند  
 لمحے سوچنے کے بعد بولا۔

"مجھے تو دونوں ہی سبزیوں میں ملن پسند ہے۔ آپ  
 جو کئی چاہے پکائیں۔"  
 "اچھا۔ چلو ٹھیک ہے۔" وہ ہنس دیا۔ "مغز پلاؤ  
 بنالوں کی اور چپاٹیوں کے ساتھ گو بھئی گوشت، ساتھ  
 میں رائتہ سلاؤ تو ہو مائی ہے۔"  
 "اتنا لبا چوڑا مینو ہے، تھک جائیں گی عروہ۔"



سے پہلپ لے لیجئے گا۔ بلکہ آج ہانڈی اسی سے بنوائیں۔ آپ پاپا کو بنا دیجیے گا۔" وہ خوش دلی سے انہیں مشورہ دے رہا تھا۔

"اتنا سب اچھا بھی نہیں، پہلے بھی میں کرتی ہی ہوں" زینبہ، رات بے اور سلاوا بنا رہی ہے۔ اب عربیہ سے کہوں گی وہ بنا دے گی۔"

وہ سنجیدہ ہو گئی تھیں، نوکری میں سبزی نکالنے کے پائیس تو وہ اچھی بھی جیسے کچھ کہنے کے ارادے سے کھڑا تھا۔ انہیں اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کیا مسئلہ سلجھانے آیا ہے۔

"چلو جاؤ اب دیر ہو رہی ہوگی۔" انہوں نے چھری تلاش کر کے نوکری میں رکھی۔

"ہی! میں چاہتا ہوں کہ عربیہ بھی بچن کے کاموں میں آپ کی پہلپ کرے ایسے ہی فارغ بیٹھی رہتی ہے۔"

لگ رہا تھا کہ وہ عربیہ کے مسئلے کا حل چاہتا ہے۔ "ہاں ہاں، کیوں نہیں، یہ تو اس سے پو پو سبزی بنا دے اور پھر آکر برتن دھو ڈالے۔ میں اتنی ورپ میں گوشت چڑھا لیتی ہوں۔"

انہوں نے سبزی کی نوکری اسے تھائی اور دواداری سے پو پو تو عاصم مزید بحث کیے بغیر عربیہ کو نوکری تھما کے آس کے لیے نکل گیا۔

اور پھر یہ مسئلہ دن بے دن زور پکڑنے لگا۔ عافیہ بیگم کسی طور عربیہ کو ہانڈی کی طرف آنے نہیں دیتی تھیں۔

"تم سبزی بناؤ، برتن دھو لو، سلاوا بناؤ، رات بے عربیہ ایسی بھی بچن کے کاموں کی شوقین نہیں تھی، مگر یوں خود کاٹنی کیے جانا سے اچھا نہیں لگتا تھا۔ جیسے وہ کسی کام کی نہ ہو۔"

"بھی کبھار عربیہ سے بھی پکویا کریں نا؟" عاصم نے کئی بار کہا تھا۔

"نہیں میرے ہاتھ کا پکا اچھا نہیں لگتا؟" انہوں نے خنکی سے پوچھا۔

"آپ سے اچھا تو کوئی بھی نہیں پکا سکتا۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟" وہ اٹا پوچھتیں تو وہ لاجواب ہونے لگتا۔

"دیکھو ہم سب لوگ ایک ذائقے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اب ایک دم سے نئے ذائقے کو اپنانا بہت مشکل ہے ہمارے لیے۔"

انہوں نے کہہ ہی دیا تھا۔ عاصم تو خاموش ہوا اپنی تھما اس نے عربیہ کو بھی جیسے تیلے کر کے سمجھا بھجوا دیا۔

"میرا رہی تو جی چاہ سکتا ہے بے وقت کوئی چیز پکا کے کھانے کو۔ اب ہر چیز اسی سے تو فرمائش کر کے نہیں پکوا سکتی ہیں۔"

"اب ایسی بھی پابندی نہیں ہے تم پر۔" عاصم نے اسے چھوٹ دی تھی۔ عربیہ نے اس کو بہت جانا۔

عافیہ بیگم کھانا کاکے فارغ ہو جاتیں تو وہ سوٹ ڈش بنانے لگتی تھیں۔ کبھی زردہ، کبھی حلوہ اور کبھی گاجر کی کھیر۔

اور چیزیں بھی ایسی جو سب ہی شوق سے کھاتے تھے۔ اسوائے عافیہ بیگم کے۔ وہ حلوے کی رنگت دیکھ کے ہی اسے رہ چھوٹ کر دیتیں۔

"حلوہ تو میں بناتی ہوں، سب اٹھائیں چائے رو جاستے ہیں۔ یہ دیکھو، نرا سفید میدہ لگ رہا ہے۔ بھوتا ہی نہیں سو جی کو۔"

اور اگر کبھی وہ سو جی کو زیادہ بھون لیتی تو۔

"تیز آگ پہ سو جی لال کر کے شیرہ ڈال لینے سے حلوہ تھوڑی دین جاتا ہے۔ پکایا تو گیا نہیں، جو کھائے پیٹ میں درد ڈالے۔" اور یہ سبھرے وہ بہ بانک دہل کرتی تھیں۔ سب ہی کو ان پر اعتراض ہوتا، مگر کوئی بھی بول کر اپنی عزت خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ یاتی سب کا شوق سے ہر چیز کھا لیتا عربیہ کو تقویت دینے ہوئے تھا۔

مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عافیہ بیگم کو اس سے کیا مسئلہ ہے۔

"دراصل امی نے شروع ہی سے ہمارے لیے ہر کام اپنے ہاتھ سے کیا ہے نا اس لیے۔"

زینبہ اور قاسم بھی شرمندہ ہوتے۔ ہر حال عربیہ کے دل میں عافیہ بیگم کی طرف سے گہرے پڑ چکی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ ہمہ شوہر وہ سب گھروں پر اپنا حکم چلانے کی عادی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے سامنے آنے سے گریز ہی کرتی تھی۔

"زینبہ! کبھی مسجد کا فون نہیں آیا تمہیں؟" وہ سنی دلوں سے اس سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔

"اچھا ہی ہے نا میں بھلا ان سے کیا بات کرتی۔" وہ فوراً بولی۔

"بے وقت ہو سکتا ہے وہ تمہاری کال کا انتظار کر رہا ہو۔" عربیہ نے اس کا دھیان کر لیا۔

"نہو۔ میں کون سا پہلے بھی ان کے رابطے میں تھی۔"

وہ ایسی ہی تھی، سادہ طبیعت اور قدورے لاپرواہ۔

"بہنو تم یہاں نہیں کون ہی دنیا میں رہ رہتی ہو تمہیں خود بات کروں گی اچھا ہے۔"

عربیہ نے مہم مہم کر لیا۔ اور پھر واقعی اس نے مسجد سے ایسی بات چیت کی اور اس کے بعد وہ عربیہ کو کبھی کبھار اس کے موبائل پہ کال کرنے لگا۔

"تھوڑا بہت تو جان لو ایک دو سرے کو۔" عربیہ نے کہا تھا۔

دن پرنگ کے اڑے تو مینے سالوں میں بدل گئے۔ عاصم اور عربیہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش نے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑائی۔ ایک ہی شکل کے دو بیٹے۔

اذان اور عشان۔

سب کے لاڈلے سب کے راج ہلا رہے۔ زینبہ، آگیز بھرتے فارغ تھی، جب اس کا دواوی کے ہاں جانے کا ارادہ بنا۔

"میں ان دنوں کے بغیر کیسے رہوں گی؟" وہ سوئے ہوئے اذان اور عشان کی طرف دیکھتے ہوئے بے چارگی

سے بولی تو عربیہ نے اسے گھر لکھا۔ "دادی جان نے اتنے پیار سے کہا ہے اور ویسے بھی اسجد نے اسپیشل برنیشن کے لیے لندن چلے جانا ہے۔ ایک اچھی سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔ یہاں آنے ہیں تو سب میں ٹھیک سے بات تک نہیں ہوتی۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ فون پر بھی وہ جیسی "تالیخ دارانہ" گفتگو کرتی تھی اسجد بے چارہ مرہہ ہاتھ پھیر کے رہ جاتا۔

قاسم خروا سے پنڈی چھوڑ کے آیا تھا۔ نمبر اور اترا سے دیکھ کے بے حد خوش ہوئے۔ وہ

واڈی جان سے اپٹ گئی اور بیچی جان کو تو وہ ویسے بھی بہت عزیز ہو گئی تھی۔ سب کا ڈھیروں پیار وصول کرنے کے بعد وہ نمبر کے ساتھ کمرے میں آئی۔

"تھوڑا آرام کرو پھر خوب پیس لگائیں گے اور تمہاری آد ویسے بھی بھائی کے لیے سر براؤز ہے۔" نمبر مزے سے بولی تھی۔

وہیں نے بھی نہیں بتایا انہیں۔ کسی البوہی احساس کے تحت اس کی رنگت لال پڑ گئی۔ وہ تو فون پر ہی اس کی آواز سن کے لگ بھو جالی تھی، اب یوں آتے سامنے جانے لگا حال ہوتا۔

"وہیں لیٹوں گی نہیں، بس فریٹش ہو کے آرہی ہوں۔ دادی جان کے پاس۔"

واٹس روم کی جانب بڑھتے ہوئے زینبہ نے کہا تو وہ مسکراتی ہوئی اس کے انتظار میں بیٹھ رہا تو وہ گئی۔ اس کمرے میں وہ نمبر کے ساتھ ہی رہنے والی تھی۔

قاسم تو شام کو واپسی کے لیے نکل گیا۔ اسجد سے اس کی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

"بس ان کی جانب ہی ایسی ہے۔"

"ہاں۔ بتایا تھا انہوں نے۔ پیٹے میں دن دن وہ سرکاری اسپتال میں مرینٹوں کا فری چیک آپ کرتے ہیں۔" زینبہ مسکرائی۔

"ہاں۔ اگر کینک یہ ہوتے تو قاسم جاتے ہوئے مل لیتا، مگر پھر سپینس اپنی نہ رہتا۔" نمبر کو صورت حال سوچ کے مزہ آ رہا تھا۔



رات ویر تک سب باتیں کرتے رہے۔ نمرو کے ساتھ اس نے پورا گھر دیکھا۔ یہاں اس کا بچپن گزارا تھا اور وہ سالوں بعد دوبارہ آئی تھی۔

"گتا ہے کوئی ایمر جنسی ہو گئی ہوگی۔ ورنہ تو جلدی ہی آجاتے ہیں۔" نمرو نے اسے بتایا تھا۔

"میرے خیال میں انہیں فون کر دینا چاہیے۔" اصرار سے مشورہ دیا۔

"تم اپنا خیال اپنے پاس ہی رکھو۔ سربراہ بھی کوئی شے ہو گا۔"

نمرو نے اس کا خیال سیکرہ کر دیا تھا۔

"چلو بچی، چلو بچو، چلو بچو اور گیت کھولتی رہنا۔ میں تو چلا سوئے۔" وہ یہ دیکھنا ہی کیا اور وہ گیا۔

"لو۔ آج بھی گیت میں ہی کھولوں گی بھلا۔" نمرو ہنسی۔

"تو؟" زینبہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تم؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"نائب جس نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔ "یہ اچانک میں ان سے نہیں مل سکتی۔"

"تو آرام سے مل لیتا اتنی جلدی کا ہے کی ہے؟" نمرو کو اس کی بات نے خوب ہی ہنسا یا تو وہ کھسیا گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ میں نے ہائے ہیلو کر لوں گی ان سے۔"

"بری بات۔ ان کی معصومی خوشی نہ چھینو جو تمہیں یوں اچانک سامنے پا کر انہیں ملنے والی سے ظالم لڑکی۔" اور واقعی وہ منہ سرپلیٹ کے خود تو سو گئی اور اسید کا انتظار کرنے کو نیند بھری آنکھیں لیے سفر کی کلکتن سے چور وہ شیشی رہی۔ نہیں بارہ بجے جا کے ڈور بتل سنائی دی تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھا مگر وہیں ایک جھگڑموں کو روک رہی تھی۔ نمرو کو جھجھوڑا۔

سب کیا سوچیں گے کہ آتے ہی۔

دوسری بار ڈور بتل کافی وقفے کے بعد ہی تو وہ جلدی سے بھاگی۔

گیت کھولنے تک اس کی دھڑکنیں بے ترتیب

ہو چکی تھیں۔ گیت کھولتے ہی وہ فی الفور پلٹ گئی، اس لیے وہ جان نہیں پایا تھا کہ گیت نمرو نے نہیں کھولا۔

"ہتی دوسرے اور میں نے کہا بھی تھا کہ اصرار سے کہنا گیت کھولتے لو۔" وہ اندر داخل ہو کر چھوٹا گیت بند کرتے ہوئے تادیبی انداز میں بولا۔ اب وہ اس کی بات نکالیا جواب دیتی۔

"نمرو! وہ لیسڈوگ بھرتا اس کے ہم قدم ہو تو وہ ست پڑنے لگی۔ تب اسجد کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

یہ سر ہوا اور پونی میں جکڑے کر تک آتے سیاہیل۔ وہ ایک دم سے اس کے سامنے آیا۔

زینبہ اس خیال میں نہیں تھی اس سے ٹکرائی گئی۔ مگر اصرار کون سا ایسا احساس تھا بے اختیار ہی اسجد نے اس کے شانوں سے تھا۔

"زینب! آئی ڈوٹ، بیوڈس۔ یہ تم ہو؟" وہ بے حد حیران تھا۔

زینبہ کا چہرہ تمہارا تھا۔ اسجد کے انداز میں محسوس کن بنے انتظار رہا۔

"میں وہ بھڑکائی تھی۔" وہ منہ مٹا کر بولی۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا۔ اگر کوئی ٹیک ہو جاتا مجھے تو..."

وہ اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ زینبہ کسمسا کر بیٹھے تھی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں نے ڈور ابھی لےٹ نہیں کیا۔"

"تفائل۔ سلام تک نہیں کیا تم نے۔"

"السلام علیکم۔" وہ خفیف سی ہو کر بولی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رو۔" لٹوکی نہیں؟

وہ اب شرارت پر اتر رہا تھا۔ زینبہ گاہل بے ترتیبی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بھاگنے کے سے انداز میں اندر کی طرف بڑھی تھی۔ پیچھے بھرنے والا اسجد کا قہقہہ اسے ٹھیک سنائی دیا تھا۔ اسے بھی ہنسی آئی۔

\* \* \*

"اتنے اچھے چوکیدار رکھنے شروع کر دیے ہیں تم

لوگوں نے کہ میں آئندہ بھی گیت کی ڈیلی کرٹ چاہی گھر بھول کے جانا پسند کروں گا۔"

نمرو صبح کا ناشتا بنا رہی تھی زینبہ کو لاکھ چچی جان نے صبح کیا مگر وہ بھی نمرو کا ہاتھ ملانے لگتی ہو گئی۔

سب سے پہلی چین میں انٹری اسجد کی تھی۔ وہ نمرو سے کہہ رہا تھا مگر نگاہ اندر سے چھٹتی زینبہ پر تھی۔

رائل بلو گھر میں اس کی رنگت دیکھ رہی تھی۔ اور کچھ اسجد کی آمد کا اعجاز کو برے اس کی گفتگو۔

"غز دھو رکھے بھائی جان! یہ بہت مستکے والا چوکیدار ہے۔ آپ انورڈ نہیں کر سکتے۔"

نمرو نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"ان پنا کچھ بناؤ۔ میں ہر قیمت پر تیار ہوں۔"

وہ چین کینٹ کی ماربل ٹاپ پر چڑھ بیٹھا۔

زینبہ نے نان اسٹک فرینک چین میں کوکینگ آئل ڈالا تو کچھ زیادہ ہی چلا گیا۔

"ہوا لٹری نقطہ نظر سے اتنا آئل صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔" اسجد کی نگاہ اس پر تھی۔

زینبہ نے بے بسی کے اسے دیکھا۔ وہ ہنسیوں اچھا کر مسکرا دیا۔

"آپ یہاں سے جائیں گے تو ہی ناشتا بنے گا۔"

وہ صاف گوتی سے بولی تو نمرو قہقہہ لگا بیٹھی۔

"ہاں نا۔ یہ عجیب عجیب باتیں کرتے رہیں گے تو مجھ سے بھی الٹا سیدھا کلام ہی ہو گا۔"

وہ کچھ اچھ کر بولی تھی۔

"میرے خیال میں تو آپ نے سن ہی لیا ہو گا۔"

نمرو نے شرارت سے بھائی کو دیکھا۔

"ہاں جی بہت اچھے سے۔" اس نے گہری سانس بھری۔

نمرو نے داوی جان کے ہاتھ کی ٹرے اٹھائی اور مسکراتے ہوئے چین سے نکل گئی۔

اتنی دیر میں زینبہ فرانسٹک چین میں سے زائد آئل نکال چکی تھی۔

"مستر کیسا گزرا تھا؟" اسجد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ٹھیک۔"

"میں ٹھیک؟ کوئی خوشی نہیں تھی آگے مجھ سے ملنے کی کوئی دل کی دھڑکن و ڈرمن اپنا رمل نہیں ہوئی؟"

وہ قدرے خشکی سے پوچھنے لگا تو زینبہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔

"دیا تو آپ ڈائجسٹ پڑھتے ہیں یا پھر فلمیں بہت دیکھتے ہیں۔"

اس نے اینٹوں کا آمیزہ فراٹنگ چین میں الٹ دیا اور اب بچھے سے اسے پھیلا رہی تھی۔

"مطلب ایسا کچھ نہیں ہوا؟" وہ جیسے بہت بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ بھی آئیٹ کھائیں گے یا آپ کو قرانی گرووں؟" زینبہ نے اپنی طرف سے بہت ہوشیاری سے بات کی۔

"نشائش آتے ہی مجھے قرانی کرو۔"

وہ کچھ اس طرح سے بدک کر لولا کہ چین میں داخل ہوئی نمرو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

نمرو ہنسی بولی۔

"میرا مطلب انڈس سے تھا قرانی ایک۔"

"اب بندہ اس سے پوچھے، اینٹوں سے مطلب رکھنے کا کیا مطلب ہے؟ انسان تھوڑے پڑھتے ہیں کیا؟"

وہ خفا خفا سا نمرو سے مخاطب تھا۔

"آپ دونوں ڈائریٹ ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتے کیا؟" نمرو کو ابھی بھی ہنسی آ رہی تھی۔

"میں تو کر رہا تھا۔ یہ آگے سے پوچھ رہی ہے کہ میرے ہاتھ کا بنا آئیٹ کھانا ہے یا آپ کو قرانی گرووں یعنی ایک عدد آئیٹ نہ کھانے کی پاداش میں یہ ظالم لڑکی مجھے روٹ کرنے کو تیار ہے۔" وہ نمرو سے شکایت کر رہا تھا۔

ان تینوں بھائیوں کا یہ ہی اسٹائل تھا۔

بے تکلف سا مگر زینبہ کے لیے یہ سب نیا تھا۔

اسے اسجد کے مذاق اور شجیدگی میں فرق کرنا مشکل تھا۔



میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ احتجاجاً مہولی۔  
 "اچھا۔ میرے خیال میں تو یہ ہی کہا تھا کہ کھاتے  
 ہیں آئیٹس یا چمکروں آپ کو فرائی۔"  
 وہ منہ لے رہا تھا، زینہہ رو بائیں ہونے لگی۔  
 "مگر میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"  
 "ہاں۔ میں جانتا ہوں تمہارا مطلب صرف ایڈے  
 تک تھا۔ بڑی مٹلی ہو تم۔" وہ شکاری انداز میں بولا تو  
 لہو بھرا سے دیکھنے کے بعد وہ تیزی سے پگن سے نکل  
 گئی۔  
 "وہ گاؤں؟" منہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔  
 "سید بھی کوڈ کر نیچے اترا۔ وہ بڑبڑایا تھا۔  
 "لگتا ہے کچھ زیادہ ہی ہو گیا۔"  
 منہ نے حٹکی سے کہا۔  
 "گرویا ناراض اسے لڑکیوں کا پتا بھی ہے آسانی  
 سے نہیں مانتیں۔"  
 "خیر لڑکیوں کا تو نہیں۔ تمہارا ہی پتا ہے مجھے،  
 صرف خیر سے مانتی ہوں تم۔"  
 وہ صاف گونی سے کہہ رہا تھا۔  
 "مجھے یہ تو صرف جا کلبشس اور آئس کریم خرچ  
 ہوتی تھی۔ (ادھر) دیکھنے کیا کیا خرچ ہوتا ہے۔"  
 وہ مزے سے بولی تو گہری سانس بھرنا وہ پگن سے  
 نکل آیا۔  
 زینہہ داوی جان کے کمرے میں پھرتی۔  
 اسے دیکھ کے بھی یوں غماہ کر گیا جسے دکھائی نہ ہو۔  
 "داوی جان! آپ نے ناشتا کر لیا؟" وہ ان کے  
 ناشتے کی ٹرے میں رکھے خالی برتنوں کا جائزہ لیتے ہوئے  
 پوچھنے لگا۔  
 "ہاں میرے چاند! فجر کی جاگی ہوتی ہوں تو صبح  
 سویرے ہی ناشتے کی طلب ہونے لگتی ہے۔"  
 وہ بولیں۔  
 "غوش قسمت ہیں آپ جو کسی نے آپ کو ناشتا  
 کروا دیا۔"  
 وہ گہری سانس بھرنا ان کے بستر تک گیا۔ ان کے  
 بائیں طرف زینہہ تھی۔ ان کی تسبیح کے دانے گنتی۔

"کیا مطلب ہے تم نے ناشتا نہیں کیا ابھی تک؟"  
 وہ چچکھیں۔  
 "مسئلہ ہے نا ذرا سا۔ اسی نمو کیا کیا دیکھے،  
 بے چاری کبھی تو اس سینک رہی ہے، کبھی پرائے اور کبھی  
 آئیٹس۔ سب کے فارغ ہوتے ہی میری باری آئے  
 گی۔ آج تو ویسے بھی چھٹی کا دن ہے۔"  
 وہ بڑی معمولیت سے کہہ رہا تھا، زینہہ کا استس  
 سی ہو بیٹھی، صاف اس پر کام چوری کا الزام دھرا جا رہا  
 تھا۔  
 "نمو کہہ رہی تھی زینہہ، نے مل کے ناشتا بنایا ہے  
 اس کے ساتھ۔" داوی جان باخبر تھیں۔  
 "میرا تو نہیں بنایا، جس کا بتایا ہو اسے پتا ہو۔" وہ  
 فوراً مگر گیا۔  
 "کیوں زینہہ، ٹھیک کہہ رہا ہے؟"  
 داوی جان نے پوچھا تو تھک کر اس نے تسبیح رکھ  
 دی۔  
 "میں تو بتا رہی تھی مگر ناشتا پانچے کا سوڈی  
 نہیں تھا، تھک کر کے مجھے پگن سے اتار نکال دیا۔"  
 صاف گونی کی حد تھی۔ اس پر منہ مسکراہٹ دیا۔  
 "نمو دیکھ چکی تھی منہ پھیرا۔  
 "بڑی بات ہے اسجد! مہمان کو تھک کرنے سے  
 گناہ ہوتا ہے۔" داوی جان مسکرائیں۔  
 "پیاری داوی! میں اسے مہمان کب سمجھتا ہوں۔  
 مگر حرم دل ہو جان ہے یہ تو۔"  
 وہ روٹلی سے بولا تو داوی جان اتنی شستہ اور دو میں  
 اکٹیں جبکہ زینہہ کی رنگت پل بھر میں لال پڑی تھی۔  
 "پلو جو بھی ہے آپ دوستی کرو اور خبردار جو آئندہ  
 کبھی اسے تھک کیا ہوتو۔"  
 داوی جان نے معاملہ نمٹانا چاہا۔  
 "میرا شوق۔"  
 "سجد گویا تیار ہی بیٹھا تھا، فوراً داہنا ہاتھ آگے  
 بڑھایا، دوستی مگر زینہہ شیشا گئی۔  
 "تو کیہ لیں، آپ کی پوتی میں اتنی آکڑے، اللہ نے  
 شکل توڑی زیادہ ہی اچھی دے دی ہے شاید اسی کا

غور ہے۔"  
 وہ شکیانہ "کہہ بھی رہا تھا تو کیا۔ وہ ہاتھ بڑھانے کی  
 ہمت کرتی تھی تو کیسے۔"  
 "نہ نہ۔ میری بیٹی، بہت نیک سیرت ہے، سادہ  
 طبیعت والی، غور اور متحر ہے پاک۔"  
 داوی جان کو تو وہ ویسے بھی بہت پیاری تھی، فوراً  
 اس کا فی البدیہہ قصیدہ پڑھ دیا تو اسجد نے ایو سی سے  
 اپنا بڑھا ہوا ہاتھ پلا دیا۔  
 "اچھا، میرا تجرہ تو کچھ اور ہی کہتا ہے۔" اس کی  
 شکل دیکھ کے زینہہ کا بھی چہرہ ہاتھ ملاہی لے، عمر اس کی  
 زبان جو پچھلے دنوں چھوڑی تھی، اس سے کچھ بعد نہ تھا  
 کہ کیا کہہ ذاتی۔ اسجد نے ہاتھ چھینچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔  
 "ادھار رہا۔"  
 ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے وہ ناشتا کرنے کا کہہ کر  
 کمرے سے نکل گیا تو زینہہ کو افسوس ہوا۔



"جلدی سے تیار ہو جاؤ، بھائی جان! پانچ لے کے  
 جارہے ہیں۔" منہ شام کو بڑی پرورش سی کرنے میں  
 داخل ہوئی تھی۔  
 "خیر بہت۔ لندن لے جا رہے ہیں یا بیروس؟" وہ  
 ڈائجسٹ کے صفحات پلٹتی تھکی۔  
 "ارنوس۔ بھائی جان! ہمیں تفریح کے لیے لے جانا  
 لندن بیروس جانے کے برابر ہی، سچو ڈراما میںوں بعد  
 ہاتھ آتے ہیں، آج تو صرف تمہارے طفیل۔"  
 وہ الماری میں سرگھسائے خوش دلی سے کہہ رہی  
 تھی۔  
 زینہہ کا دل بہت ترنگ میں دھڑکا، ڈائجسٹ پر سے  
 رکھ کے وہ گلے ٹھیک کرتی لیٹ گئی۔  
 "نمو اپنے کپڑے نکل کے پٹی تو اسے یوں اطمینان  
 سے لے کر دیکھ کر حیران ہوئی۔  
 "کیا ہوا؟ اٹھو نا!"  
 "آج دوسرے میں بھی نہیں لکھی۔ ابھی بہت دوروں  
 کی ٹینڈ آرہی ہے۔" وہ جان بوجھ کر کسل مندی سے

بولی۔  
 "کم آن زینہہ! اسجد نہیں جانا گاڑی یہ چارہ ہے  
 ہیں۔" منہ نے اسے پچکارا۔  
 "منہ تو نہیں ہو رہا۔" وہ کروٹ بدل گئی تو اس نے  
 حریفہ آزمایا۔  
 "بھائی جان کو خفا کرو گی؟" زینہہ کے لہوں پہ ہلکی  
 سی مسکراہٹ آئی۔  
 "میرے جانے نہ جانے سے بھلا کیا فرق پڑا ہے، تم  
 جاؤ نا ساتھ اٹھ کر لے جاؤ۔"  
 "وہ بھی جا رہا ہے، بلکہ صرف ہم چاروں چارہ ہے  
 تھے۔"  
 "چارہ ہے تھے نہیں، بلکہ چارہ ہے، جاؤ تیار  
 ہو جاؤ۔" زینہہ نے اسے تسلی دی تو وہ جل کر بولی۔  
 "نگ تو نہیں رہا، تم پروگرام خراب کرو گی، اٹھو  
 جلدی سے۔"  
 "نہ۔ میرے ہاتھ میں درد ہو رہا ہے، مطلب  
 میرے سر میں۔" اس نے تسلی سے مہمانے بنائے تو  
 منہ جلتے اچکانی کپڑے تبدیل کرنے کے واسطے روم میں  
 گھس گئی۔  
 "نمو دیکھنا ابھی بتا چلے گا بھائی جان کو تو وہ ہمیں بھی  
 گھبرائی چھوڑے گا میں گے بہت بڑی تم ہم سے۔"  
 منہ اسے ڈر رہی تھی۔  
 "اب اتنی بھی اہم نہیں ہوں تمہارے بھائی جان  
 کے لیے کہ میرے لیے وہ اپنا موڈ اور اپنی تفریح تیار  
 کرتے پھرتے۔"  
 بالوں کو احتیاط سے کچھو میں سینٹے ہوئے وہ گلن  
 سی تھی۔ دروازہ کھول کے اندر آتے اسجد کو دیکھ نہیں  
 پائی۔  
 "پیلو بھی۔ ابھی تمہاری تیاری ہی ختم نہیں  
 ہو رہی، زرات پڑ جائے گی۔"  
 "بھائی جان! یہ زینہہ نہیں جا رہی۔" منہ نے پول  
 کھول ہی دی۔  
 "تم تیار ہونا؟ چل کے گاڑی میں بیٹھو۔" وہ  
 سرسری انداز میں منہ سے بولا تو اس نے منہ لٹکایا۔







"تمہاری اپنی ماں نہیں ہے کیا" سو  
 برتنے میں ہلانے کے لیے سانس کو امی کو گے اب۔  
 وہ دن اور آج کا دن عاصم اس کی امی کو امی کہہ کر  
 ہی مخاطب کرتا تھا یا پھر تمہاری امی۔  
 اور اگر یہ حرکت ہو کرے تو جی ہمیں ماں نہیں  
 سمجھتی یہ ہی کہا جاتا ہے۔  
 بہر حال چھوٹی چھوٹی مٹی ہاتھوں کو عافیہ بیگم کی بد مزاجی  
 اور ڈکٹیٹر شاز طبیعت بہت بڑا بنانے ہوئے تھی۔  
 وہ جو ایک ولولے اور نئی سوچوں کے ساتھ سسرال  
 میں آئی تھی دل مسوس کر رہی تھی۔  
 دوسرے وہ چھوٹی سی چھوٹی بات فون پر اپنی بڑی بیٹی  
 فاریہ سے شیئر کرنے کی عادی تھیں۔ صبح سے لے کر  
 شام تک کے تمام معمولات کی رپورٹ اور ساتھ  
 ساتھ اپنے خیالات اور تجزیے اسے جاتیں اور یہ تمام  
 باتیں بے لگت دہلی کرتیں۔ ہوسکتی کر جتنی ان کی بلا  
 سے مراد یہ قطعاً "نہیں سوچتی تھیں کہ اس طرز  
 عمل سے وہ اپنی عزت برہا نہیں بلکہ گھٹا رہی تھیں۔  
 عروہ کو نظر ہا اس قدر پائنتا اور مدد دیکھائی دینے والی  
 عافیہ بیگم کا یہ رویہ بہت ناقابل برداشت لگتا تھا۔

وہ بے وقت گھر آیا تھا۔ گیٹ کی چابی اس کے پاس  
 ہی ہوا کرتی تھی۔ نمو اور اس پر بھی اجنبی نہیں لوتے  
 تھے۔ چچی جان اور وادی جان نمو کے لیے آئے کسی  
 پرو پولز پر غور و فکر کر رہی تھیں۔  
 زینبہ روٹیاں بنانے کے لیے کچن میں آئی تھی۔  
 اجد سیدھا ہیں آیا۔  
 "السلام علیکم" اس کی دھڑکن اس اچانک  
 سلامتی پر تیز ہو گئی۔ تیزی سے پٹی قواسم کو سامنے پا کر  
 حیران ہوئی۔  
 "آپ... اس وقت؟"  
 "یہ سلام کا کیا جواب ہے کیا؟"  
 وہ ہنسنے میں اچکا کر پوچھنے لگا۔ زینبہ خفیف سی ہوئی۔  
 "و علیکم السلام۔"

"امی کدھر ہیں؟"  
 "وادی جان کے کمرے میں ہیں۔"  
 وہ فریج میں سے آئے کاپیوں کا لٹے لگے۔  
 "ایک کپ چائے ملے گی؟" وہ پوچھ رہا تھا۔  
 "ہاں ضرور۔ مگر پہلے کھانا تو کھا لیں۔ میں روٹیاں  
 بنانے لگی ہوں۔" زینبہ نے کہا۔  
 "مہر میں سخت درد ہے پارٹر ایک کپ چائے اور  
 ایک پڑ سکون نیند کی سخت ضرورت ہے۔"  
 زینبہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرنی  
 تھی۔ "ذرا ذرا بیوی ہوئی شیوہ وہ واقعی تھا ہوا لگ رہا  
 تھا۔  
 تین دن پہلے ہونے والے بم بارش کے زخمیوں  
 سے اسپتال بھرا ہوا تھا۔ وہ کلینک سے زیادہ اسپتال ہی  
 میں پایا جاتا تھا۔ شوژی نیند اور زیادہ کام لے کر دکھائی  
 دیا تھا۔  
 "اوکے میں لاتی ہوں۔" زینبہ نے سر ہلایا اور  
 ساس بیٹن میں پانی ڈال کر نمونے لے کر چڑھا دیا۔  
 وہ وادی جان کے کمرے میں گیا پھر ان سے مل کر  
 اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔  
 چچی جان شکر سی بیگن میں بیٹی آئیں۔  
 "کما بھی ہے یوں دیوانوں کی طرح کلمہ مت کیا  
 کرو۔ مگر یہ لڑکانے تو نا اب رات کو کلینک پہ پبلا  
 جائے گا۔" وہ شاکتی انداز میں کہہ رہی تھیں۔  
 "اسیج کے لیے چائے بنا رہی ہو" خالی چائے مت  
 دینا ساتھ میں بسکٹ لے جاؤ کھانے پینے کا ہوش  
 نہیں ہے اسے۔"  
 انہوں نے کینٹ میں سے بسکٹ کا ہاف روٹ  
 نکال کر پلیٹ میں بسکٹ رکھے اور خود توڑے کے پیچھے  
 آگ جلائے لگیں۔  
 "میں روٹیاں بنالوں گی چچی جان" زینبہ نے کہا تو  
 وہ بولیں۔  
 "تم چائے بنا کے دو اسے دو چار پیسکے ڈالنے ہیں"  
 میں ڈال لوں گی۔" وہ کپ میں چائے ڈال کے بسکٹ کی  
 پلیٹ ٹرے میں رکھتے گئی۔

بنا بسا روزانہ کھلکا کر اندر داخل ہوئی تو نیم  
 اندھیرے کمرے میں وہ بیڈ پر اوندھے منہ آڑا تر چھا لینا  
 ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ مار کر لائٹ آن کی تو وہ چونک کر  
 چلنا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زینبہ نے ٹرے اس کے سامنے  
 رکھی۔  
 "صرف چائے کما تھا۔" وہ بسکٹ کی پلیٹ دیکھ کر  
 بولا۔  
 "خالی بیٹھو انہیں کھانی چاہیے۔"  
 "میں صرف ایک نیپلٹ لوں گا۔" اس نے کہا  
 تھا۔  
 "اس کے لیے بھی کچھ کھانا ضروری ہے۔" وہ  
 اطمینان سے بولی۔ اسجد نے نگاہ بھر کے اسے دیکھا  
 پینک اور فیروز رنگ کے لباس میں وہ اچھی لگ رہی  
 تھی۔ اس کا خوسے لارو اور سادہ سا انداز اس کے  
 رویہ کو مزید دلکش بنا تھا۔  
 زینبہ ضروری تو نہیں اور بھی بہت سے طریقے  
 ہیں سر درد کو بھگانے کے" میں نے بتایا تو تھا ایک  
 طریقہ۔" وہ شرارت سے بولا تو اس کی راحت چپ  
 آ گئی۔  
 "میں پلٹی ہوں۔ نمو آنے والی ہے روٹیاں بنانی  
 ہیں۔"  
 "کم آن یا رانیمو تو پہلی بار میرے کمرے میں آئی  
 ہو۔" وہ جلدی سے بولا۔  
 "نہیں۔ آپ یہ عجیب سی باتیں کرتے ہیں۔" وہ  
 صاف گوئی سے کئی اسجد کو قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی۔  
 "چھانئیں کیوں گا پراس۔"  
 اس نے وعدہ کیا تھا اور زینبہ اس کے سامنے بیٹھ  
 گئی۔  
 اس روز چائے پینے ہوئے اسجد نے اس سے  
 ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اس کی ٹیڈو پائینڈ اس کے  
 خیالات اس کی روٹی پیاں۔  
 اور زینبہ نے بھی اسے قریب سے جانا کہ وہ کتنا  
 پیارا شخص تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ زینبہ کو اپنے بند  
 کرنے لگا تھا۔

"میں نے تو وادی جان کے کمرے پر ماں گروی تھی"  
 بس۔ لیکن اب میں اپنے اس فیصلے سے بہت خوش  
 ہوں۔" اس نے چھپایا نہیں تھا۔  
 اور اس کے اس بڑا اعتراف نے زینبہ کی روح  
 تک کو شامت کر دیا۔ پھر وہ اٹھ کر اپنی وارڈ روم کی  
 طرف برہلا دیا اس کی مٹھی میں ہاتھ تھا۔  
 وہ زینبہ کے پاس آ بیٹھا۔  
 "تمہارے لیے۔" اس نے چکی میں پکڑ کر  
 سونے کا نفیس سا بریسٹ لٹا دیا۔  
 "او نمو۔" زینبہ نے نئی میں سر ہلایا۔  
 "خیر وار کسی بہت اچھے مریخ پر دینے کا سوچتا تھا اور  
 قسمت نے آج اتنا حسین موقع دے دیا۔" اس کا ہاتھ  
 تھامتے ہوئے کہہ رہا تھا۔  
 "چھانئیں لگتا ایسے بے وجہ کا گفٹ۔" وہ  
 پتکچائی۔  
 "مٹھی ہو چکی ہے ہماری بے وجہ کا کیوں۔" وہ  
 لارو والی سے کہتے اس کی کھالی میں بریسٹ پٹا کر  
 لاک لگا دیا تھا۔  
 "پھر کسی۔" وہ شرمندہ ہو رہی تھی لگتا تھی گفٹ  
 لے کر۔  
 "تو چلو جواب میں تم بھی کوئی گفٹ دے دو۔" وہ  
 اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا تو وہ  
 گمراہی۔  
 "میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔"  
 "ضروری تو نہیں پیسوں کی کوئی چیز ہو۔ ایک اچھی  
 سی یاد۔ کوئی روپیہ شکر کی یاد۔"  
 وہ کہتے ہوئے شرارت سے اس کی طرف جھکا تو وہ  
 تیزی سے اٹھ گئی۔ اسجد نے پھرتی سے اس کا ہاتھ تھاما  
 تھا۔  
 "رکھو۔"  
 "بہت باتیں ہو گئیں اب بس۔" وہ قطعیت سے  
 بولی تو وہ بھی اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔  
 "لگتا تو نہیں کہ آپ کے سر میں درد ہے۔" زینبہ  
 کے نظرنے اسے چسوا دیا۔



"یہ تو تمہارے قریب کا آغاز ہے میری شریک سفر! مجھے ہر دُکھ ہر درد بھول گیا ہے۔ اے میری ہم نفس! زندگی کے سفر میں تم میرے ہم قدم ہو یہ احساس ہی مجھے ہر درد سے بے خبر کرنے کو کافی ہے۔"

وہ بے حد جذباتی اور شدت آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ زینبہ جیسے کھل کھل گئی۔ جلنے کیوں اس کی آنکھ بھر آئی تھی۔

اس کے لبوں سے ایک سسکی ابھری اور آنکھ سے آنسو کا قطرہ اس کے ہاتھ پر ٹپکا۔

وہ چونک کر جیسے حال میں لوٹی تھی۔

"مسجد۔"

اس کا نام پھر سے سسکی کی صورت اس کے لبوں سے آزاد ہوا تھا۔

"میری زندگی کس درد سے بھر گئی ہے کیا اس سے تم واقف نہیں ہو؟ اب تمہارا دل نہیں کوئی مشکل نہیں دے رہا کہ مجھ پر کیا تینوں والی ہے۔"

اس نے پائیس نکالی سے لپٹے اس خوب صورت سے ریسٹلٹ کو دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔



عافیہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود عروبہ نے جس طرح بچن سنبھالا تھا اس نے ان کے دل میں غصہ بھردیا تھا۔ ایک بے وجہ کا غصہ اور مقابلہ عروبہ ایک سالن ان کے انداز اور مرضی کا پائی تو وہ سراپتیتا اپنی مرضی اور پسند سے بتاتی۔

"دراصل مجھے ٹھنڈے گوشت پسند نہیں۔ میں نے اپنے لیے چنے کی دال ڈالی ہے گوشت میں۔" وہ آرام سے کہتی اور جب سب ہی ٹھنڈوں سے زیادہ دال گوشت شوق سے کھاتے تو ان کا دل زہر سے بھر جاتا۔

وہ ان عورتوں میں سے نہیں جو اپنی شہنشاہی آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ اپنی من مرضی کرنے کو ہی تو وہ اگدہ ہوتی تھیں، ایسے کیسے سب کچھ عروبہ کے حوالے کر کے بیٹھ جاتی ہیں اور اٹاکی اس لڑائی میں انہوں نے یہ بھی نہ سوچا تھا کہ

دل جل کر زیادہ اچھے طریقے سے گھر سنبھالا جاسکتا ہے۔

ان کے اس شدید طرز عمل نے عروبہ کے اندر بھی ضد پیدا کر دی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر وہ اس کی ماں اور اس کی تربیت پر جاچا پختیں۔ وہ بھی ہر بات عاصم کو من و عن بتاتی۔

"یہ شکایت نہیں ہے۔ میں صرف پر بات سے آپ کو باخبر رکھنا چاہتی ہوں۔ کل کو آپ یہ نہیں کہیں کہ میرے علم میں تو کوئی بات نہیں۔" ساتھ ہی وضاحت بھی کرتی۔

مگر روزانہ ہی کسی نہ کسی بات پر یہ مزگی ہوتی رہتی۔

اب عافیہ بیگم نے طریقہ یہ اپنایا کہ ہر کام ہی عروبہ پر چھوڑ دیا۔ چھوٹے چھوٹے دوپٹے سنبھالنے کے ساتھ ساتھ مزگی بنانے سے لے کر برتن دھونے تک وہ بوکھلا کر رہ گئی۔

زینبہ کو انہوں نے پڑھائی تک محدود کر دیا تھا۔ "تمہاری عمر بڑی ہے ان کاموں کے لیے۔" وہ آواز سے کہتی۔

اور پھر پھوٹے پھوٹے باوا بیلان ایک بڑے طولن کی شکل اختیار کرنے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی جب زینبہ داوی جان سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ بخار کی وجہ سے عروبہ میں کام کی سکت نہ رہی مگر عافیہ بیگم نے نہ تو بچوں کو سنبھالا اور نہ ہی ہانڈی کی ذمہ داری واپس قبول کی۔ مجبوراً جیسے جیسے کر کے عروبہ نے ہانڈی بنائی اور بچوں کو لے کر کمرے میں جا بڑی۔

رات کھانے کی میز پر انہوں نے جن جن کھانے میں نقص نکالا۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی امی! عاصم نے ایک نظر سر جھٹکے کھانا کھائی عروبہ کو دیکھ کر کہا تو وہ چٹکیں۔

"ہم نے بھی چارٹ بچے سنبھالے اور ساتھ ساتھ گھر کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ یہ ہمارے ہمارے سامنے

ت چلاؤ۔"

عروبہ نے بنانے والی گویا بات ہے امی! میں نے آپ کو بتایا تھا مجھے بخار ہو رہا ہے۔"

عروبہ نے برداشت سے کام لیا تھا۔ "تو بی بی! بخار میں کون سا قافیے ہوتے ہیں۔ یہ بیٹھے ہیں تمہارے سر صاحب پوچھ لو، تو ایک دن بھی تانہ ہو یا کھانے کا۔"

وہ بے حد سختی سے بولیں تو شبیر احمد کو بھی بولنا پڑا۔ "عاصم! خاموشی سے کھانا کھاؤ سب۔"

"کیا کھاؤ؟" یہ زہر کھانے کے قابل ہے کیا؟ فرا ٹھیک۔ "انہوں نے پلیٹ پر سے کھسکائی اور تنفر سے بولیں۔

"وہ پھر کون میں نے پکھا تھا۔ اتنا تیز تو نہیں تھا۔ شاید گرم کرنے سے مسالا خشک ہو گیا ہے۔"

عروبہ بمشکل بولی۔ مگر عافیہ بیگم نے تو جیسے اس کا پہلا جملہ ہی سنا ہو۔ ان کے تو تکیوں گئی سر پہ جا چکیں۔

"ہاں ہاں، تم نے تو بالکل ٹھیک دیکھا تھا۔ میں رہے ہیں آپ مطلب یہ ہوا کہ جب اس نے دیکھا تو اس وقت تک ٹھیک تھا اور اس وقت جب کھارے ہیں تو تیز ہے۔ یعنی میں نے ڈالا ہے اس میں ٹھیک۔ یہ ہے اس کی تربیت، حد ہو گئی، صبح پڑھا کہ بھیجا ہے ماں نے بی بی باکو، تو تم موت کہ میں نے کیا ہے۔"

اب کی بار تو عافیہ بیگم نے حد ہی گروی تھی۔ عروبہ تو زبرد پڑتی رنکت لیے چھوٹے بچوں کے سامنے اپنی چٹپٹائی ہوتی دیکھ رہی تھی۔ مجبوراً "عاصم ہی کو کھانا پڑا۔"

"امی! پلیز یہاں بات عروبہ کی ہو رہی ہے۔" "اے جاؤ بڑے آئے اس کے سکھ۔ ایسی تربیت ماؤں ہی کی ہوتی ہے۔ سسرال میں لڑکی نہیں اس کی ماں کی تربیت ہوتی ہے اور اسے تو میں بہت اچھی طرح سے دیکھ چکی ہوں۔"

وہ تذبذب کرنے میں چٹائی نہیں رکھتی تھیں۔ "آپ مجھ سے کچھ بھی نہیں، مگر میری ماں تک نہ

پانچپن۔" عروبہ نے ہمت مجتمع کی تھی۔ "تو دیکھ رہے ہیں آپ، بس تو جو بوناب تو بڑا ہی منہ کو آنے لگا ہے۔"

عافیہ بیگم نے فوراً "ہی آپ دیدہ ہو کر شبیر احمد سے کہا تو ان کا غصہ آسمان کو چھوئے لگا۔

"نصو اور وضع ہو جاؤ۔ اس گھر میں بدتمیزوں کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

ان کا فیصلہ اٹل تھا۔ مگر وہ بھول گئے کہ مقابل بھی ان ہی کا خون تھا۔ وہ بھی اسی وقت تو الہ پھینک کر اٹھ گیا۔

عافیہ بیگم کو بہت کچھ غلط ہونے کا احساس تو ہوا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ قاسم نے بھی بات سنبھالنے کی کوشش کی مگر دونوں میں سے کوئی بھی فریق جھکنے کو تیار نہ تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ عافیہ بیگم نجیا نہیں پڑنا چاہتی تھیں، مسول پہ پتھر رکھ کے سر منہ پینے پڑی رہیں۔

گاڑی کی آواز آئی تو قاسم نے آکر بتایا کہ وہ لوگ جا چکے ہیں تو وہ دل تمام کے رہ گئیں۔ پھلا کہاں جاتا وہ اس رات میں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ؟ "چار دن سسرال میں رہے گا تو زمانے کے جوئے کھا کر واپس لوٹے گا۔"

شبیر احمد نے تبصرہ کیا اور گروت بدلنے کے لیٹ گئے۔



اکلی صبح زینبہ کو اسجد خود چھوڑنے آیا۔ "بہت یاد آؤ گی اس بار میرے خیال میں باہر جانے سے پہلے میں تمہیں رخصت کرانے لے جاؤں۔"

اس نے کہا تھا اور وہ مسخ چہرہ لیے اسے ٹھور کر رہ گئی تھی۔ شام کو وہ واپس ہو گیا۔

زینبہ کو قاسم کے ذریعے تمام حالات کا علم ہوا تو وہ دل تمام کے رہ گئی۔ فاریہ کو فون کر کے عاصم اور عروبہ کا پوچھا، مگر وہ تمام واقعہ سے لاعلم تھی، پریشان ہونے لگی۔



ادھر عاصم نے دوران ہوش میں سوچ بچار میں گزارے اور میرے دوڑ سیدھا پنڈی کا رخ کیا اور واوی جان کے پر شہقت سائے میں جا کر کھجک کی سانس لی۔

مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی یہ حرکت زہنیہ کی زندگی میں کیسا خطرناک موڑ لائے والی ہے۔

زہنیہ کو اسجد نے انعام کیا اور وہ خوش خوشی غایہ بیگم کے پاس گئی۔

عاصم کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملنے پر وہ بہت ملول و افسردہ تھیں مگر اپنی پار نظر ہر نہ کرتیں۔

"امی! بھائی کا پتا چل گیا" وہ واوی جان کے پاس ہیں۔" زہنیہ نے جیسے "مفوش خبری" سنا لی تو وہ پینے کے لیے اسے گھورتی رہیں۔

زہنیہ کنٹینر توڑنے لگی۔

"اسجد نے بتایا ہے"

"بہت خوب" تو اب واوی کے ساتھ محاذ بنا کے جنگ لڑے گا وہ۔" انہوں نے کہا بھی تو کیا واوی اپنی مرضی کا مطالبہ۔

پور شہیر احمد کو بھی پتا نہیں کہ لفظوں میں سلامی رپورٹ تھی۔

انہوں نے صاف لفظوں میں زہنیہ اور اسجد کے رشتہ کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔

"جن کو ہماری عزت کا احساس نہیں، ہمیں ان سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔"

انہوں نے فون پر بھائی سے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

"ہم کسی بھی صورت عاصم اور بھابھی کو یہاں سے کہیں نہیں جانے دیں گے۔ آپ گھر لے جانا چاہیں تو بعد شوق مگر وہ یہاں سے نکل کر در کی کھولیں گھا میں یہ کبھی نہیں ہوگا۔"

اسجد نے ان کا فیصلہ سن کر بھی صاف اور متوازن لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تو وہ نل کھا کر رہ گئے۔

یہ سوچے بغیر کہ مقابل ان کا پناہ خانہ ہے۔

اور زہنیہ۔۔۔

اس کا کون سا سوچتا؟

وہ تو جیسے بے پروا کی ہستی میں سوار تھی۔ خوف زدہ اور منظر سے لاعلم۔

اور پھر اسجد نے اسے شاید آخری فون کیا تھا۔

"یہ تمہاری لڑائی ہے قرینی! تالی جان کے سامنے تمہیں اٹھنا ہوگا۔ تم میری منگولہ نہیں ہو کہ عدالت میں مقدمہ کر کے تمہیں جیت لادوں۔ تم اسٹینڈ لوگی تب ہی کوئی فیصلہ ہوگا۔ عاصم اور عروبہ کو میں یہاں سے کہیں جانے نہیں دوں گا اور یہاں میں تو میں نامعمر تمہارا انتظار کروں گا۔" وہ اس کی کمزور جان پر سارا بوجھ ڈال کر مطمئن ہو گیا تھا اور ادھر وہ کیا کرتی۔

وہوں میں عافیہ بیگم نے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ کر بات طے بھی کر دی، بلکہ ایک مہینے کے اندر اندر شادی کا فیصلہ بھی کر لیا۔ تقدیر جانے کیا رنگ دکھانے والی تھی؟

"ہوش کے باغیوں نے عافیہ بیگم کے لیے نہیں توڑے چاہتے۔ بنا اور سو تو پاتھ سے گئے ہی تھے اب میں کا کھر چلی اجاڑتی ہوں۔"

واوی جان نے اتنے سخت لہجے میں ان سے کبھی بات نہ کی تھی۔ حتیٰ کہ وہ ان کے بیٹے کو لے کر الگ بھی چلی ہو تھیں۔ مگر اب جب بات ان کے پوتے اور پوتی کی تھی تو وہ یقیناً "اصل" سے سو کو پیارا جانتے ہوئے گھر کس کے میدان میں کودی تھیں۔

عافیہ سلگ اٹھیں۔

"گھر میں نے اجاڑا ہے یا آپ بدلے لینے پر اترتی ہوئی ہیں۔" ان کی تیز لہجے میں کئی گئی بات پر واوی جان حیران ہوئی تھیں۔

"میں۔۔۔ کہے کے بدلے لوں گی تم سے؟"

"کسی کو بھی میرا ہتھیار گھر پروا شت نہیں تھا۔ جو ڈنڈو کر کے میرے بیٹے کو تو درغلایا میرا اپنی بیٹی کو بریاد ہونے نہیں دیاں گی میں۔"

وہ کہاں کی کہاں لے گئی تھیں۔

"خدا کی پناہ! گورنا تھی" وہ غصے سے کانٹے لگیں۔

"اور ذرا اپنے الطوار پر بھی غور کرو۔ دوسروں کی تربیت میں کیڑے تو فوراً دکھائی دے جاتے ہیں مگر خود کو تو جوش بالکل درست سمجھتی ہو۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ پہلے بھی تم نے ناقابل اندیشی سے کام لیا اور ایک ہفتے نئے گھر کو تیار کیا اور اب اپنے گھر کے سکون کو بھی تم خود ہی تہہ و بالا کیے دے رہی ہو۔ زہنیہ کا اس سارے قصے میں کیا تصور ہے؟"

"اس کا کوئی تصور نہیں اسی لیے تو اسے قریابی کا کبکرا بنانے سے گریز کر رہی ہوں۔"

وہ اطمینان سے بولیں۔ واوی جان کو کھسا کر انہیں بہت سکون ملا تھا۔

"شرم کرو عافیہ! رشتے تانے کھیل نہیں ہوتے کہ جب جی چاہا کھیل لیا جب مرضی نہ ہوئی کھیل خراب کر دیا۔ یہ بچوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے۔ پانچ سال ان کی مستی رہی ہے۔"

انہوں نے گھر کا تھا۔

"کون جی نہیں تھا اور ویسے بھی زہنیہ کے ہندو کے فضل سے انچار شملہ لڈکا ہے۔ وہ ایک ایک ہر کے اندر اندر شادی پر نو رو سے رہے ہیں۔"

وہ قہقہے سے کہتی انہیں دکھ اور ہنس کا شکار کر گئیں۔

"اسجد میں کیا برائی تھی بھو! اتنا خوب سیرت و خوب صورت پر مروز گا کر ہے۔"

"انہوں کے ساتھ کھن پینے کی روایت تو بہت پرانی ہے ویسے بھی آپ سے بات کرنا عیث ہی ہے۔ آپ نے میرے مقابلے میں بیٹھ ہی دوسروں کا ساتھ دیا ہے۔" وہ آرام سے بولیں۔

"مگر اس بار دوسروں کی صف میں تمہارا بیٹا ہے عافیہ! سوچ کر قدم اٹھاؤ اور وہ خود میرے پاس آیا ہے نہ کہ میں نے اسے۔" انہوں نے تصحیح کی تھی۔ مگر کوئی تصحیح چاہے بھی تو۔

"میری طرف سے تو یہ رشتہ ختم ہی ہے باقی باتیں اپنے سینے سے طے کر لینے گا۔ خدا حافظ۔"

عافیہ بیگم نے رکھائی سے بات ختم کر دی تھی۔

عاصم نے تو صاف اس نئی منگنی کا باہر نکال کر کیا تھا اور زہنیہ کو بھی انکار کے لیے ڈٹ جانے کے لیے خوب آکسایا تھا۔

"کیا کروں۔ ماں باپ کے سامنے آنکھری ہوں؟ وہ ماں باپ خود سے جنہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ میری زندگی برباد کر رہے ہیں۔" وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"بقاوت اسی کو کہتے ہیں۔ فی الحال زندگی بربادی کی طرف جاری ہے۔ مکمل بربادی سے پہلے ستر یا ب کر لو۔"

اس نے سمجھایا کہ جب تک وہ خود گھروالوں سے بات نہیں کرے گی بات میں وزن نہیں آئے گا۔

مگر عافیہ بیگم اور شہیر احمد سے اس موضوع پر بات کرنے اور اسجد کے بغیر مر جانے کے ڈانڈیلا لڑ بولنے کی بہت تو وہ مگر کبھی نہ کر سکتی تھی۔ عافیہ بیگم تو ان نکالوں قہار سے خیر خواہ تھیں اور رہے شہیر احمد تو ان تک عافیہ بیگم نے اولاد کو جانے ہی کب یا تھا۔

البتہ قاریہ کے سامنے اس نے ڈھیروں ڈھیروں اعتراض کیا۔

"ذہنیہ زہنی! امی ایسے ہی تو یہ فیصلہ نہیں کر رہیں۔ دل دکھائے تو ہی مقابلے پہ آئی ہیں۔"

اسے ٹپکے جملے ہی سے اندازہ ہو گیا کہ قاریہ کی برین واشنگ عافیہ بیگم اچھی طرح کر چکی ہیں اور نہ ہی قاریہ اسجد سے بے حد متاثر تھی بلکہ اس سے کافی دوستی بھی تھی قاریہ کی۔

"جس کا دل دکھتا ہو، وہ دوسروں کا دل نہ دکھانے کی سوچتا ہے۔ امی تو میرا بھی دل دکھانا چاہتی ہیں۔"

زہنیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے ملتھیانہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"تم بے وقوف ہو۔ اسجد پوری زندگی نہیں تھا تمہاری۔" قاریہ نے اسے کھینکا چاہا۔



"وہ میری یورپی زندگی ہے آئی! پچھلے پانچ برسوں سے میں جس شخص کو آئندہ زندگی میں ہرگز اپنے ساتھ سوچتی آئی ہوں اسے میں یوں اپنی زندگی سے ہاتس نہیں کر سکتی۔"

اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔  
"اتنی کمزور مت، تو زین! زندگی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو جاتی یہ بے وقتی کی وہ باتیں ہیں جن پر بعد میں ہنسی آتی ہے۔"

"ہنسی انہیں آئے گی جن کے فیصلے چلیں گے میرے لیے تو فقط روٹا ہی روٹا ہو گا آئی۔"  
وہ واقعی رووی تھی۔ فاریہ کو غصہ آیا۔  
"تمہیں اپنے دل کی اپنی زندگی کی بہت فکر ہے۔ اسی کا سوچو۔ سچی۔ غاصم کے فیصلے سے ان کے دل یہ کیا ہتی ہے؟ کیسے بچاؤ گھمایا ہے انہیں وہاں رکھ کے ان لوگوں نے اسی کو۔"

مارے دکھ کے اس کے آنسو تھمنے لگے۔  
"اس میں بھی وہ لوگ غلط ہیں آئی۔" وہ شدید سخت سے بولی تو الفاظ زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔  
"ہمارا بھائی ہمارا ماں جیسا اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کو لے کر آدھی رات کو گھر سے نکلتا ہے تو اسے بناوہنے والا ہوا دشمن ہے؟ انہیں چاہیے تھا کہ اپنے گھر کے دروازے بند کر لیتے یا پھر انہیں دھکے دے کر نکال دیتے؟"

فاریہ سنبھلی۔  
"میں نے یہ نہیں کہا مگر غاصم کی بھی غلطی ہے۔ اس سے کس نے کہا کہ ایسا قدم اٹھانے اور اپنے ساتھ تمہاری زندگی بھی برباد کرے۔"

"امی نے کبھی مفاہمت اختیار ہی نہیں کی آئی! عرب بھائی تو ہو چکے ہیں مگر امی نے کبھی کسی ماں بن کے انہیں اس گھر میں قبول نہیں کیا۔ جہاں رشتوں کو قبول کرنے کے بجائے محض "برداشت" کیا جاتا ہو وہاں رشتوں کی بنیاد فقط ریت ہوتی ہے تو لاؤ نہیں۔"

وہ سچی سے حقیقت بیان کر رہی تھی۔ فاریہ نے

ناگواری سے اسے دیکھا۔  
"وہ بھی کچھ کم نہیں کر کے گئی۔"  
"ہاں۔ ان کا تصور تو بہت بڑا ہے آرام سے چٹھی رہتیں۔ ہسٹریہ پکا پکایا کھاتی رہتیں۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"اب بھی دیکھ لو۔ بنا سوچے کبھی فیصلے کا نتیجہ۔"  
فاریہ نے فی الفور کہا تھا۔ اسے روٹا آنے لگا۔  
"امی کو میری زندگی کی برادری کا کوئی احساس نہیں ہے۔"

"احساس ہے تب ہی تو یہ قدم اٹھا رہی ہیں۔ جو لوگ ابھی ان کی عزت نہیں رکھ رہے وہ بعد میں کیا کریں گے۔"  
فاریہ کو ماں نے مکمل سچی پڑھائی ہوئی تھی۔ اس کی اپنی تو گویا کوئی سوچ ہے ہی نہیں تھی۔  
"عزت ہی تو رکھی ہے انہوں نے آئی! مگر امی سمجھیں تو نا! اگر وہ دروازے سے لوٹا تو یہ بھائی جان اور ان کے بیوی بچوں کو سڑکوں پہ رتے دیتے تو عزت کا حق آپ کی؟"

وہ برنگ و غم سے سچی تو فاریہ سنبھالی۔ کہ تو وہ ٹھیک ہی رہی تھی۔ مگر بیانیہ تسلیم نے بھی رشتہ ختم کرنے کی ضرورت بتائی تھی وہ غلط نہ تھیں۔  
"امی! صرف اپنی انا کی بار برداشت نہیں کرنا چاہیے اور اس گھیل میں وہ بیٹا تو ہار ہی چکی ہیں اب بیٹی کی زندگی بھی داؤ پر لگا رہی ہے۔"

وہ پچھلے حق لہجے میں بولی تو فاریہ نے سر تھام لیا۔  
مطلب۔ وہ ہے اس ولا چار تھی۔

اسعد کا فون آیا تو وہ روٹی چلی گئی ساتھ ہی جومنت میں آیا وہ بھی کہہ دیا۔ اس نے بہت حمل کے ساتھ ساری لیجن طعن سنی اور اسے دل کا خیال نکالتے دیا۔ جب وہ سچی تو رساں سے بولی۔

"اب جاؤ اور منہ پانی کا ایک چھینٹا ہار کے آؤ۔" اور واقعی وہ سیل فون رکھ کے گئی اور جب منہ دھو

کے ٹائل سے خشک کر کے آئی تو خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔  
"دیکھی ہو۔؟" وہ جیسے بڑے نارمل حالات میں گفتگو کر رہا تھا۔

"میرے زخموں پر ٹنگ چھڑکنے کو فون کیا ہے آپ نے؟" وہ جس پر تب سکتی تھی تھی۔  
"میں نے سوچا تھا شاید مائی جان بدل گئی ہیں مگر وائے حسرت۔" وہ گہری سانس بھرنے کو بولا تو زینہ کو روٹا آئے کیا۔

"اسے بڑا کچھ کریں۔ امی کہیں اور میری بات طے کر چکی ہیں۔" وہ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولا۔  
"بتایا ہے مجھے غاصم نے۔ وہ تو بہت غمے میں ہے یہاں سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ مگر میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ کوئی اور ٹھکانہ تو ہے نہیں اس کا۔"  
"ہمارا کیا ہو گا اسعد۔؟" اس کی آواز کپکپاتی تھی۔

"دیکھو زین۔ غاصم کا یہاں سے طے جانا سکلے کا عمل نہیں ہے۔ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اگر وہ یہاں سے چلا بھی جاتا ہے تب بھی اتنی جاتی چٹھی آگے جا چکی ہیں ان کی واپسی مشغل ہے۔"

وہ بڑے محتال لہجے میں گویا ہوا تو زینہ، صدمے سے چلا اٹھی۔  
"تو۔ کیا کرنا چاہیے مجھے۔ اس آلہ کے پٹھے سے شادی کر لینی چاہیے جسے انہوں نے میرے لیے ڈھونڈا ہے۔"  
"میں یہ نہیں کہہ رہا۔" اسعد نے کہنا چاہا مگر وہ سن کہاں رہی تھی۔

"واپسی تو میری مشکل کر دی ہے آپ نے اسعد! میں تو ان چندوں سے انجان تھی ان راستوں سے بے خبر لا علم اور اب بند گلی میں لاس کے کہتے ہو راستہ خود تلاش کرو؟"

"تو کیا کروں۔۔۔ بھٹکا کے لے آؤں تمہیں؟" وہ بھی قدرے غمے میں آیا تھا۔ تیز آواز میں بولا تو وہ روٹنے لگی۔

"تم سو رہی زین! آؤ فوراً! امی کھینچ کر لے گیا۔" میری جان میں بھی اسی سولی پر لٹک رہا ہوں۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ مائی جان کے اس فیصلے نے میری زندگی کو ہلا کر نہیں رکھا ہوا؟ تم میری زندگی میں پہلی اور واحد لڑکی ہو جس کے لیے میری بہت خاص فیصلہ کنی ہیں زین! اتنے عرصے میں میں نے تمہارے بغیر کچھ سوچا ہی نہیں مگر اب جو کچھ بھی کرتا ہے تم ہی کو کرنا ہے۔"

"میں کیا کروں۔۔۔ نکاح کے وقت انکار کروں؟" وہ چڑھی۔  
"ہاں تم کر سکتی ہو۔ تمہارا مذہب تمہیں حق دیتا ہے۔" وہ فی الفور بولا۔  
"مذہب تو بہت سے حقوق دیتا ہے غضب تو یہ دنیا والے ہی کرتے ہیں۔"

اس نے سچی سے کہتے ہوئے رخسار سے آنسو چھڑکا۔  
"میری بس میں کچھ بھی نہیں ہے زین! اتنی جان نے خون کر کے میری ماں اور ماں سے بھگے کے داؤن جان سے بہت نقصان ہائیں کی ہیں۔ جو میری برداشت سے باہر ہیں۔ ایسی صورت میں میں انہیں تمہاری ماں بھیجے کارسک نہیں لے سکتا کیونکہ یہ بات تم ہی اچھی طرح جانتی ہو اور میں بھی کہ مائی جان وہی کریں گی جو وہ سوچ چکی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔۔۔ کامران سے شادی کر لوں چپ چاپ؟" اس کا دل کٹنے لگا۔  
"تم حق رکھتی ہو انکار کا زین! اسعد نے اسے یاو دلایا۔

"دن ہی کتنے رہ گئے ہیں اسعد! وہ بلیک گئی۔" انکار کا کیا ہے زین! وہ تو تم عین نکاح کے وقت بھی کر سکتی ہو۔ مگر بہتر ہے کہ ابھی کرو اور اس براؤر جاؤ۔ کم سے کم لڑکے والوں کی نکاح والے روز تو انسلٹ نہ ہو۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"آپ خود کیوں نہیں کچھ کرتے۔ میرے اندر اتنی بہت نہیں ہے۔" اسے اپنے ماں باپ کا سوچ کر ہی ڈر







ڈالے وہ اچھی لگ رہی تھی۔ ایسے میں اس کا خفا سا انداز۔ اسجد کو وہ پہلے سے متور ہو گئی۔ اس کی نگاہوں کی تپش نے زینبہ کو پساویدنے پر مجبور کر دیا۔ تو وہ مسکرا کر چائے ختم کرنے لگا۔ زینبہ نے چائے ختم کر کے کپ رکھا اور کرسی گھسکا کر اٹھنے لگی۔ اسجد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے روکا۔

”گلدھرب؟“

”میں لیٹ ہو رہی ہوں۔ آئی اور نازیہ آپنی مجھے ڈسٹور رہی ہوں گی۔ سالی گاؤا“

اسے یک لخت ہی دھیان آیا کہ کیا غضب ہونے والا ہے۔ اگر وہ اس کے گھر پہنچ گئیں تو۔۔۔

”ڈونٹ وری زینب! میرے ساتھ ہو تم۔“ وہ نرمی سے بولا۔

”کب تک؟“ زینبہ نے دکھ سے اسے دیکھا۔

”جانکے سب کو جواب مجھے دینا ہے آپ کا ڈیو سچر تو ہیں پر ختم ہو جائے گا۔“

”تیار بنا چاہئے تے رنگ گئی تھیں۔ سوٹ۔۔۔؟“

وہ لا بردائی سے بولا تو زینبہ نے لپٹا ہاتھ کھینچا اور کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔

اسجد نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں سے اہم نکال کے اس کے سامنے رکھی۔

وہ مستنفرانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کچھ یادیں۔۔۔“ وہ ہلکے سے مسکرایا۔

زینبہ نے اہم کھولی۔ پہلی ہی تصویر دیکھ کے اسے زوروں کا رونا آنے لگا۔

پہ تب کی تصویر میں تھیں جب وہ چوڑی گئی تھی اور اسجد انہیں باہر لے کر گیا تھا۔ نمبر اور پتہ احمد نے ان کی تصویریں بنائی تھیں۔ ڈسٹور تصویروں۔ جن میں صرف وہ اور اسجد تھے۔

کتنے پاس کتنے شاداں و فرحان۔ مستقبل کے اندیشوں سے بے خبر۔

آنسو اس کے رخساروں پر اتر آئے تھے۔ اسجد نے لب بچھنے

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ بھی کچھ نہیں کیا رہا تھا۔ یہ کاشی کی ٹوکی بننا نے جسے اس کی شریک سفر بنایا تھا کیسے آرام سے اس کے دل میں اتر گئی تھی اور اب۔۔۔ ابھی تو خدیجیوں کا سفر شروع ہوا تھا۔ ابھی تو ان کی تعمیریں ملنی تھیں۔ اور یہ جدائی۔۔۔ یہ تو نہیں نہ تھی دونوں کے بیچ۔ پاناما ہی پلیٹ گیا تھا۔

”تیرڈی چلو میرے ساتھ۔“ وہ دفعنا بولا۔

زینبہ نے اہم بند کر کے پرے کھسکا لی اور ہاتھوں سے چہرہ رگڑ کر گویا ٹھکست و ریچھت کے نشانات مٹانے کی سعی کی۔

”اس سے کیا ہو گا؟“

”سیاسی بناہ لے لو یا ر! تمہارا بھائی پہلے سے موجود ہے۔“ وہ مسکرایا تو زینبہ نے بھرانے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ کو ایسی حالت میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔“

”مجبور ہوں کیا کروں؟ آیا کی تھی ہو۔ ورنہ کتنا چلو کورٹ میں کر لیتے ہیں۔“ وہ نے لہجے سے بولا۔

”تھیں۔۔۔ مان تک فورٹ آئے تہ نہیں دینی چاہیے تھی۔ انکار کرتیں اور پھر اس نے فلی رہ تھیں۔ مگر تم بہت بد دل ہو زندگی کو اپنے موڈ سے گزارا کرتے ہیں اس کے موڈ سے نہیں۔“

”ہاں۔۔۔ سارا قصور میرا ہی ہے۔ مجھے شوق ہو رہا تھا کسی اور سے شادی کرنے کا۔“ وہ اس الزام تراشی پر غصے میں آ گئی۔

”اچھا چلو اٹھو۔ لاٹنگ ڈرائیو پہنچتے ہیں۔ پھر واپس بھی جانا ہے مجھے۔“

وہ بولا تو زینبہ نے ملا متی انداز میں کہا۔

”آپ یہاں ٹائم پاس کرنے آئے ہیں؟“

”بے وقوف۔ واپسی پہ تھیں گھر چھوڑوں گا۔“

تیا جان سے ملوں گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ زینبہ کو خوف نے گھیرا۔

”نہیں میں ان ہی کے ساتھ واپس جاتی ہوں۔ مگر میں قیامت بچ جائے گی۔“ اس نے مبیامل اسکرین

دقت دیکھا۔

”ابھی آجھا کھنہ ہی ہوا ہے۔ وہ شاید ہی آتی ہوں واپس۔“

”شٹ اپ۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔“ وہ آرام سے بولا۔ بل کے پیچھے ادا کیے اور اس کا ہاتھ تھام کر باہر لے آیا۔

”خدا کے لیے اسجد! میں ان لوگوں نے دیکھ لیا تو۔۔۔“

وہ خوف زدہ ہوئی۔

”اچھا ہے۔ رشتہ ٹوٹنے میں مزید آسانی ہوگی۔“ وہ لا بردائی سے آلتا سے اپنی گاڑی تک لے آیا۔

”یہ ہے وہ گاڑی جس کی فرٹ سیٹ پہ صرف تمہارا حق ہے۔“ وہ محبت سے کہہ رہا تھا۔ زینبہ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔

”اب کیا ہو گا اسجد! کیا ہم کبھی مل نہیں پائیں گے؟“

وہ زور پور ہو رہی تھی۔

”نہیں کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔“ کھینچتیں میں چلی کھنہ تے ہونے وہ شرارت سے بولا تو وہ چلا آئی۔

”آپ جس دیکھ کر کہتے ہیں اور میں گھر چھوڑ دوں مجھے۔“

”اتنی جلدی ابھی تو لاٹنگ ڈرائیو۔۔۔“ وہ معترض ہوا تو زینبہ نے دانت بیٹے۔

”بھلاؤ میں گئی آپ کی لاٹنگ ڈرائیو۔ آپ مجھے گھر چھوڑتے ہیں یا میں کرشمہ کر لوں؟“ وہ غصے سے لال نماز ہو گئی۔

”کم آن زینب! اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟“ پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالتے ہوئے وہ رساں سے بولا۔

”ہاں۔ میں کیوں غصہ کر رہی ہوں۔ مجھے تو خوشی سے پھولے نہیں ملنا چاہیے آخر کو پانچ سالہ منگنی ٹوٹی ہے میری اور اس سے کبھی بڑھ کے خرقہ تو اس بات پہ ہونا چاہیے کہ ساتھ ہی دو سرارشتہ بھی مل گیا اور اب شادی کی تیاریاں جاری ہیں۔“

بے حد ضبط سے کہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی تو اسجد کو اپنی شرارت پر افسوس ہوا۔

”آہم سو رہی۔“

”نہیں۔ معذرت تو مجھے کرنی چاہیے۔ میں ہی لے دو وقت تھی جو محض ذیلی کلاہی بات کو پوری زندگی پر محیط کر بیٹھی تھی۔ آپ کو تو کبھی مجھ میں انٹرنٹ تھا اور تہ اب سے۔ اچھا آئی ہوا کئی لیڈی ڈاکٹر سے شادی کر چکے تھے۔“

وہ تخی سے بولی تو اسے ہنسی آ گئی۔ پھر اس کے آثار تہ دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔

”کی کینڈا اب تم خود مزاحیہ باتیں کر رہی ہو۔ ہنسی ہی آئے گی نا۔“ انہیں نے طے کر لیا تھا کہ اب ایک لفظ بھی نہ بولے گی۔ گھر آنے تک وہ بت نہی دینا اسکرین کے پار دیکھتی رہی۔

اسجد کو یہ سانس بھر کے رہ گیا۔

کانہران کے گھر سے آئی گاڑی وہیں کھڑی تھی ڈرائیو سمیت۔

”آپ جائیں۔ وہ لوگ بھی گھر میں ہیں۔“ وہ بے عملت تھی بچے اتنی مبادا کوئی گھر سے نکل ہی نہ آئے۔

”تو میں بھی مل لیتا ہوں تا! پانچ سال پرانا منگیترا ہوں تمہارا۔“ اس نے ہانک دکائی تو اسے نرمی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی تہ ہوا گیت سے اندر داخل ہو گئی۔

اندر آنے تک اسجد کا ساتھ بھلا نہیں تھی صرف زبان پر جمل تو نکال ڈو گا اور تھا۔ اسے خبر تھی کہ عافیہ بیگم اس کا شکر کرنے والی ہیں۔

”میں تو نکال کر کر کے ٹھک گئی مگر اس کا سبیل آف ہے شاید۔“ عافیہ کی آواز کو ریڈیو کے سرے پر ہی اسے الٹ کر گئی۔ اسے خیال آیا انامیامل اس نے آف کر کے برس میں ڈال رکھا تھا وہ رک گئی۔

”خدا خیر کرے۔ شرکے حالات ویسے بھی ٹھیک نہیں۔“ کانہران کی امی کی آواز ہی سے پریشانی ٹپک رہی تھی۔

”میں نے تو جیتی جاگتی ہی آپ کے حوالے کی تھی۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ۔۔۔“ عافیہ بیگم اپنے لہجے کی تیزی پر کنٹرول نہیں کر پاتی تھیں۔

”کمال کرتی ہیں آئی! آپ کا خیال ہے کہ



خدا نخواستہ ہم نے اسے گھسیں اور دھراؤ دھر کر دیا ہے۔  
 تازیہ کو غصہ آیا۔  
 ”اتنی آسانی سے آپ بری لکڑے بھی نہیں ہو سکتیں ہم نے اسے آپ کے ساتھ بھیجا تھا اور اب صورت حال یہ ہے کہ اس کا نہیں اتنے پتہ نہیں اور موبائل بھی آفس ہے۔“ فارہ نے بھی اتنی کو مورد الزام ٹھہرایا تو وہ دونوں ہلٹی گئیں میں آگئیں۔ دونوں طرف سے تند و تیز مچکالوں کا تالوار جاری تھا۔  
 زینبہ کو منتظر عام پر آنے کے لیے اپنی تمام تر ہمت مجتمع کرنا پڑی۔ اس کے لاؤنج کے سرے پر نمودار ہوتے ہی ایک دم خاموشی چھا گئی۔  
 ”یہ لیں۔ آگئی آپ کی بیٹی!“ کامران کی اہی نے طنزاً کہا۔ عافیہ بیگم بے اختیار اس کی طرف بڑھیں۔  
 ”کہاں تھیں تم زینبہ! پتہ ہے سب کس قدر پریشان ہو رہے تھے۔“ وہ خاموش رہی۔ ایک دل ہی تھا جو با آواز بلند خوف سے دھک دھک کر رہا تھا۔  
 ”پوچھ لیں اس سے ہم نے تو اسے گاڑی ہی میں بیٹھنے کو بھیجا تھا۔“ تازیہ نے سنی سے کہا۔  
 ”کہاں تھیں تم۔۔۔؟“ فارہ نے سختی سے پوچھا۔ اسے بگڑتی صورت حال کا اور کب ہو رہا تھا۔  
 ”وہ۔۔۔ میں پلازہ سے نکلی تو مجھے گاڑی نظر ہی نہیں آئی۔ میں دلپس نی تو یہ لوگ بھی نہیں ملیں۔ میں کئی دیر ہاں ڈھونڈتی رہی۔“ تھوک نکتے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔  
 ”اور تمہارا موبائل۔۔۔؟“ عافیہ بیگم نے اس کی ہوا بیاں اڑتی شکل کو بغور دیکھا۔  
 ”وہ اس کی ہیشوری آف ہو گئی ہے۔ آئم سو ری۔“ وہ باری باری سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔  
 ”میرے خیال میں ہم چلتے ہیں۔ کلفتی دیر ہو گئی ہے۔“ تازیہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔  
 ”سو ری تازیہ، بیٹا! بس جذبات میں آکر میں کچھ الٹا سیدھا کر گئی۔“  
 عافیہ بیگم کو سہریا نے کا خیال آیا تھا۔  
 ”کچھ نہیں۔ آپ کلفتی کچھ الٹا سیدھا کر گئی ہیں۔“

تازیہ نے انہیں جتایا۔ تو وہ شرمندہ سی ہو گئیں۔  
 ”چوہدری ہی ایسی تھی بیٹا اور نہ ایسے رشتے تو ہاں ہی اعتماد کی بنیاد پر ہی طے ہوتے ہیں۔“ مختار بیگم کی نگاہ ساٹ چہرہ لیے کھڑی زینبہ پر تھی۔ اسے بات کچھ اور ہی لگ رہی تھی۔  
 ”بھر حال۔ اب کلفتی دیر ہو گئی ہے۔ ہم چلتے ہیں۔ پھر ملاقات ہوگی۔ ابھی تو ٹینشن سے ویسے بھی طبیعت بگڑی ہوئی ہے۔“  
 کامران کی اہی کا موڈ بھی کچھ خاص اچھا نہ تھا۔ عافیہ بیگم اور فارہ نے ان کے آگے بچھو کچھ نہیں مگر فی الحال وہ رگڑے کے موڈ میں قطعاً نہ تھیں۔ کھڑے کھڑے ہی رخصت ہوئیں۔  
 عافیہ بیگم نے کھری سانس بھری۔  
 ”کہاں گئی تھیں تم۔۔۔؟“ فارہ نے سختی انداز میں پوچھا تو عافیہ بیگم بھی جو تھیں۔  
 ”سیدھی گھر آ رہی ہوں۔ نہیں جانا ہوتا تو کیا واپس آتی؟“ اس نے الٹا پوچھا وہ اب مطمئن تھی۔  
 ”مجھے پتا تھا تمہاری بے وقوفی کوئی نہ کوئی رنگ ضرور دکھائے گی۔ اتنی بری گاڑی نظر نہیں آتی تھیں۔ لے کے ہماری بھی عزت خوار کر دی۔ میں تو ان پر چڑھ دوڑی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا اب کیا ہے گا۔ وہ دونوں تو بڑی ناراض لگی ہیں۔“  
 ”میرا تو کوئی قصور نہیں اور یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں کہ اس کا الٹو پٹو بنایا جائے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“  
 وہ لا روائی سے کھتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔  
 مگر مستقبل اس کے سامنے سولہ نشان کی مانند تھا۔ آج اسجد کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کے انداز میں وہ شدت وہ تڑپ مقفود تھی جو وجدانی کے خیال سے ہونی چاہیے تھی۔  
 اسے یاد آیا چند ہی راتوں کے دوران وہ کیسے مل جل اس کا خیال رکھتا تھا۔ اس کی باتیں اس کے انداز اس کی محبت۔  
 یونسی تو وہ زینبہ کے دل و دماغ میں نہیں سما گیا تھا۔

مگر اب۔۔۔؟ زینبہ کو روتا آ گیا۔  
 اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسجد کا رویہ تو ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ بیان سچی سولا گھولیا ہے۔ نکتے آرام سے اس نے کہہ دیا تھا کہ اب جو بھی کرنا ہے تم ہی کو کرنا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ زینبہ اس معاملے میں اتنی ہی بے بس ہے جتنا کہ وہ خود۔  
 اگلے دن عاصم چلا آیا۔  
 عافیہ بیگم یوں لاپرواہ تھیں جیسے کچھ معاملات ہوئے تھے نہ ہوں۔  
 ”آپ زینبی کے ساتھ اچھا نہیں کر رہیں۔“ وہ تو یوں بھی ہاں کے سامنے بول لیا کرتا تھا شادی کے بعد تو اور بھی منہ پیچتے ہو گیا تھا۔ بقول عافیہ بیگم کے۔  
 ”تم نے بہت اچھا کیا ہے سب کے ساتھ۔ جو اس کی حمایت کا بہت اچھا اٹھا کے چلے آئے ہو۔“ وہ تنگ کر بولیں۔  
 ”آپ کی ناراضی مجھ سے تھی۔ اسجد اور زینبہ کی زندگی بگڑ رہی ہیں۔“ عافیہ بیگم نے کہا۔  
 ”یہ سب تمہاری زانی کی پڑھائی پڑیاں ہیں۔ تمہیں تو لے ہی گئیں۔ بیٹی کو بھی اسی کھائی میں بیٹھنے دو۔“  
 وہ خنجر سے بولیں تو وہ چلا اٹھا۔  
 ”وہ بھی بھی آپ یہی کر رہی ہیں۔ جاننی کیا ہیں آپ کامران رضا اور اس کے خاندان کے بارے میں۔ بس خدا میں آکر جو پہلا رشتہ ملا اس کو ہاں کر کے زینبہ کو ٹھکانے لگانا چاہ رہی ہیں۔“  
 ”چاہاؤ مت۔ یہ تمہاری داؤی کا گھر نہیں ہے۔“ وہ ناگوار سی سے بولیں۔  
 ”ہو بھی نہیں سکتا۔ وہاں ہر کسی کو جائز بات کہنے کا حق ہے۔ چاہے سختی بھی اونچی آواز ہو۔“ وہ سختی سے بولا۔  
 ”تو چاہاؤ۔ رہو وہاں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔ یہاں کیا ڈراما کرنے آئے ہو۔“ انہوں نے۔

یہ زاری سے کہا۔  
 عاصم نے آسف سے ماں کو دیکھا۔  
 ساری عمر جنہوں نے فقط اپنے آپ ہی کو دیکھا تھا۔ اپنے جذبات و احساسات اور مفادات کو بے دھیروں کے جذبات پر فوقیت ہی تھی۔  
 وہ ان لوگوں میں سے تھیں جو زندگی کی اساطیر اپنی توجہات ہمیشہ سیٹ کر کے رکھتے ہیں اور کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ ان کے مہول کو او دھر او دھر کرے۔  
 مگر یہاں بے جان مہرے کی نہیں بلکہ زینبہ کی زندگی کا سوال تھا۔ جسے وہ کسی طور برباد نہیں ہونے دیتا چاہتا تھا۔  
 ”جس شخص کو آپ نے زینبی کے لیے پتا ہے وہ اچھی شہرت نہیں رکھتا۔ جلد بازی مت کریں۔ آپ اسجد سے اس کی شادی مت کریں مگر کم از کم اسے یوں کھائی میں تو نہ دیکھ لیں۔“ وہ بے حد سختی سے کہہ رہا تھا۔  
 عافیہ بیگم نے ہاتھ ہلا کر گویا کبھی اڑتی پھر محارت سے بولیں۔  
 ”جاننی ہوں میں۔ ارے سب کے سینوں پہ سائب لوٹ گئے ہوں۔ گے یوں چٹکیوں میں (انہوں نے چٹکی بجا کے دکھائی) اچھا رشتہ جو مل گیا۔ قراشا دیکھنے کی حسرت رکھنے والوں کے حنہ پر اتنی جوتی پڑی ہے۔“  
 ”لا حول ولا۔۔۔“ ان کے اتنے غور و تفتہ پر عاصم سر جھٹک کر رہ گیا۔ غرضیکہ لمبی بحث جھگڑا پختہ چلا گیا۔  
 کچھ بھی عافیہ بیگم کو اپنے ارادے سے ایک لمحہ بھی نہ ہلا سکا تھا۔  
 ”بہت پچھتاؤں گی آپ۔۔۔“  
 ”ارے چل ہاں کو دھمکا تا ہے خبیث! جو تو کر کے گیا ہے وہ بھی دیکھ چکی ہوں میں۔ باشت بھر کی چھو کیری لگھوں پہ نچا رہی ہے جیسے۔“ وہ ہر رشتہ بھولی ہوئی تھیں۔  
 ناچار عاصم کو واپس لوٹنا پڑا۔



اسجد کے گھر والوں نے شہیر احمد کی بہتیری منت ساجت کی مگر ان کو ہاں میں نہ بل سکے۔  
 پارٹ ویسے گئے وقت پر ہی ان کے دروازے پر آئی تھی۔



”اے بے بچہ تو کچھ کرنا کیوں نہیں۔ اتنے آرام سے تیار ہو رہا ہے جیسے بڑی خوشی کی شادی میں شرکت کے لیے جا رہا ہے۔“  
 داؤدی الماں کو اسجد کے بہو بن کے چوہین کو نہ بلانے پر براہِ رخ تھا۔ اب بھی اسے نوکے بغیر نہ رہ سکتی۔

”ہاں تو شادی کا مطلب ہی خوشی ہوتا ہے۔ جا کے پرسہ تو دینے سے رہے۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔  
 ”نہ تو ہاں جا سکے دل دکھانے سے کیا فائدہ۔“  
 وہ کسی طور شادی میں شریک ہونے کو راضی نہ تھیں۔ بھلا وہ زینہ کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر عافیہ بیگم یہاں بھی دل دکھانے سے باز نہ آئی تھیں۔ انہیں بعد اٹل و عیال شادی ہے۔ انوائٹ کیا کیا تھا اور اسجد نے اس دعوت نامے کا یوں خیر مقدم کیا تھا گویا اپنی ہی شادی کا کارڈ ہو۔ بلکہ پارٹ میں شرکت کے لیے اس نے اپنا شادی اور ساوٹ بھی بنوایا تھا۔

اس کی پراسرار سی سرگرمیاں گھر میں کسی کو ہنضم نہ ہو رہی تھیں۔ وہ اور عاصم گزشتہ ہفتے کئی ہی بار شہر سے باہر گئے تھے۔ خیال نہ کیا کرتے پھر سے تھے۔ سب گھر والوں کی شادی میں شرکت کا سختی سے آرڈر تھا۔ اوہ عاصم بھی مطمئن تھا۔ زینہ کی شادی کی خبر سن کر اس پر جو بے چینی طاری تھی اب اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا تھا۔ واللہ عالم۔



مقررہ روز وہ پارٹ کی آمد سے کافی پہلے پہنچ گئے۔ اسجد کے سبھانے پر سب ہی بڑی مروت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔  
 ”رشتہ ٹوٹنے سے رشتے تو ختم نہیں ہو گئے نا اور

جب میں نے ہر بات بھلا دی۔ چھوڑ دی ہے تو آپ بھی اس کی رضامندی راضی ہو جائیں۔“  
 اسجد نے کہا تھا اور کبھی نے دکھا وہ کتنے وقار اور برداشت کے ساتھ شادی میں شریک ہوا تھا۔ وائٹ ایسر اینڈ ڈیڈی پلیو پرنس سوٹ میں اس کی وجاہت قابل دید تھی۔ وہ سلام کر کے حسب عادت عافیہ بیگم کے آگے بیار لینے کے لیے جھکا تو ایک لمحے کو تو وہ بھی پچھتاووں میں گھرنے لگیں۔

ایک تو ڈاکٹر اور دوسرے لاکھوں میں ایک۔  
 چلو خیر۔ ڈاکٹر نہ سنی پر دوسری سنی۔ ہزاروں میں ایک تو کامران بھی ہے۔ انہوں نے جلد ہی خود کو اس پچھتاوے کی گرفت سے نکال لیا تھا۔ اندر ہی اندر وہ ان سب کی برداشت اور ہمت پر حیران بھی نہیں بنو انہوں نے اس شادی میں شرکت کر کے دکھائی تھی۔ دیکھنے والے دوست رشتہ دار بھی انگشت بدندان سے ایسی رشتہ داری بھانٹا تو ان لوگوں سے سیکھنا پڑے گا اور ادھر ادھر ہندسی کے فنکشن میں رو رو کر اپنی حالت خراب کر لینے والی زینہ پر دامن بستے کے بعد تو جیسے چپ طاری ہو گئی تھی۔  
 اس نے اسجد کے ہر خیال کو خدرا حافظ کندہ دیا تھا۔ بے ایمان بن کے کسی کے نکاح میں جانا اسے قبول نہ تھا۔

مگر دل تھا کہ ایک جب ہی طاری تھی ہمارے تھا کہ ہزاروں سوچیں اور کسی ایک پر متکثر رہنے کی سکت نہ تھی۔  
 وہ جو ابھی تک خدا سے لڑتی آ رہی تھی۔ اس سے شاک تھی عینا تھی اب من گئی۔

”میں تیری رضامندی راضی ہوئی میرے پروردگار تو نے بہتر کے بدلے بہتر کا وعدہ کیا ہے تو یقیناً“ میرے لیے اس نئی زندگی میں بہتری ہوگی۔ میں جس کے قائل ہوں مجھے اسی کا نصیب بنانے کا۔ مجھے تجھ سے کوئی شکوہ نہیں۔ ہر زمین اڑیاں رگڑنے کے لیے نہیں ہوتی کیونکہ ہر زمین کے نیچے آب زم زم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہر ضد کا انجام خواہش کا پورا ہونا نہیں ہوتا

یہ میں نے جان لیا ہے۔“

اور پھر بات آگئی۔ چدرہ میں لوگوں پر مشتعل مختصر سی پارٹ کا شہدائی شان طریقے سے استقبال کیا گیا تھا۔

اسجد نے نگاہوں ہی نگاہوں میں عاصم سے استفسار کیا تو وہ فوراً ”ہی سو بائل سے کوئی نمبر ملانے لگا اور پھر کچھ دیر پارٹ چیت کرنے کے بعد اسے اٹوٹھا دکھا کر سب سیٹ ہے کا اشارہ کیا تو وہ مطمئن سا اپنی پریشان خیالی کے ساتھ جا بیٹھا نمبر اور اجر بھی سوکوار سے بیٹھے تھے۔ بلکہ نمبر تو تھے وقت سے اپنی آنکھوں کی نمی خشک کر رہی تھی۔ اس کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ جا کے زینہ کو دامن رنای دیکھ لیں۔

”ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پائے۔“ وہ آرزو تھی اور پھر نکاح سے کچھ دیر پہلے وہ واقعہ رونما ہو گیا جو صرف کئی ہی روز ہی میں دیکھنے کو ملتا تھا۔

وہ لہنا بیٹی کامران رضاکا دوسری بیوی اپنے بھائیوں کی بھاریوں اور ماں کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ ساتھ میں اس کے دو بچے کامران کی ماں لیمن کے رنگ تیار لے آئی تھے۔ خود وہ لہنا میاں کی شکل دیکھنے والی تھی۔ تو نکاح کالی گلوچے۔ غرضیکہ سب کو خوب ہی ڈراما دیکھنے کو ملا اور اس کے بعد سب عورتوں نے مل کے دو لہنا کی جو تھکائی کی وہ مدتوں یاد رہے والی تھی۔

تیسری شادی کی خواہش میں آنے والا وہ لہنا اپنی دوسری بیوی اور اس کے گھر والوں سے مار کھا کر ان کے آگے لگ کے میرٹ ہال سے چلا گیا۔ عافیہ بیگم ششدر تھیں تو شہیر احمد پر بھی بجلی گری تھی۔ ان کی عزت مٹی میں مل گئی تھی۔

عافیہ بیگم کا سارا غور و ملاحظہ خدا نے ایک ہی لمحے میں مٹی میں ملا دیا تھا۔ ان کی بساط الٹ گئی تھی۔ ان کو شہادت دینے والی ذات ہمت طاقت ور تھی۔



قاریہ زور پتی رنگت لیے گرتی پڑتی براہین روم میں آئی وہ دامن زینہ کو چھو ڈکر ”دولہا“ دیکھنے لگی

# دین

فروری 2011ء کے شمارہ: دل زہری کی ایک جھلک

- ۱۔ اداکار ”عادل مراد“ سے شاہین زینہ کی ۲۲۸
- ۲۔ میرزا ”فیہوم خان“ کے بچے کے ساتھ
- ۳۔ گلوکار ”جواد احمد“ سے عازم نواز کی بیاہ
- ۴۔ ”بہا کا گھر بھارا لگے“ میں ”بیگم عاصم بشیر“ سے ان کے گھر کی باتیں
- ۵۔ ”یوقی کے شب آزاد ہیں تیرے“ قاریہ کے لیے دلچسپ سلسلہ
- ۶۔ ”ادر دلی“ فیملی عازم کا دلچسپ وارنل
- ۷۔ ”انسٹا گورہ گر“ فوریہ ہاسمین کا دلچسپ سلسلہ وارنل
- ۸۔ ”ہادیہ“ فیملی عازم کا دلچسپ عمل ہول
- ۹۔ ”عشق آتش“ سعیدہ راجہوت کا عمل ہول
- ۱۰۔ ”تیرے آسمان تلے“ فرحان اظفر کا دلچسپ عمل ہول
- ۱۱۔ ”میری حسرتوں کو شمار کر“ مصحفی افسانہ کا دلچسپ عمل ہول
- ۱۲۔ ”خوشبو کی بشارتیں“ آصفہ عنبرین قاضی کا دلچسپ عمل ہول
- ۱۳۔ ”گوشہ عافیت“ شگفتہ بھٹی کا دلچسپ ہائٹ
- ۱۴۔ ”عازم فیہوم خان، اازیہ جمال، میراگل، فوریہ احسان اور رضخا خالد کے گھانٹے اور مشتعل دلچسپ سلسلہ



تھی۔ سکراب والہیں آکر وہاں کے ٹھکانے کے اور  
لاٹوں کی تفصیل بتانے کی ہمت کہاں سے لاتی۔ زینبہ  
کے آگے روٹی توڑی۔

”دو لہا بھاگ گیا ہے زینبی! اور زینبہ نے اسے  
بول دیکھا جیسے بات سمجھی نہ ہو۔“

”کاہران شادی شدہ نکلا۔ بلکہ یہ تیسری شادی  
تھی۔ پہلی بیوی کو طلاق دے چکا ہے۔ دوسری بیوی  
اور اس کے گھر والے اسے مار پیٹ کے لے گئے  
ہیں۔“ زینبہ ساکت بیٹھی تھی۔

اس قدر ذلت... باہر کی دنیا میں جو تماشا ہوا تھا وہ  
اسی کے نام کا تھا۔

”یا خدا! کون سا گناہ؟ میرے رب۔ ایسی کڑی  
آزائش۔“ اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔  
فائدہ یہ اسے خود سے پلٹا کر رونے لگی۔

اس کے ساتھ واقعی بہت برا ہوا تھا۔



اس پورے ہل میں جب یہ تماشا ہوا تو فقط دو  
نفوس ایسے تھے جو پاؤں پٹارے کرسیوں پر براہمان  
سننے پہ بازو پھینے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔ اسجد اور  
عاصم۔ باقی سب ہی گھروالے ہی افغان و خیزاں معاملے  
کی تحقیق کے لیے بھاگے تھے۔

اور اب جبکہ شیر احمد کا اونچا شلہ مٹی میں رل رہا  
تھا تو انہیں سب سے پہلے گلے سے لگانے اور ان کی  
ہمت بندھانے والے چچا جان تھے۔

عافیہ بیگم تو شرم سے مر جانے کو تھیں۔ روئے چلی  
چار ہی تھیں۔ مٹی کی برادی کا خوب احساس ہو رہا تھا۔  
”ایک بار ات ہم بھی لائے ہیں شیر احمد! کیا بیٹی کو  
ہمارے ساتھ رخصت نہ کرو گے؟“

داہی اماں کو تو یوں بھی اپنی ہی کرنے کی عادت تھی  
’بیوے خورواں کے ساتھ بیٹے سے کہا تو وہ ماں سے  
لیٹ کر رو رہے۔“

عافیہ بیگم کا غور مزہ کے بل گرا تھا۔ کیا اس مارے  
تماشے کے دوران انہوں نے کئی رشتہ داروں کے

ہوٹوں پر دھبی مسکرائیں نہ دیکھی تھیں؟  
وہ کیونکر نہ موم ہو تھیں چچی جان کے سامنے بلکہ  
انہیں تو انہوں نے سینے سے لگا کر عزت دی۔

”جو تماشا ہو جکا سے بھول جاؤ۔ جو گھر کی باتیں ہیں  
انہیں باہر نکلنے کا موقع مت دو۔ بڑے فخر کے ساتھ بیٹی  
کو رخصت کرو۔“ داہی اماں نے نصیحت کی تو عافیہ بیگم  
کو پہلی بار ان کی نصیحت بری نہیں لگی۔



وہ بدگام تھی۔  
نکل خواں اور گواہ اندر تشریف لے آئے تھے۔  
”کون؟“

اور اسجد کا نام سن کر وہ ساکت رہ گئی۔ (تو قربانی کا بکرا ہے)

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایجاب  
قیل کے مراحل طے ہونے لگاں تھے۔ وہ سخط کیے  
اور اپنا آب اسجد کے نام کر دیا۔ مگر اس طرح سے۔  
”مجھے معاف کرو زینبی! میں بہت بری ام ہوں  
بلکہ بڑی عورت کو۔ سب ہی تو کسی بھی رشتے کو لٹھکے  
سے نہیں تباہ سکتی۔“

برصغیر کے وقت عافیہ بیگم اسے گلے سے لگا کے  
معافی مانگتے ہوئے رو پڑیں تو اس کے بھی ضبط کا ہر  
بندھن ٹوٹ گیا۔  
”اتنا اچھا فیصلہ ہو گیا اس کا مطلب یہی ہے کہ خدا  
نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔“ بھی تو کھالی میں گرنے  
سے بچا۔“

شیر احمد زندگی میں پہلی بار اتنے عاجز دکھائی دیے  
تھے۔  
”خدا کا شکر ہے یا ر! دوسری پائلٹ ہاٹھی پہنچ گئی میں  
تو ذرا ہی رہا تھا۔“

عاصم اسجد کے ساتھ چکا ہوا تھا۔  
”ابے سالے! میں تیرا بیٹا ہوں اگر آج میرا بیٹا  
نہ ہوتا تو۔“ وہ زور لب مسکرا رہا تھا۔

نمرو خوش تھی! امیر شاد اور قاسم کی خوشی کا کوئی  
تو ذرا ہی رہا تھا۔

تھکانے میں نہ تھا۔

یہ سب عاصم اور اسجد ہی کی انوسٹی گیشن اور پھر  
پلاننگ کا نتیجہ تھا۔ کاہران کی دوسری بیوی اور گھر  
داروں کو ان نامیہ لاکر سارا معاملہ ختم کرایا۔

وہ چاہتے تو ایک آدھ دن پہلے بھی کاہران کی پول  
کھول سکتے تھے مگر امید واثق تھی کہ عافیہ بیگم زینبہ  
کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈنے نکل پڑیں۔ کیونکہ  
چور چوری سے جانا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔

مگر یوں ان نام نہ وہ جانتے تھے اسجد ہی فرست  
پوٹا اس ہو گا اس لیے مجبوراً ”کاہران کی بیوی کو عین  
بارت والے دن کا نام دینا پڑا۔ جس کا کلاف عکس  
بہت خوب ہوا تھا۔“

تین گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد وہ لوگ ہنڈی  
پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے۔ عین اور تھکاؤ  
سے سب کا برا حال مگر خوشی ہر تکلیف پہ حاوی ہو  
رہی تھی۔

عاصم اور اس کی فیملی وہ گئے تھے اور گھروالوں  
کے ساتھ ہی اب وہ اس میں شرکت کے لیے آئے جو  
اوام و سکون کے ساتھ وہ دن بعد منعقد کیا جانا طے پایا  
تھا۔

عافیہ بیگم نے کھلے دل اور کھلے بازوؤں کے ساتھ  
بیٹے ہواد پوٹوں کا استقبال کیا تھا۔  
اسجد کمرے میں داخل ہوا۔ بیڈ لاک دیا کر پلٹا تو  
ٹھنک سا گیا۔ وہ بیڈ کی بجائے کرسی پر براہمان تھی۔  
اسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سرخ زرد تارنگے میں وہ بے حد حسین دلہن بنی تھی  
مگر بیٹے بازو لپیٹنے فضا اور ناراض۔  
وہ مسکرایا۔ مگر ادھر وہی تیوری پہل۔  
اسجد نے بازو اگڑے۔

مگر وہ کوئی فلم کی ہیروئن نہیں تھی کہ بھاگ کے  
بیٹے سے لگ جاتی اور وہی اینڈ ہو جاتا۔  
”یہ سب کیا ڈراما ہے؟“

وہ تلی سے بولی تو گہری سانس بھر کے اسجد نے بازو  
نیچے کیے اور چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے  
دھول بننے سے بچ گئے تھے۔

سائے آکر اٹھا ہوا۔  
”مجھے شک تھا کہ تم گولڈن ٹائٹ کو یونسی مناسخ کرو  
گی منکر کتیرا۔“  
”مجھے صرف سچ جانا ہے۔“ وہ بھند تھی۔  
”کئی بتاؤں۔؟ مجھے تمہارے ہونٹوں کا خم بہت  
اچھا لگا ہے۔“

وہ سرگوشی میں کہتا اس کی طرف جھکا تو وہ برا فروخت  
ہی بیٹھے تھی۔ اسجد نے اس کی جوڑیوں بھری کلائی تھام  
لی۔  
”یہ سب اللہ کی مرضی سے زینبی! تم میرے لیے اور  
میں تمہارے لیے تھا۔ پھر ہم کسی اور کا نصیب کیسے بن  
سکتے تھے۔ ہوں؟“ ہنسی سولت سے اسے یا سوں  
کے گھیرے میں لیتے ہوئے وہ زینبی سے بولا تو مارے  
تشرکے زینبہ کی آنکھیں بھرا آئیں۔  
”میں نے سوچا گھروالوں نے آپ کو قربانی کا بکرا بنا  
ڈالا۔“

”شاماش میں اسپیشل سوٹ بنوا کے اسی موقع کے  
لیے مین کے گیا تھا۔ مگر نہیں میرے متعلق کسی کوئی  
اچھا خیال آیا تھا یوں اب آنا۔“ وہ کراہا۔  
”اور اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتا تو پھر کیا ہوتا۔؟“ وہ  
اس کی ہانپوں کے گھیرے میں بھی پریشان تھی۔ اسجد  
نے اسے اسے سامنے کیا۔  
”مش۔“ اس کے ہونٹوں پہ انگشت شہادت  
رکھی۔

”یہ خدا کے فیصلے ہیں زینبی جان! اور وہ جو چاہتا ہے  
وہی ہی ہو جاتا ہے۔ اگر تم میرا نصیب نہ ہو تیں تو میں  
کوئی بھی حربہ آزما لیتا تا کاہر ہی رہتا۔“  
”تھنک گاڈ! وہ بھلی آنکھوں سمیت ہنس دی  
تو اسجد نے دلچسپی سے دھوپ چھانوں کا یہ منظر دیکھا۔  
”ہاں۔“ تھنکس ٹو گاڈ! اور اب تو۔۔؟“  
اس نے شرارت سے کہتے ہوئے بازو کھولے تو وہ  
شرما لی جاتی ہوئی اس کی ہانپوں میں آگئی۔  
وہ خدا کی رضا میں راضی ہوئی تو خدا نے اپنی رضا کو  
اس کی رضا بنا ڈالا تھا۔ اس کی چاہتوں کے پھول راہ کی  
دھول بننے سے بچ گئے تھے۔



# گلگلیہ

بہاب اڑا تا ایک کافی کاکم چند لمعے پہلے ہی بیوی  
 میز پر رکھ کر گئی تھی۔ دسمبر کے آخر سرد دن چل رہے  
 تھے۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا پرودے  
 سے اٹھیلیاں کرتا ہوا بلا اجازت اچانک ہی یوں  
 کمرے میں داخل ہوا جیسے آج سے ٹھیک پندرہ برس  
 پہلے مریم اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ خوب  
 صورت اور طرز اور مریم۔

دسمبر کی ایک بھینچ شام تھی جب اس نے مریم  
 سے اظہار محبت کیا تھا۔ پانسی میں کھڑے وہ دونوں  
 برستی بوندوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک  
 بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں  
 گھسائے اس نے بغور مریم کو دیکھا تھا۔ جس کی  
 رنگت آج اور بھی گلابی لگ رہی تھی۔ بھینچ گلابی شام  
 نے اس کی رنگت اور آنکھوں کی لولہ اور بھی روشن اور  
 چمکدار بنا دی تھی۔ سیدھی ہانگ بنا کر اس نے اپنے  
 بال سینے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں گلاب کی وہ بیگی کلی  
 تھی جو عرفان نے اسے کچھ دیر پہلے دی تھی۔ اپنی موسی  
 انگلیوں میں اس کلی کو تھامے وہ بڑی محبت سے بارش  
 کا نظارہ کر رہی تھی۔

”مریم! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“ عرفان  
 اچانک ہی بولا تھا۔  
 ”جانتی ہوں۔“ مریم نے چند لمحوں بعد بڑے  
 سکون سے جواب دیا تھا۔  
 ”تم کیسے... تمہیں کیسے معلوم؟“ وہ حیران ہوتے  
 ہوئے پکھلایا۔

”سرد ہوا لگا چھوٹی آتا تو جتنا بھر نصری لیتے ہوئے  
 کھڑکی کی طرف بڑھ گئی۔ کھڑکی بند کر کے اس نے پرودے  
 برابر کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ مگر جاتے جاتے وہ  
 عرفان کے لیے یادوں کا ایک درپچہ ضرور کھول گئی  
 تھی۔

عرفان کے ہرے بھائی عرفان کی شادی تھی اور مریم تو  
 جیسے گھر کی فردینی ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ لوگ  
 اس گھر میں کرائے وار ہیں ہر روز وہ اک سٹے روپ  
 میں جلوہ گر ہوتی اور عرفان کے دل کا قرار لوت لے  
 جاتی۔ دیکھنے والے دن بھی مو تیا رنگ میں ملبوس ہاوں



”تمہاری آنکھوں سے بے وقوف!“ مریم  
 کھٹکھٹاتی اور بارش کے جھلنگ اس کی ہنسی میں  
 بچتے گئی۔

”میری آنکھوں میں کیا ہے؟“ عرفان نے واقعی  
 بے وقوفوں کی طرح ہی اس سے سوال کیا تھا۔

”میری تصویر۔“ مریم نے مسکراتے ہوئے اپنی  
 ہتھیلی یا کتنی کی گول سے آگے کی اور اسے بارش کے  
 قطروں سے بھرنے لگی۔

”کچھ؟“ اس نے امید بھری نگاہوں سے مریم کو  
 دیکھا۔

”پھر یہ کہ اپنی تصویر ان آنکھوں میں جی مجھے اچھی  
 لگتی ہے۔ بدھو نہیں سکے۔“

مریم نے شرارت سے ہتھیلیوں کے گنڈرے میں  
 جمع پانی اس کے چہرے پر پھینکا اور اپنی ہنسی کے بسترنگ  
 بجاتی ہوئی جھاک کھڑی ہوئی۔

”آپ نے ابھی تک کافی نہیں ہی ٹھنڈی ہو گئی۔“  
 حناگ لہنے اندر آئی تو حیرانی سے کہنے لگی۔

عرفان چونک پڑا اور کھٹکھٹا ہوا۔

”ابھی لی لیتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی ہو کر بد مزہ ہو  
 جانے والی کافی کا گھونٹ بھرا۔

”لائیں یہ مجھے دے دیں۔ میں گرم کافی لا رہی  
 ہوں۔“ حنا نے بیٹھنے کی طرح ایک وفا شعار اور خیال

رکھنے والی بیوی کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ  
 سے کپ لے لیا۔

”یہ کھڑکی کیوں کھولی ہے۔ یوراکرہ ٹھنڈا ہو رہا



اور کھائیں میں پھول سجائے وہ چوتھے کے پھول کی  
 بائیں ہاں ہر دو ٹاکہ ہی تک رہی تھی۔  
 ان دنوں دل کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ دل تھا کہ کوئی  
 پرندہ جو آسمان کی اونچائیوں میں پرواز کر رہا تھا اپنی اسی  
 ترتیب میں اوپر ہی اوپر اڑتا چلا جا رہا تھا۔  
 آنکھیں کھیں کہ خوابوں کا ایک جہاں اپنے اندر  
 کہاویے ہر وقت جگمگ جگمگ کرتی رہتی تھیں۔ مریم  
 کو دیکھنے کے اور بات کرنے کے وہ بہانے ڈھونڈتا تھا۔  
 ان دنوں ہر صبح بڑی خوب صورت اور ہر شام بے حد  
 حسین لگتی تھی۔ بس ایک ہی مشغلہ تھا خواب دیکھنا  
 اور ان خوابوں کو مریم کو سنانا جنہیں اپنی خوب صورت  
 مسکراہٹ کے ساتھ وہ بڑی محبت سے سنتی تھی۔  
 صنا کافی کاگ ویدارہ لے آئی تھی۔ عفتان کے  
 خیالات کی روٹھ گئی۔  
 "اب نمٹتی دست کیجئے گا!" اس نے تسبیہ کی۔  
 "ہوں!" عفتان نے گرم گرم کافی کاگ ہونٹوں  
 سے اگایا۔  
 "یہ عورت بھی کیا مخلوق ہے؟" وہ سوچتے لگا۔  
 اپنی بیوی سے اس کے تعلقات بس ہر سری ہی  
 تھے۔ جیسے زمین کے ڈبے میں بیٹھے دو ایسی مسافر جو  
 راستے کی مصافحت کو پانے کے لیے اور وقت گزارنے  
 کے لیے ایک دوسرے سے وقتی دوستانہ قائم کر لیتے  
 ہیں اور منزل آتے ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ عفتان کا  
 رویہ بیوی کے ساتھ برا نہیں تھا مگر مثالی تھی نہیں تھا۔  
 اس کی طرف سے وہ محبت اور گرجوشی مستعد بھی جو  
 اس رشتے کی متقاضی تھی۔ بس یہ ہے کہ بیوی بچوں  
 کی ضرورتیں وہ ساری پوری کرتا تھا اور شاید محبت  
 بیوی کی ضرورت نہیں سمجھتی تھی وہ پوری کرتا  
 ہے چاری جتا ہی ان آن دیکھے اور غیر محسوس فاصلوں اور  
 سرد مہری کو پانے کی کوششوں میں لگی رہتی۔ کبھی کبھی  
 عفتان کو خود پر تداست بھی ہوتی ایک بے لوث اور  
 بے غرض محبت پر اس عورت کا حق نہ تھا جو اس کے تن  
 بچوں کی ماں اور اس کی بیوی تھی بہترین ماں اور بہترین  
 بیوی مگر وہ اس دل کا کیا کرنا جو اب بھی مریم کے لیے ہی

وہ وقت تھا اس نے ایک گرمی سانس لی اور دروازہ کھولی  
 کر ڈانڑی باہر نکالی۔  
 اسی محبت بھریے دنوں میں جب 12 ویں صبح کی شب  
 آئی۔ عفتان کی نوکری نئی نئی لگی تھی اور پورے رات کی  
 ڈیوٹی کو شش کے باوجود بھی وہ مریم کو نئے سال کی  
 مبارکباد نہ دے سکا۔ صبح ڈیوٹی سے واپس آیا تب  
 بھی مریم سے اکیسے ملے کا موقع نہیں ملا دن میں وہ تھا کا  
 بار اس کو گیا شام میں پھر ڈیوٹی۔ 22 جنوری کی صبح جیسے ہی  
 وہ گیٹ سے اندر داخل ہوا بیڑھیوں کے پاس مریم اس  
 کی منتظر تھی۔  
 "یہ تمہارے لیے ہے۔" مریم نے ایک گفٹ  
 پیک اس کی طرف بڑھایا اور جلدی سے لاندہرتی گئی۔  
 عفتان بیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آیا اور سیدھا  
 اپنے کمرے میں آگیا۔ ای ابھی سو رہی تھیں اور اوپر  
 بھائی جان ڈیوٹی پر جا چکے تھے۔  
 عفتان نے پیکٹ کھولا نئے سال کی ایک خوب  
 صورت ہی ڈانڑی۔  
 اس نے صفحہ کھولا پینے صفحے پر لکھا تھا۔  
 "اور اس گرمی پہلی ہی جنوری اب کے۔"  
 آج اتنے سالوں بعد بھی وہ ان ہی لفظوں کے حصار  
 میں تھا "اسی محبت بھرے شکوے نے اسے اپنے  
 گھیرے میں لیا ہوا تھا جس کا نظارہ مریم نے اس سے  
 کیا تھا۔  
 عفتان بنا پیکٹ جھکے ان ہی لفظوں کو پڑھ رہا تھا۔  
 دسمبر کے آخری دنوں میں اس کی یادوں کی لوبست تیز ہو  
 جاتی تھی۔  
 "جانے وہ کہاں ہوگی؟ کیسی ہوگی؟ کس حال میں  
 ہوگی؟" عفتان تلخ کافی کے گھونٹ بھرتا رہا اور سوچتا  
 رہا۔  
 اس کی سر توڑ کوششوں کے باوجود بھی مریم سے اس  
 کی شادی نہ ہو سکی "ہی بالکل راضی نہیں تھیں۔"  
 "چھپھوری ہے اور خاندان بھی بہت نہیں کیسا ہے۔  
 مجھے تو اچھے نہیں لگتے یہ لوگ۔ بس ٹھیک ہیں  
 مگر اے دار ہیں اس سے آگے رشتے داریاں بڑھانے

کی ضرورت نہیں ہے۔"  
 ای نے عفتان کی خواہش سن کر تبصرہ کیا تھا "بھریے  
 کی خند سے مجبور ہو کر انہوں نے مریم کے لیے رشتہ  
 دیا مگر وہاں سے انکار ہو گیا وہ لوگ براہوری سے باہر  
 رشتہ نہیں کرتے تھے اور ویسے بھی مریم کا رشتہ اس  
 کے خاندان میں ہی ہو رہا تھا۔ پھر چند دنوں میں ہی  
 انہوں نے گھر بھی خالی کر دیا اور کھس اور چلے گئے۔  
 عفتان کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی پہلی محبت کا نشہ اور  
 اس کی ناکامی کا داغ بڑا کراہو بنا ہے۔ مہینوں لگے اس کو  
 سنبھلتے سنبھلتے "مریم کو ڈھونڈنے اور پانے کی تمام تر  
 کوششیں ناظم ہو گئیں اور اس کی زندگی میں حنا آ  
 گئی۔ زندگی میں تو آئی مگر دل میں؟ دل میں تو وہی  
 دس دن چل بڑی شان سے براہمنان تھی۔ بیٹے ہونے  
 لہجوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس کو اس طرح یاد  
 تھیں جیسے کل ہی کی بات ہو۔ عفتان نے جب پہلی بار  
 اسے سرخ دیکھا گلاب دیا اور کہا کہ یہ محبت کی علامت  
 ہے۔ اس وقت مریم کا چہرہ خود ایک گھلا گلاب بن گیا  
 تھا۔ اس کے روتے ہوئے اور اسی گرمی پہلیں چھ  
 گھنٹے لیا ہٹھ شریا سا وہ سب کچھ آج بھی اس کے دل  
 پر نقش تھا۔ آٹھ کے پرے پر اب بھی وہ منتظر رہا ہی  
 مانہ تھا۔  
 "منہرہ خالہ کے گھر جانا ہے اگلے ہفتے۔" حنانے  
 کھڑے کھڑے اسے یاد دلایا۔  
 "ہاں!" عفتان نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا۔  
 "کیا دیتا ہے؟" حنانے مطلب سے سختی رقم؟ حنانے  
 پوچھا۔ عفتان کے خالہ زاد بھائی کی شادی تھی۔  
 "جو بھی دے دو یا راتہ ساری مرضی۔" عفتان اک دم  
 ہی کچھ بے زار سا ہو گیا ایک تو دسمبر کی ان اخیر سرد  
 راتوں میں درد کی چیخ میں کچھ اور اضافہ ہو جانا مگر  
 اس دور میں ایک میٹھی میٹھی سی کسک بھی تھی۔  
 "اچھا!" حنانے ایک گرمی سانس لی۔ وہ اتنے  
 سوالوں میں شوہر کے مزاج کے کبھی موصوں سے آشنا  
 ہو گئی تھی "عفتان کی خاموشی اور بے زاری محسوس کر  
 کے وہ کمرے سے باہر نکلی۔

121 دسمبر کی رات پیش کی طرح تقریباً "ساری دنیا  
 میں ہی" لگا نہ خیر صحت۔ ایک دن نئے سال کی آمد کا جشن  
 منا رہی تھی اور عفتان آج کی رات یادوں کے چراغ  
 جلانے بیٹھا تھا۔ ان چراغوں کی لو آج اور دنوں کی  
 نسبت بہت بلند تھی کہ پرانے سال کی گزری ساعتیں  
 اور آنے والے نئے سال کے بھی لمحات تھے جب مریم  
 اس کی زندگی سے نکل کے اسے درد کے ایک نئے  
 جہاں میں چھوڑ گئی تھی وہ ہر سال کی طرح اس سال کی  
 اخیر رات میں بھی انہی لمحوں میں کھویا رہنا چاہتا تھا مگر  
 اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنی ایک الگ دنیا میں رہنا  
 بہت مشکل ہوتا ہے۔ عفتان آج کے دن پیش کی طرح  
 مریم کی محبت اور یادوں کا میلہ نہیں سجا سکتا تھا، آج  
 منہرہ خالہ کے بیٹے کی بارات تھی اور کل سے سال کے  
 پہلے دن لیسہ تھا "دونوں تقاریب میں عفتان کی شرکت  
 معطل و معیال لازمی تھی۔  
 "ٹائی تو بڑی خوب صورت ہے۔" ریشمی چوڑیوں  
 بھراریہم سا ہاتھ اس کی ٹائی کو تھاٹھے ہو تھا۔  
 "بانڈنٹے والے بھی تو خوب صورت ہیں۔" عفتان  
 کے لبوں پر شراہٹ چمکی۔  
 "دینے والے زیادہ خوب صورت ہیں۔" مریم کے  
 انداز میں قافز تھا۔ یہ ٹائی اسی نے عفتان کو گفٹ کی  
 تھی۔  
 عفتان کے پاس اور باقی چیزیں اور یادوں کی طرح یہ  
 ٹائی بھی آج تک محفوظ تھی جب کبھی وہ یہ ٹائی لگاتا وہ  
 کول کس سے اپنے گھیرے میں لے لیتا، آج بھی یہ  
 ٹائی استعمال کرتے ہوئے اسے شہادت کے ساتھ مریم  
 یاد آتی تھی۔  
 شادی کی تقریب ویسی ہی تھی جیسی کہ عموماً یہ  
 تقاریب ہوتی ہیں۔ رنگ "روشنی" خوشبو اور  
 مسکرائیں۔ عفتان بھی ایک بنائو مسکراہٹ کے  
 ساتھ محفل میں شریک تھا "کم سے کم آج کی رات تو وہ  
 اپنی اور مریم کی یادوں کے ساتھ اکیلا ہی رہنا چاہتا تھا مگر  
 اس وقت تو دنیا داری بھائی تھی وہ یوں ہی بے مقصد کھڑا  
 تھا جب کہ کا بڑھاپی سن کر اسے اختیار ہوا



## باہنمہ برقرار صحت پائیدار



## نیو کارمینا

اب جدید سیلینڈر سپیک میں  
زیادہ موثر، زیادہ مفید

75  
قری



نیاتی اجزا اور مجرب ترکیبات زیادہ محفوظ، آپ کو ملے بہترین ذائقہ اور افادیت  
ساہا سال سے آزمودہ نئی کارمینا قبض، جھین، سینے کی جلن، ہیٹ کے روکنے یا اتنی ہی کیفیت کو  
لدوری رفع کرنے میں جال رکھتی ہے۔

نیو کارمینا ہمیشہ گھر میں رکھیے

ہیڈلارڈ

عقلمند نہیں کھڑے کھڑے حرمت سے سوچ رہا تھا۔  
”کیا پچھلے پندرہ برسوں سے میں واقعی محبت کا شکار  
تھا یا وہ سب میرے واہم و گمان تھے۔“ وہ اپنے خوابوں  
کے قلعے کو بڑی بے بسی کے ساتھ مسمار ہونا دیکھ رہا  
تھا۔

”تو تم نے کیا سوچا تھا؟ مریم کبھی زندگی میں ملی تو ان  
یادوں اور محبت کا ایسا نہ کرنے کی جو کرب اور  
پے چنتیاں تمہاری زندگی کا حصہ رہیں انہیں خود اپنے  
خوالے سے بھی بیان کرے گی؟“

اس کے اندر سے کوئی ٹپکے سے بولا اور پہلی بار اس  
آواز کے جواب میں اس کا دل خاموش رہا۔  
عمر کا ایک خوب صورت اور طویل حصہ اس نے  
ایک سراب کے پیچھے بھاگنے میں ضائع کر دیا تھا۔  
”کیا سطلانی کی کوئی صورت ہے؟“ حسرت زدہ دل  
پیشانی سے کہہ رہا تھا۔

”آپ کھانا نہیں کھا رہے؟“ وہ ارد گرد سے بے خبر  
اپنی سوچوں میں اٹھا ہوا تھا جب اس کی بیوی قریب آ  
کر اس سے مخاطب ہوئی۔

اور شام بڑھنے ہی سمی بھٹکا ہوا سا سفر گھر پہنچ جائے  
تو اس کی ظہارت اور کلینت کی خوشی کا اندازہ کون لگا  
سکتا ہے۔

”آپ بیٹھ جائیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی  
ہوں۔“

جتنا ہمیشہ سے ہی اس کا بے حد خیال رکھتی تھی۔  
عقلمند اسے جانتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو اس کے دل کے  
قریب آ رہی تھی اور دل کے پچھلے کلینت نے اپنا اسباب  
سمیٹ کر گھر خالی کرنے کی تیاریاں شروع کر دی  
تھیں۔ آخر وہ اس گھر کی مستقل کلینت تو تھی نہیں بلکہ  
کراتے واری تھی۔

مریم یاد آئی۔ کھلے شگفتے جیسی ہنسی خوشبودار ہنس  
کب تک اس کے کانوں میں دس گھولتی تھی۔  
”کاش وہ مجھے مل جاتی۔“ ایک حسرت بھری آہ دل  
کی گراؤیوں سے نکلی تھی اور شاید وقت قبولیت تھا کہ  
قریب سے گزرتے ایک چہرے میں اسے مریم کی  
بے پناہ شبابت محسوس ہوئی اور خود کو روکنے روکنے جی  
اس کے لبوں سے بے اختیار وہی نام نکلا۔  
”مریم!“

گزرنے والی ہستی اک دم چونک کر اسے دیکھنے  
لگی۔

”تم؟“ آپ مریم ہیں نا؟“ عقلمند کی زبان لڑکھڑا  
گئی۔  
”جی ہاں، مگر آپ۔۔۔؟“ وہ شناسا چہرہ تذبذب کا  
شکار نظر آیا۔

مریم مریم سوال تھی اور عقلمند جسم حرمت۔  
”مجھے پتا نہیں؟“ اس کے لیے میں سوال نہیں  
دیکھ اور بے چینی تھی۔

”میں عقلمند ہوں۔“ مریم کی اجنبیت بھری  
خاموشی پر وہ تڑپ کر بولا تھا۔

”عقلمند!“ مریم نے اس کا نام پھر لیا۔

”آپ شاید ہمارے کوئی سے مالک مکان رہے  
ہوں گے۔ دراصل ہم نے کراتے کے مکانوں میں ہی  
عمر گزار ہی ہے، بہت عرصے بعد کوئی نئے والا اک دم  
سے ذہن میں نہیں آتا۔“ مریم بے حد تکلف سے  
بول رہی تھی اور عقلمند بے حد تکلیف سے اسے دیکھ  
رہا تھا۔

”اچھا، میں پتلوں اور اصل میں اپنے بیٹے کے لیے  
پانی لینے آئی تھی۔“ وہ اسی طرح اجنبیت چہرے پر  
سجائے آگے بڑھ گئی۔

شہ جی بھر کے دیکھا نہ کچھ بات کی  
بڑی آرزو تھی ملاقات کی  
”مجھے اس ملاقات کی اتنی خواہش کیوں تھی میں  
کیا کتنا چاہتا تھا کیا کتنا چاہتا تھا؟“





## محبت سونے کی پتلی کی طرح

نکلے نہیں رہتا۔

اس لمحے سے بھی ایسا لگ رہا تھا وہ عالم برزخ میں  
لٹکا دی گئی ہے۔ ایسی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے اپنے  
دل کے اندر سے ایک جذبہ کھوج نکالا تھا اور بہت  
سارے خواب دیکھے تھے اور ایسی اچانک سارے  
خواب جیسے کسی زلزلے نے ہلا کر رکھ دیے تھے زندگی  
جب ہاتھوں سے سرک رہی ہو تو تیار چلتا ہے کیا کیا کچھ  
ہے جو ہم چھوڑے جا رہے ہیں۔ کسی کی باتیں آگاہی  
شائیں خواب بھری آنکھیں اور کسی کے ساتھ  
گزارے جانے والے ہر لمحے کی حسرت اور زندگی کو ان  
ساری باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں تمہارے ساتھ بہت سا راز

ہر شخص میں سمجھتا ہے اگر زندگی کو کوئی چیز بکسر  
بدل سکتی ہے تو وہ زندگی ہے کیونکہ زندگی ہر لمحہ ارتقاء  
پذیر رہتی ہے مگر جب ہم زندگی جینا شروع کرتے ہیں تو  
بہتیں پت چلتا ہے موت بھی ایک چیز ہے جو زندگی کو  
سب سے زیادہ بدل سکتی ہے اپنی تیزی سے اور اتنے  
تھی انداز میں کہ انسان چاہ کر بھی پہلے جیسا نہیں  
ہو سکتا اور پھر کچھ اور وقت گزرتا ہے تو اس کے دل پر  
الہام اترتا ہے کہ زندگی کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے اور وہ  
ہے عالم برزخ جس میں انسان اٹک جاتے تو نہ جینے  
والوں کے ساتھ ہوتا ہے نہ مرنے والوں کے ساتھ نہ مگر  
یہ عالم برزخ کی کیفیت بھی زندگی کو ہر کونے سے بدل  
ڈالتی ہے اور زندگی کا یہ واژہ کہیں سے بھی کہیں تک

منجھلنا دل





وقت گزاروں۔" یہ جملہ گل ہی تو مولس شہباز نے اس کی ساعتوں میں اندھا تھا اور آج اتنا اچھا لگا۔  
"میرے مولانا رحم۔" اس نے آنکھیں خوف سے بند کر کے کھولی تھیں اور اپنے پلکیا تے جو جو کو اس منظر میں بچھے شامل کیا تھا۔

"نام! مجھے برین ٹیومور ہے۔" پانچ فٹ گیارہ انچ کا تناسب وجود بڑی بڑی گہری آنکھیں مناسب ہونٹ اور ان پر ہلکی ہلکی موچھیں۔ یہ بیچ جھوٹ جیسا تھا اور اس نے سربار سوچا تھا وہ جھوٹ بول رہا ہے بھلا اتنے ایکٹو بندے کو ایسی بیماری کیسے ہو سکتی ہے یہ شخص جسے

میں نے اس اجنبی ماحول میں چکے چکے اپنائیت سے زندگی ایک بار پھر سے جینا سکھائی تھی وہ خود کیسے زندگی سے دور جانے کے قسے گھڑ رہا تھا۔

"اما! آپ نے سنا۔ مجھے کیا بیماری ہے۔" سامیہ حسام الدین دھڑکتے دل کے ساتھ ایپران سے ہاتھ صاف کرتی اس گھر کے باہر سے باہر آئی تھی وہ دیکھنا چاہتی تھی سرد مزاج سہمی اس کی مہمانی کا اس خبر پر کیا۔  
"میں ہو سکتا تھا اور اس کی مہمانی اسی محبت سے چھین دیکھ رہی تھیں وہ ان کے نوٹوں وی کے درمیان آ گیا تھا۔

"تین دن بعد میرا آپریشن ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے میرے زندہ رہنے کا صرف دس فیصد چانس ہے۔" مہمانی زہنب نے پہلی بار نظریں اٹھا کر دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے ان کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔

"تمہیں ایسا کیا لگا کہ تم میرے لیے زندہ بھی ہو۔" ایسا جملہ مولس شہباز کا رنگ یک دم سے پیلا پڑ گیا تھا۔  
"مام! آپ کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ہوتی۔؟"  
سامیہ حسام الدین سرک کر اس کے قریب آئی تھی اسے لگ رہا تھا وہ اس وقت بالکل اکیلا پڑ گیا ہے اور مہمانی نے ہی ہنر کر کے اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"اس سوال کا تم مجھ سے بہتر جواب دے سکتے ہو کہ مجھے تم سے محبت کیوں نہیں ہو سکتی۔"  
"میں نہیں جان سکتا مام! میں نے تو ہمیشہ ہر چیز سے

آپ کو آہستہ ہی ہے جو آپ چاہتی تھیں میں نے ہمیشہ وہی کیا پھر کیوں نہیں ہوا اول آپ کا میرے حق میں۔"

"میں ظفر کی موت کبھی نہیں بھول سکتی۔"  
"وہ صرف حادثہ تھا مام! وہ بے قراری سے مہمانی زہنب کے قریب ہو گیا۔

"وہ حادثہ نہیں تمہاری بے وقوفی تھی اور تمہاری بے وقوفی کی سزا تمہاری ساری زندگی پر محیط ہو گئی ہے میرے سارے خواب بکھر کر رہ گئے۔"

"مام۔۔۔۔۔" وہ شخص بے قراری سے مہمانی زہنب کو تک رہا تھا۔

"تم مجھے مت ستاؤ اور جاؤ اپنے دوستوں کے پاس جو تمہیں ہر چیز سے زیادہ عزیز ہیں۔"

وہ جو صوفے کے پاس بے چارگی سے بیٹھا تھا ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ گھر سے نکلی تھی اور وہ اپنے سرور کی وجہ سے بے حال بیٹھ رہا تھا۔  
"یہ سب کیسے ہوا؟"

"جب انسان زندگی کے میدان میں اترتا ہے تو صرف رشتے اور محبت ہی اس کا تھیلہ اور ہمت ہوتے ہیں مگر یہ میرے پاس کبھی نہیں تھے میں اپنے وجود کی جنگ اتنے برس تک لڑ سکی ہی ہمت تھا سامیہ۔"

"آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے آپ بارگتے ہیں۔"  
اس نے پورے چار سال چھ ماہ بعد اس شخص کے کندھے پر ہاتھ دھر رکھا۔

اور اس نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا "پلیز سامیہ! ایسا مت کرو میں اکیلا جانا چاہتا ہوں مجھے اپنی یادیں دے کر در ماندہ مت کرو۔"

"سامیہ حسام الدین، مولس شہباز کو دیکھتی رہ گئی تھی اس نے تو صرف احساس دوستی سے اسے بکرا تھا اس کے لیے میں یہ محبت کہاں سے لیت آئی تھی یہ

محبت جسے وہ گہرے پائوں میں دھکیل چکی تھی اور اسے لگا تھا اگر زندگی میں پھر کبھی کسی نے پوچھا "محبت کیا ہے" تو شاید وہ صرف خاموشی کے سوا کچھ نہ کہہ سکتے گی مگر یہ محبت اس کی یادوں سے برقی لہریں کر اس کے وجود میں کیوں سرایت کر رہی تھی۔

کیا واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی؟  
"آپ کی دوا کہاں ہے؟" وہ اس کے پیڑ کی سائینڈ بورڈوں میں اس کی دوا ڈھونڈ رہی تھی۔

"یہ لیبل نہیں بہت باہی پوٹھسی کے ہیں۔ ایک گلاس دودھ لادو گی؟" اس نے اپنے کمرے کی الماری سے اپنی دوا میں نکالی تھیں اور وہ آندھیں طوفان کی طرح جان میں جا کر دودھ گرم کرنے لگی تھی۔

کھولانے کے بعد ٹھنڈا کرنا کار و شوار تھا اسے وہ دن یا دو آگے تھے جب بھائی جی جی چھ ماہ کے بچے کو پھوڑ کر جا ب پر جانے لگی تھیں اور اس بچے کو سنبھالنے کے لیے وہ اسی طرح دودھ کو گرم کر کے ٹھنڈا کرتی تھی وہ ایک کپ سے گرم دودھ اوجھلی سے دوسرے کپ میں ڈال رہی تھی۔

"سامیہ۔" اس کی کراہتی آواز پر دودھ دوسرے کپ میں ڈالتے ہوئے اس کا ہاتھ ہلک گیا تھا ہاتھ کی اور برقی جیلد سرخ ہو گئی تھی اس نے پروا کے بغیر دودھ کپ میں ڈالا تھا اور تیزی سے اس کے کمرے میں چلی گئی۔

وہ اب لیٹا ہوا تھا اس نے کپ کی گرمانش سے اندازہ کیا دودھ اب بھی گرم تھا۔

"آپ اسے پی لیں گے؟" مولس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

یہ دقت اٹھا تھا پھر لیبلٹ اسی دودھ سے لگی تھیں۔

"سوری! میں نے بہت کوشش کی مگر اتنی جلدی ٹھنڈا نہیں کر پائی اسے۔"

وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ "کمال ہے سامیہ! مجھے لوگ اسیکو ز میں دیتے نظر انداز کرنے کے لیے بے

عزت کرنے کے لیے اور آپ صرف دودھ ٹھنڈا نہ کرانے پر محذرت کرتے بیٹھ گئیں۔ اور ہر دیکھے میری ساری روح آبلہ اور آبلہ ہے میں زندگی کو نہیں کر رہا ہوں تا تو یہ ہلکی سی جلن گرمانش میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"آپ کو یہ کس بے وقوف نے کہا کہ آپ کو یہ بیماری ہے۔" اس نے جان کر ٹام نہیں لیا ساری بیماری کی سنگین جیسے خود پینے کی کوشش کی اور وہ ہنس پڑا۔

"کیا اسے پتا ہے وہ قہرہ لگا کر ہنستے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے۔"

اس نے سوچا اور وہ کراہ کر پھر سے بچے پر مر ڈال کر لٹ گیا تھا۔

"جو چیز استعمال نہیں ہوگی اسے فنگس تو گنگے گانا بقول بابا کے مجھے زندگی گزارنے کی سمجھ نہیں میں ہمیشہ ایڈریٹ جسم کی فیلڈنگ کی بات کرتا ہوں مجھے اونوں ہاتھوں سے زندگی کمانی نہیں آتی تو اچھا ہے میرے ساتھ جو ہوا سو ہوا کھانے چاہیے تھا۔

"آپ اتنے فضول کیسے سوچتے ہیں۔؟"  
اس کے ہونٹ ہلکا سا مسکرائے تھے "دیکھ لیجئے آپ کو بھی ایک شکایت ہوتی گئی مجھ سے۔"

"یہ شکایت نہیں بہت معصوم سادہ فاع ہے آپ کی ذات کے لیے میرا۔"

"یہ آپ کو میری ذات کیوں یاد آئی چار سال چھ ماہ میں شاید پہلی بار اتنی بے تکلفی سے ہم بات کر رہے ہیں۔"

"وہ بس ویسے ہی۔" اس نے سر جھکا لیا تھا۔

اور مولس شہباز نے دھڑلے سے کہا تھا۔  
"آپ کو لگتا ہو گا۔ اسے اس کے گھر والے منہ

نہیں لگاتے تو آپ کو کیا ضرورت ہے توجہ صرف کرنے کی شاید میں ٹھیک طرح سے آپ کی جگہ بھی تو نہیں بنا سکا یہاں۔" پر ملا شکوہ تھا اور شاید مولس شہباز نے پہلی بار کسی سے شکوہ کیا تھا اتنا اپنا بن کر۔



”کیا واقعی آپ کو لگا کہ میں نے آپ کو قاتل توجہ نہیں دیا۔“ اس نے پتا نہیں کیوں جو اب ٹکڑہ کیا اتنے توں کا لیل وہ سمیٹ نہیں پائی تھی اس خبر کے آگے اور مونس اس کی کیفیت پر مسکراتے لگا تھا۔  
 ”چلیں میری تیاری کسی کام تو آئی۔ آپ کے شکوے گلے اور مجھ سے ناراضی ختم ہوئی مجھے بھی احساس ہوا کہ کوئی تو مجھ سے دل سے روئے گا۔“  
 ”آپ فضول نہ بولیں۔ کچھ نہیں ہوا آپ کو“ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 ”ہاں شاید واقعی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ ہنسنے پر سردال کر لیتا تھا۔

اور سامیہ حسام الدین نے اسے پھر توجہ کیا تھا۔ وہ مسکراتے لگا تھا کیونکہ وہ اپنے سے بڑا مسکراتا تھا۔

کمرے کی ہر چیز اگر ترتیب میں تھی تو وہ اسی لڑکی کے مہربان منت تھی۔ اس دیار پیر میں اگر کوئی تھا تو اس کا اس گھر کے کسی نہ کسی کوئے میں انتظار کرتا رہتا تھا تو یہ لڑکی ہی تھی سامیہ حسام الدین جو دیکھنے میں کہیں سے قاتل توجہ نہیں لگتی تھی اور وہ چیز تھی بھی کہاں وہ تو ایک بہت خاص انسان تھی۔ جسے اس کے دل نے پہلی بار دیکھ کر ہی اپنا مان لیا تھا۔

”آپ سو جائیں میں اب ٹھیک ہوں سامیہ اور وہ میں کافی تھی۔“  
 ”آپ واقعی ٹھیک ہیں نا۔“ وہ ہراساں ہو گئی تھی۔  
 ”جی میں واقعی ٹھیک ہوں۔ آپ سو جائیں ملتے ہیں نا انشاء اللہ!“ سامیہ اچھے تھی تھی۔

سامیہ حسام الدین کے پہلے قدم اور پہلی آمد اور اپنی زندگی میں یاد آئندہ تھی جب یہ لڑکی اس کے پیانے کے ساتھ کھڑی تھی اور اس کی اٹی اپنی بورالی سے چلا چلا کر پات کر رہی تھیں۔  
 ”عجب لوگ ہیں تین تین بھائیوں کے ہوتے

ہوئے ایک بہن نہیں غصیل سکتے۔ اماں کی کیا مہربان ہمارے لیے تو زندگی ہی عذاب کر دی ہے اب کسی لڑکی کی ذمہ داری لینا آسان ہے کیا پڑھیں میں لڑکی اگر آتھیں چار کر لے ہمارے کئے سننے میں نہ رہے تو ہم تو مفت میں بدنام ہو جائیں گے نا صوفیہ ایہ غریب رشتہ دار بھی بس جان کا عذاب ہوتے ہیں کاش ہم بھی گوریل کی طرح اپنے رشتوں سے مکر سکتے مگر بہن مشکل یہ ہے کہ ہمارا خون چاہ کر بھی سفید نہیں ہو سکتا اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم بھی تو قرابت داری بھانا سکھاتا ہے۔“

اور اس کی آنکھیں کیسے ندی کی باز تو ذکر بننے کو بنے تب ہوا بھی تھیں۔  
 اس دن وہ گھر میں تھا آج پوندری سے چھٹی کی تھی۔  
 ”یہ سامیہ حسام الدین ہیں آپ کی کزن۔“

”مونس شہباز کو پتا تھا یا یہ اطلاع اسے نہیں اپنی بہن اور ساری توجہ کے مرکز عمر شہباز کو ہے وہ ہے ہیں مگر اس نے یہ اطلاع چیکے سے قوت لینی اور آج یہ لڑکی اس طرح اس کے سامنے بہت ان کے جڈیوں کو بہت ان کے انداز میں سمیٹے بیٹھی تھی۔  
 ”مجھے وہ دن نہیں بھولتا“ جب تم یہاں آئی تھیں۔“

اس نے سوچنے کی اداکاری کی حالانکہ اسے وہ دن آج بھی پورے سیاق و سباق سے یاد تھا۔ گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کا رنگ گرا لگ رہا تھا۔ یہ واڈی کی پسند تھی اور ماں آنے کے لیے ہی واڈ سوٹ تیا سلا ہوا تھا سو اس نے نہا کر پہن لیا تھا گلہریاں گلابی رنگتیں اسے نوا نواؤ کھینچو ڈکرائی تھیں۔

وہ ساتویں سلونی تھی مگر یہاں وہ کالی لنگ رہی تھی اس نے ڈرتے ڈرتے ارم سے ہاتھ ملایا۔ اس کی ٹھیلیں جلد نے اس کے ہاتھ کی سنڈلاہٹ پر مسکراہٹ اچھالی لیا لگا تھا اسے تو گرنے سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے پر نہ بے زاری تھی نہ گرم جوشی وہ

صرف اپنے پیانے کی وجہ سے اس محبت پر لڑ میں شامل کھڑی تھی شمالی زینب کی صوفیہ ماں کے کی جائے والی باتوں کو غور سے سن کر اپنے وجود کا اہمیت کا اندازہ ہو گیا تھا سامیہ حسام الدین کو۔

”مونس۔“ وہ صوفیہ پر بیٹھی تھی جب ایک مسکراتے چہرے نے دل سے اس کو روہانی طور پر گلے لگایا اس کے چہرے کی مسکراہٹ بہت جلدیں دار تھی بہت دوستانہ سی۔  
 ”تو آج آپ گھر میں کیسے پائے جاتے ہیں۔“ کالج ہوائے عمر شہباز نے طنز کیا۔  
 اور وہ مسکرائی۔

”یہاں دیکھتے اور خوبصورت لوگوں کے ملنے کا موقع ہو میں اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال ہی لیتا ہوں“  
 ”کل ذکر سنا تھا کہ کوئی بھونکا ہمارا کاتے والا ہے میں نے سوچا ہم بھی تو ملیں پاکستان کی اس ولا راری سامیہ حسام الدین سے۔“

وہ اس وقت بیٹوں ہی تھے اس لیے وہ کھل کر بول رہا تھا اور سامیہ حسام الدین خاموشی سے اس کے ہونٹوں کی جھلک دیکھ رہی تھی۔  
 ”آپ یاگلن بڑے بھیا کی طرح بولتے ہیں۔“  
 عمر شہباز اور ارم ہنسنے لگے اور مونس شہباز جھینپ گیا۔

”آپ نے تو بھیا کار و گرام ہی سیوٹا ڈکرو یا۔“  
 ”مطلب عمر بھائی۔“ وہ مسکرائی اور وہ مسکراتے لگا۔  
 ”کیوں اس کرتا ہے یونہی آپ ساتھ رہیں گی تو آپ کو پتا چلے گا کہ اس گھر میں اگر کوئی بے کار کی باتیں بنیں اسباب گھر مسکتا ہے جھوٹ کی طرح تو وہ ہمارا عمر شہباز ہے۔“

”پلیز مونس بھائی۔“ عمر شہباز نے آنکھیں دکھائیں اور وہ سننے کی اداکاری کرنے لگا۔ اسے یک دم لگا وہ اپنے اسی میں چلی گئی ہے۔  
 وہ بڑے بھیا اور خاصہ لیے ہی تو باتوں کے چرچے سمجھاتے تھے کہ کبھی کبھی رات سے سو کر جاتے تھے۔

”آپ کو بھی ہیں یا جب کارڈ نو رکھا ہے۔“ مونس نے اس کو کما اور تہہ مسکرائی تھی۔  
 ”میں بہت کم بولتی ہوں۔ ہاں آپ مجھے ایک اچھا سا سنا سمجھ سکتے ہیں۔“

”پھر میرے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ مجھے بولنے کا بہت شوق ہے۔“ وہ قریب آ بیٹھا تھا وہ سکڑی کھلی بیٹھی تھی مگر اس کا دوستانہ رویہ اسے تسلی دے رہا تھا۔  
 ”ہاں جان کہاں گئے ہیں۔“ بہت ہلکی تم آواز پر آمد ہوئی حلق سے پتا نہیں اسے بار بار دوتا کیوں آ رہا تھا۔

مونس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ عمر اور ارم چاہتے تھے وہ قطعی مونس کے رجم و گرم پر تھی۔  
 ”آپ اتنا کیوں جھرا رہی ہیں سامیہ! میں کوئی شیطان نہیں ہوں۔“  
 ”سکھاموں۔“ وہ بس اتنا کہہ سکی تھی مونس شہباز نے اس کا سامان اٹھایا تھا ”یہ آپ کے ماموں کا گھر

**خواتین ڈائجسٹ**  
 کی طرف سے بہنوں کے لیے ایک اور ناول



**بساطِ دل**  
**آئینہ ریاض**

قیمت --- / 500 روپے

مکتبہ برائے خواتین  
 کتب خانہ اور پبلشرز، 37- ایس 2، لاہور۔ فون: 32735021



سے یہاں آپ کو رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ وہ اٹھ گئی مگر زینب ممانی کے تیور دیکھ کر وہ پھر سے ڈر گئی تھی۔

”اگر میرے اختیار میں ہوتو میں کبھی بھی تمہیں یہاں رہنے کا حق نہیں دلا ہر گز ایک اذیت ہوتی ہے مجھے تمہیں دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے میں تمہارا ہاتھ پکڑوں اور ہر شے ہر محبت سے آزاد کروں۔“

مونس شہباز مسکراتا تھا پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا تھا۔  
 ”اور میں چاہتا ہوں میں ہمیشہ اس محبت پس اذیت میں قید رہوں۔ میں آپ سے دور نہیں رہتا چاہتا ہوں!“  
 ”اور مجھے تمہارے ساتھ رہنا دشوار لگتا ہے۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”چلیں ناپسندیدہ ہی کسی میرے لیے یہی کافی ہے کہ میری ذات آپ کے لیے آپ کی ذات میرے لیے ضروری ہے۔“

وہ زرد چہرے سے ماں بیٹے کی اس گفتگو کو دیکھ رہی تھی تب اس نے مرگے کا ہاتھ۔  
 ”ممانی چلیے میں آپ کو آپ کا گرد کھاؤں۔“

”یہ کوئی ایسٹ باؤس نہیں ہے کہ میں اسے الگ کر دوں۔“ اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے اور مونس کا چہرہ پیکا۔

”لہذا میں اپنا کمرہ انہیں دے دوں گا۔ سارا دن تو میں باہر رہتا ہوں سونا ہو گا تو ہمیں بھی لیٹ کر سو جاؤں گا میرے خمرے نہیں ہیں۔“

”تو اس کے خمرے بہت ہیں کبھی اپنے گھر میں بھی الگ کمرے میں سوئی ہے یہ مجھے اتنے مزاج پسند نہیں۔“

”میں نے تو کچھ نہیں کہا ممانی! آپ جہاں کہیں گی میں وہاں رہ لوں گی۔“ میری آواز نے اس کے زندہ ہونے کا پتا دیا تو مونس نے کوئی دل تھا جو اندر مرتے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ اس کا پوری طرح ساتھ دینا چاہتا تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے ماں بیٹے میں کوئی جنگ پھڑکے۔ ”یہاں انیکسی میں گل

کے ساتھ رہ لو۔“

”لہذا گل شادی شدہ ہے۔“ وہ حیران ہو گیا تھا اس نھیلے پر لیکن زینب ممانی دو ٹوک کہنے میں بولی تھیں۔  
 ”انیکسی میں چار کمرے ہیں دو گل کے پاس ہے۔ دو خالی ہی بڑے رستے ہیں۔ یہ ان میں سے کسی ایک کمرے میں شفٹ ہونا چاہے تو ہو سکتی ہے باقی اس کی مرضی ہے صرف شہباز ہی اس کے اکیلے ماں میں نہیں ہیں۔“ اس جملے پر اس کی روح فنا ہونے لگی تھی باقی دونوں ممانیاں زینب ممانی سے کہیں زیادہ جلا وطن تھیں ایک کو تو وہ پاکستان میں چھوڑ کر آئی تھی اور ایک یہاں ہی رہتی تھیں ممانی اذیت پسند ڈویل کرنے میں ماہر۔

وہ اپنا سوٹ کیس کھینچتی ہوئی پارک سے گزر کر انیکسی کے سامنے کھڑی تھی۔

سامنے کھڑی عورت اسے کینہ توڑ نظروں سے دیکھ رہی تھی ”تمہارا پاکستان میں کوئی نہیں تھا کہ جو سماں چلی آئی ہو۔“ اسے عجیب سے لگا تھا وہ ملازمہ کو اس سے مالک کے گھبراہٹ بولی رہی تھی چند روز اس کے آنے کو اس نے تالیف نیر کی سے کھولا تھا۔ ”جب سے تمہارے آنے کا ماگن نے بنا ہے تب سے رز رز کر رہی ہیں میں بھی سوچتی تھی۔ ایسی کون لڑکی ہے جسے بیگم صاحب اتنا ناپسند کرنی ہیں کہ سمندر میں پھینک دینے کی بات کرنی ہیں تم اتنی بری تو نہیں ہو۔“

”تو کیا تمہیں اچھی لگ رہی ہوں۔“ وہ بے حس بن کر ان سارے جملوں کی سچی کوئی بھی اور وہ غور سے اسے دیکھنے لگی پھر تری سے بولی۔

”دیکھنے سے تو بہت اچھی لگتی ہو۔ باقی کوئی کسی کے اندر تو نہیں اتر سکتا۔“

”واقعی کسی کے اندر بہت اترنا بھی نہیں چاہیے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑی بڑی لٹکھیں بن جایا کرتی ہیں۔“

”وہ کم قسمی سے کندھے اچکا کر کمرے کی چیزوں پر ڈھکی چادریں اتارتے اسے دیکھنے لگی۔ ”تمہاری کوئی

لدا کمرہ ہاں۔“

وہ مڑی پھر مسکراتی رہی ”میں اس وقت تمہارے ساتھ تمہارے برابر کھڑی ہوں تمہیں یہاں ملازمت کرتے سات برس ہو گئے ہیں اور میں آج ہی رٹائر ہو رہی ہوں ہوں مجھے تم سے ہی لیکھنا ہے ملازمہ مالک کبھی نہیں ہوا گل۔“

”آپ بہت سمجھ دار لگتی ہیں۔ سامیہ حسام الدین ہنس پڑی تھی پتا نہیں خود پر یا زندگی پر پھر دھتے تھے میں بولی تھی۔

”کوئی سمجھ دار نہیں ہوتا زندگی خود کھاتی ہے اور جسے زندگی سکھاتی ہے بہت سفاکی سے سکھاتی ہے وہ ساری عمر نہیں بھٹکتا۔“

”جی سچ کہا آپ نے۔“ وہ ”تو“ والے تیور لے کر کھڑی تھی اور ایک دم سے ”آپ“ کے باعزت خطاب سے نواز رہی تھی مگر وہ ان باتوں پر زیادہ تر دھیان نہیں دیتا چاہتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے اس کمرے کو سمیٹ رہی تھی مگر وہاں رہی تھی فریج سے اپنی مرضی سے چیزوں کی تہ تیہ بدل رہی تھی یہاں تک کہ کمرے کی دیوار بھی توہ خراب تھی۔ مگر وہ بھی اور اس وقت گل اس کے لیے ٹرے میں کھانا لے کر آئی تھی مگر یہ وہ کھانا نہیں تھا جس کی منگ انیکسی کے کچن میں پھیل ہوئی تھی۔

”زینب ممانی نے بھیجا ہے۔“ وہ مین پر ہاتھ منہ دھوتے ہوئے بولی پھر اگلی سے تالیف اتار رہی تھی کہ اس کی خاموشی پر پلٹ کر بولا۔

”آپ نے کچھ بولا نہیں گل۔“

وہ اس کی خاموشی کو مستی پہناتے لگی تھی تب اچانک مونس شہباز کمرے میں داخل ہوا تھا اور اسے پتا چلا تھا یہ صرف مونس شہباز کا جذبہ خیر نہ لگی تھا ورنہ زینب ممانی کے لیے اس کی اہمیت ملازمت کے برابر یا شاید اس سے کئی درجے کم تھی کیونکہ گل کے پاس ان کے گھر میں نوکری کرنے کا سات سالہ تجربہ تھا جب کہ وہ آج ہی آئی تھی۔

”گل! آپ کھائیں مجھے سی فوڈ کی عادت نہیں۔“

”آپ نے جو مال بھاری ہے۔ وہ لاؤں پلیز۔“ مونس اسے دلچسپ نظروں سے دیکھتا رہا۔ گل کھانا اور سلاوا ساتھ لائی تھی۔

”سلاوا میں ایک پیاز لے گی مجھے صرف پیاز کے ساتھ ہی دال اچھی لگتی ہے۔“

گل بھی کھینچی ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی اٹھنے کے پوز میں تھی کہ مونس کچن سے پیاز پیٹ اور چھری لے آیا تھا۔ گل اور وہ مسخ کرتی رہیں مگر مونس شہباز پیاز کاٹنے لگا تھا یہ اور بات کہ اس کی دھواں دار برستی آنکھوں نے سامیہ کو شرمندہ کر دیا تھا۔

”آپ نے ناحق تکلیف کی مونس صاحب۔“ وہ کھانا کھاتے ہوئے تری سے بولی اور اس سے بچنے کے وہ کوئی جواب دے پا کہ زینب ممانی سامنے آ کھڑی ہوئی تھیں۔

”تمہیں انیکسی میں بھیجے گا مطلب تھا کہ تمہیں اپنی اوقات یاد رہے۔“

انہیں ارہنے پہن سے کھانے کی ٹرے لے جاتے مونس کی بات چا رہا تھا۔ تب ہی وہ تن کر رہی یہاں آئی تھیں مگر سامیہ کو دال سے روٹی کھاتے دیکھ کر ان کا مود خراب ہو گیا وہ تو بہت سارا غصہ کرنے کا سوچ کر آئی تھیں اور وہیں پلٹ جانا ان کے مزاج کے خلاف تھا اس لیے پھر ہی اپنے غصے کی دھماکا بھانے کو ایک جملہ کہہ دیا ضروری تھا تھا اور وہ سامیہ حسام الدین تھی ایک دم اٹھ کر ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ نے جس طرح محبت سے مجھے اس بے دیاری میں اپنا تہیت محبت اور سلوک سے اپنے گھر میں پناہ دی ہے یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہے ممانی! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی اور کو شخص کروں گی کہ یہ بار آپ پر بہت دیر تک برقرار نہ رہے۔“

مٹھاس میں کھٹاس کا مزہ۔ مونس شہباز کے اندر کئی قہقہے اٹل کر اپنی موت آپ مر گئے تھے اور زینب ممانی کا منہ اتنا سا نکل آیا تھا اور سامیہ حسام الدین تھی کہ اب ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مزید مٹھاس سے بولی



”مجھے اجی اوقات اپنا حسب لب کبھی نہیں بھولتا زینب جمالی! میں کہیں سے بھی نہیں چلی جاؤں نہیں بھول سکتی کہ میرے ابا کے مرنے کے بعد اگر کسی نے میری ماں کی مدد کی تھی تو وہ صرف آپ اور شہباز ماما ہی تھے میں بھی نہیں بھول سکتی کہ میرا ہاتھ ہمیشہ لینے والا ہاتھ رہا ہے اور آپ کا ہاتھ ہمیشہ دینے والا ہاتھ رہا ہے۔“

بات سنجیدگی کی طرف چلی گئی تھی اس بار موس کا رنگ پیکار کیا تھا اس نے کہا تھا۔  
”پاپائے جو کیا وہ آپ کا حق تھا ساریہ!“  
”اس کی مامانے کہین تو وہ نظروں سے موس شہباز کو گھور رہا تھا۔“

”کسی کا کس پر کوئی حق نہیں ہو تا موس صاحب! یہ تو آپ کے دل کی نرمی آپ کے اندر کی اچھائی ہے لہو آپ کسی رشتے کو عزت دے تو تیرے رشتے ہو۔ اس رشتے کو زندگی کی طرح بھلاتے چلے جاتے ہو جیسے وہ رشتہ آپ کے لیے گناہی باعث تکلیف رہا ہو۔“ وہ سنی کی حد تک چٹائی پسند لڑکی تھی۔ اور تب اچانک اس کے دل نے ساریہ حسام الدین کو کچھ میرھیاں اور اپنے دل میں اترتے محسوس کیا تھا۔ زینب جمالی بد مزہ ہو کر جا چکی تھیں اور موس شہباز اس کے سامنے کھڑا تھا۔  
”آپ ماما کو غلط مت سمجھیے گا بس غصے کی تیز ہیں دل کی بہت اچھی ہیں وہ۔“

”مالک کا مزاج تیز ہو یا بہت تیز۔ ملازم کا فہم سرچھکا کر سنتا ہوتا ہے موس صاحب۔  
موس شہباز کو لگا کہ وہ ایک منٹ کے ہزاروں حصے میں اس سے بہت دور جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مالک اور ملازم کا رشتہ اس کے دل میں اس کی آنکھ کا دکھ بھانسنے کی طرح جیسے لگا تھا ایک لڑکی اس کے دل کے گوشے میں کھڑی باتوں کی یارش میں بھٹکتی لگی تھی۔  
”آپ ہماری گزرتی ہیں۔ ملازمہ نہیں۔ ساریہ آپ اپنے دل کو مثنیٰ سرخ کی طرف مت لے جائیں۔ اس گھر پر جتنا حق میرا آرام اور عمر کا ہے اتنا ہی آپ کا ہے

آخر کو آپ کے پاپائے اس کا سامنا کی بنیاد میں اپنے خواب دیا ہے تھے۔“  
”آپ تو دل رکھنے میں مبالغہ آرائی میں حد سے ہی گزر جاتے ہیں موس صاحب! وہ ہنسی گئی مگر موس کو لگا وہ روڑھی تھی۔

”آپ آرام کریں۔ ہم کل ملیں گے۔“  
”جی ضرور۔“ وہ سہلا کر ٹرے بچن میں رکھنے چلی گئی تھی اور موس شہباز نے اس کی پشت کو دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ کوئی ناراض سا دل تھا جو زندگی کے سورج کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا تھا وہ کھڑے اور بے سانسے کھٹے لگا تھا۔  
مگر اسے اس گھر کے لیے ساروں سے نکال کر زندگی سے متعارف کروانا تھا۔ وہ عزم کر کے لوٹا تھا۔



غیر متوقع ماما کو اپنے گھر سے مل گیا مگر حیران رہ گیا تھا۔  
”تم آخر میرے مخالف چلنے کو بتی سب کچھ کیوں سمجھتے ہو۔“  
”ماما! میں آپ کے مخالف نہیں ہوں چاہوں۔ میں تو صرف اسے تسلی اور ڈھارس دینے گیا تھا کہ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔“

”وہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے نہ ہی وہ کوئی بھولتی ہی بچی ہے بائیس تیس برس۔ کی لڑکی ہے ہم صرف کچھ عرصے اسے یہاں رکھیں گے اور پھر کہیں نہ کہیں اس کی شادی کرا کے اس عذاب سے چھٹکارا اپنے لی گو مشن کریں گے اس لیے تمہیں سمجھانے آئی ہوں کہ اس سے زیادہ میل ملاپ بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ہر ایک سے لواتو ہونے کی جو بری عادت ہے اس سے جان جاتی ہے میری۔“

وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ”صحت کرنا کیا میری عادت ہے ماما! کسی کا خیال رکھنا پروا کرنا جب کہ وہ ہمارا اپنا ہو۔“  
”تمہیں تو دنیا کا ہر شخص اپنا ہی لگتا ہے پاکستان

میں بھی یہی حالت تھی اور اب یہاں آکر ہر پاکستانی تمہیں اپنا بھائی بہن لگتا ہے۔ تم نے اس لیے وقتی میں جتنا پیار خرچ کیا ہے اس سے گئی برس شروع ہو سکتے تھے۔“

”برس ہی سب کچھ نہیں ہو تا ماما! انسانیت بھی کوئی چیز ہے پھر آپ جانتی ہیں جب میں کسی پاکستانی کو مجبور اور بے کس دیکھ کر اس کی مدد سے نہیں چوکتا تو میں ساریہ کے لیے وہ رہ سکتا ہوں تو ہماری پھوپھی کی بیٹی ہے پاپائے کے لیے اگر کسی نے قربانیاں دی ہیں تو وہ پھوپھی جان ہی نہیں۔ آپ کو یاد ہے جب ماما کے برس میں نقصان ہوا تھا ہمارا گھر تک گیا تھا ہم انکس اسکول سے ایک دم سے گورنمنٹ اسکول میں کھڑے کر دیے گئے تھے تو پھوپھی جان ہی نہیں جنہوں نے اپنا زور لڑ کر کیا کون سے عرصے سے کاروبار کے لیے پیسہ دیا تھا پھر جب ماما کو انگلینڈ آنے کے لیے سہ ماہی کم پڑھا تھا تب بھی انہوں نے ساریہ کے جینز کے لیے انکل کی فکس بنا ڈالت میں رکھی ہوئی رقم کو نکال کر لیا کما مسئلہ حل کیا تھا اور اب اگر آج ہم اس مقام پر ہیں تو یہ سب اسی لڑکی کے نصیب کا ہے۔“  
وہ کہتے کہتے مزا کر ماما بولیں تھیں ہی نہیں۔  
”پتا نہیں ماما! آپ کو ہر اس شخص سے کیوں چیز ہو جاتی ہے جو آپ کا خیر خواہ! آپ کا سچا دوست ہوتا ہے۔“



وہ بیٹے پر آکر بیٹھا تھا پھر سونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا روزانہ بچا۔  
”اندر آجائے پلیر روزانہ کھلا ہے۔“  
اس نے کتاب ہاتھ سے رکھ دی تھی اور باج پکینڈ بعد پاپا کھڑے تھے ان کا چہرہ اچھے تاثرات نہیں رکھتا تھا۔

”جی پاپا خیریت ہے؟“ وہ یک دم کھڑا ہو گیا تھا۔  
اور پاپا اس کے کمرے کے صوفے پر بیٹھ گئے تھے پھر آہستگی سے بولے ”میں سمجھتا تھا آپ میرے بچوں

میں سب سے سمجھ دار بچے ہیں مگر کیا آپ کو پتا ہے آپ کی زبان کی تیزی کی وجہ سے آپ کی مام کے دل کے زخموں میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔“  
مونس کا چہرہ اتر گیا۔ ”میں نے انہیں کچھ بھی نہیں کہا ماما! آپ کو پتا ہے میں ہمیشہ چپ رہتا ہوں۔“  
”ہاں مگر جب بھی آپ بولتے ہو بہت سارے چروں پر زخم اور تکلیف چھوڑ جاتے ہو۔“  
”مامانے کیا شکایت کی میری؟“

”وہ آپ کی ماما ہیں وہ شکایت کیوں لگا میں گی۔ آپ اپنی ماما کو اپنا دشمن کیوں سمجھتے ہیں۔ وہ آپ کی سنی ماما ہیں اگر آپ کو کچھ ہوتی ہیں کچھ سمجھاتی ہیں تو آپ کے بھلے کے لیے ہوتی ہیں ماما آپ ان کی ہر بات کو غلط کیوں لے جاتے ہیں۔ آپ نے اپنی ماما سے یہ کیوں کہا کہ ساریہ کے نام پر بنا ڈالت کیے بیسوں سے میں یہاں انگلینڈ آیا تھا آپ کو یہ بات کیسے پتا چلی ہے؟“  
”ڈاڈا جان سے سنی تھی۔ ایک بار وہ اتنی حریفی کے لیے بہت پریشان ہو رہے تھے۔“  
پاپائے اسے نظروں میں رکھ کر ایک گہری سانس لی تھی۔

”کچھ چیزیں ساری عمر نظروں سے اوجھل رہیں یہی اچھا ہے آپ کو پتا ہے آپ کی ماما کی اتنا تسلی تو اتنا ہے ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی دو گھر کے بھائیوں کے کیے ہوئے کھانوں کی ڈش میں سے ایک چمچ نہیں لیتی تھیں جب تک دو سہری بھابھیاں منتیں کر کے ان کی پلیٹ میں سالن نہ ڈال دیتیں پھر ان کے لیے یہ بات تسلی سہانہ روح ہوگی کہ وہ جو لائف اسٹائل جی رہی ہیں اس کے لیے بنیاد ساریہ کے بیسوں سے رکھی گئی ہے۔ آپ کو پتا ہے آپ نے جلد بازی میں اس بیٹی کے لیے زندگی اور مشکل زندگی سب اب آپ کی ماما بلاوجہ اسے اٹھتے بیٹھتے بائیں شانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیں گی!۔“

”میں تو صرف یہ چاہتا تھا ماما اس بے دیا لڑکی کی قدر کرنے لگیں۔“  
پاپائے گھر سانس لیا تھا کچھ نہیں بولے تھے۔



مجھے لگتا تھا میں اس لڑکی کو لایا ہوں تو وہ اپنے سلیقے اور محبت سے آپ کی ماما کا دل جیتنے لگی پھر آہستہ آہستہ میں اس کے لیے حالات سازگار دیکھ کر آپ کے لیے مانگ لوں گا مگر آپ نے سارا کام خراب کر دیا ہے میرا۔"

مونس شہباز نے ہولے سے لایا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"مسوری پاپا مجھے نہیں چاہتا تھا۔ آپ اتنی گہری نظر رکھتے ہیں اور اتنی طویل پلاننگ کرتے ہیں۔ مجھے تو بیٹھ سے لگتا ہے کہ آپ کے لیے۔"

وہ کہتے کہتے چپ ہوا اور پاپا مجھے تھکے انداز میں ہسکرائے۔

"ہاں تمہیں تو یہی لگتا ہو گا تمہارے پاپا صرف میرے کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے لیے رشتے ان کی اہمیت انہیں بھانا سب بے معنی سا ہے۔"

"نہیں پاپا ایسی بات نہیں ہے۔ مونس شہباز نے آواز اور دیکھی گئی تھی پاپا نے سزا دیا تھا کہ کیا۔"

"نہیں بات یہی ہے تمہیں نہیں گھر کے ہر شخص کو ایسا ہی لگتا ہے کہ میرے لیے بیس وقت ہی سب کچھ ہے مجھے نہ کسی کی ضرورت ہے نا کسی کی کمی محسوس ہوتی ہے نہ کسی اور لایا جان اور ہنوں کو بھی مجھ سے بیکی شکایت تھی کہ میں نے صرف دولت کے پیچھے ہی دوڑ لگائی ہے میں نے بھی ان کی کسی خوشی میں شرکت نہیں کی اور اپنے دکھ میں انہوں نے جان کر مجھے شریک نہیں کیا کہ میرے لیے یہ سب ضروری نہیں ہے پھر آپ کی ماما کا رویہ میرے لیے ہر جگہ سوالیہ نشان بنا رہا۔"

"آپ ماما کے لیے اتنا حساس بھی تو رہتے ہیں پاپا وہ کچھ بھی غلط کریں صحیح کریں بچ نہیں بھوتتے نہیں آپ ہر اس بات پر آمنا ہند کرتا ہے جس میں آپ سے مشورہ لوگوں کی توجہ آپ کے لیے سوالیہ نشان بنی رہتی ہے۔"

پاپا نے سزا دینا کے بے جا رگی سے اسے دیکھا۔

"بچا نہیں میں جب بھی اسے روئے دیکھتا ہوں میرے اندر طوفان آجاتے ہیں میں پاگل ہو جاتا ہوں

پھر میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں گیا نہیں کروں۔"

"پاپا! آپ کی یہ حساسیت پہلے تو اتنی شدید نہیں تھی ظفر بھائی کی زندگی میں تو میں نے گھر میں لڑائی جھگڑوں کے علاوہ کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آپ ایک دوسرے سے عاجز تھے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور آپ ایک دوسرے کو طلاق دینے والے تھے۔"

پاپا جو سے کرنٹ لگا تھا۔ رنگ اڑ گیا تھا ان کا۔ وہ اس کی طرف مڑے تھے۔

مونس کو لگا وہ جان کر "سوگ اسکرین" درمیان میں لائے تھے تاکہ وہ ان کے چہرے کے ٹھیک تاثرات نہ دیکھ سکے۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا تھا کہ ہم میں طیوہرگی ہونے والی تھی۔"

اس نے بہت تھکے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"ظفر بھائی نے بتایا تھا اس دن آپ دونوں میں روز سے زیادہ جھگڑے ہوئے تھے ظفر بھائی مجھے اپنے قریب بٹھائے مینتھس کے سوال حل کروا رہے تھے اور میں بار بار غلطی کر رہا تھا۔ وہ مجھے اٹھارے تھے کہ میں ان کی بات کیوں نہیں سمجھ رہا میں آپ کی چٹکھانوں سے ڈر رہا تھا۔ میں روئے لگا تھا۔ تب ظفر بھائی نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور بولے تھے۔

"تم بہت ہمدرد رہتے ہو اور ہمدرد لوگ ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"میں نے کہا ایسے حالات؟"

تو بہت اذیت بھرے لہجے میں بولے تھے "شاید ہمارے ماما پاپا بہت دیر تک ساتھ نہ رہیں ہو سکتا ہے وہ الگ ہو جائیں گے میں تیار ہوں اس چوہنیشن کے لیے بلکہ پہلے سے زیادہ پرسکون ہو کر بڑھائی کر سکوں گا پھر یہ جھگڑا لڑائی نہیں ہوگی۔ ہمیں دونوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑے گا۔ میں پاپا کا نام رکھ کر لوں گا مگر کچھ عرصے کے لیے جب میں معاشی طور پر مضبوط ہو جاؤں گا تو میں ان سے بھی الگ ہو جاؤں گا اور

تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"فکر ڈاؤ! وادی اور چاچو؟" میں نے اٹکا سوال کیا اور انہوں نے دکھ سے کہا۔

"کوئی نہیں ہے ہمارا" اپنے ذہن کو پہلے سے تیار کر لو۔ ہر رشتہ پاپا سے ہے جب پاپا ان کے لیے کچھ نہیں ہیں اور وہ پاپا کے لیے کچھ نہیں ہیں تو متر ہے ہم خود کو اپنی سے لایا ہونے کا عادی کر لیں اور اپنی زندگی کی ایک نئی شروعات کریں جہاں صرف تم میرے لیے اور میں تمہارے لیے ہوں اور پاپا کچھ نہیں ہے کیا تمہیں وادی کا رویہ ٹھیک لگتا ہے؟ وہ پاپا سے ہر شے کی شکایت کر لے مجھے جس طرح اکتور کر کے تھی ہیں مجھے نہیں اچھا لگتا میری توجہ اور محبت کو بھی وہ وہ غلط سمجھتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے میں یہ کھر پھوڑ دوں۔"

"وہ یہ سب کتنا تھا تم سے اور میں سمجھتا تھا وہ میرا عاشق زار ہے۔ اسے میرے بغیر نیند آنی سے نا کھانا کھانا جاتا ہے وہ راتوں کو جس طرح میرا انتظار کرتا تھا" ایسا انتظار تو کبھی زندگی میں نہیں کیا تھا میرا اور آج مجھے اسے سالوں بعد یاد آیا میں ربا ہے کہ وہ مجھ سے نفرت کرنا تھا۔"

پاپا کے چہرے کا ہر رنگ جیسے آہستہ آہستہ مرنے لگا تھا وہ اندھ کر ان کے قریب گیا تھا۔

"وہ جذباتی تھے پاپا! آپ تو جانتے ہیں آپ مجھ سے بھی اس لیے ہی تو ڈرتے ہیں کہ میں بھی صرف جذبات کو اہمیت دیتا ہوں حقیقت پسندی نہیں ہے مجھ میں۔"

پاپا کچھ نہیں بولے تھے خاموشی سے مونس شہباز کو دیکھتے رہے تھے پھر نرمی سے بولے تھے۔

"کیا آپ اپنی ماما سے سواری کر لیں گے مونس! یہ درخواست ہے حکم نہیں۔"

"پاپا! ایسے تو نہ کہیں۔ آپ کو حکم دینے کا اختیار ہے مجھ پر۔" اس نے پاپا کے ہاتھ کوچا تھا اور پاپا پشت موڑ کر چلے گئے تھے۔

وہ ماما کے کمرے میں گیا تھا ان کی بڑی بڑی عمارتی کھینچیں دوڑو لڑو سوج گئی تھیں۔

"کیا گھر ہی میں پاپا؟" ماما نے اسے دیکھ کر خراخرا کرنا شروع کیا۔

اپنی الماری کھول کر تھیں اپنے ہاتھ کے کپڑوں کو پھیرے تہہ گرنے لگیں۔

"ماما اوھر دیکھیں تا میری طرف۔" اس نے ماما کو کندھے سے تھا تھا اور وہ پھر گئی تھیں۔ "بھوڑو دو مجھے مونس! مجھے تم سے بات کرنی ہے نا مجھے تمہاری طرف دیکھنا ہے۔"

"میں اتنا برا بھی نہیں ہوں ماما اوھر دیکھیں تو لڑائیں تو آپ کے بیٹے پر سو جان سے خدا ہیں اور آپ ہیں کہ اپنے بیٹے کو کھٹکی نہیں کراتیں۔"

"تمہیں پتا ہے مجھے تم سے بات کرنے میں کبھی اثر ٹھ نہیں رہا ہے۔" انہوں نے اس کے ہاتھ جھٹک لیے۔

"کیوں نہیں ہے آپ کو مجھ میں اثر ٹھ۔ میں آپ ہی کی اولاد ہوں ماما! وہ کہتے کچھ آیا تو کسی اور معاملے میں لڑتا تھا۔"

"یہ بہت بڑی غلطی ہے وادی کہ تم ہماری اولاد ہو۔" اتنا سخت کمنٹ من کر وہ گھڑے سے بیٹھ گیا تھا۔

"اگر میں آپ سے کبھی دور چلا جاؤں تو آپ کو شاید اتنی بھی کمی محسوس نہیں ہوگی جتنی یہ کر سٹل کے واڑ کو اگر آپ کے روم میں ڈائریکشن بدل کر رکھ دیا جائے تو آپ کو یہ بدلاؤ محسوس ہوگا۔"

"میرے پاس فضول باتوں کا جواب نہیں۔ ناؤ لڑکم سے کہ پڑھا کرو۔ یہ جذباتی باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔"

"اگے ہام! میں آپ سے کتابی باتیں نہیں کروں گا، لیکن پلیر میں چاہوں گا کہ آپ کے آنسو جو میری وجہ سے نکلے ہیں ان پر مجھے آپ معاف کر دیں۔"

"میرے آنسو تمہارے لیے کب سے اہمیت رکھنے لگے ہیں؟" وہ الماری بند کر رکھی تھیں اور اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"آپ کے آنسو میرے لیے ہمیشہ سے اہم ہیں ماما!



میں کو بخش کرنا ہوں میری جنت سے آپ کو بھی کوئی دیکھ نہ سکتے۔  
 "ظفر کی موت کے باوجود تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میرے آنسوؤں کا سایہ تم نہیں ہو۔"  
 "ماما! آپ بھول کیوں نہیں جاتی ہیں اس بات کو کہ وہ ایک حادثہ تھا ماما۔"  
 "یہاں کچھ دیر سکون سے اکیلے بیٹھ سکتی ہوں۔"  
 انہوں نے ایک دم سے ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر ہارنگال دیا تھا۔ لفظی طور پر یہی سہمی ٹکڑا لے ایسے ہی لگا تھا کہ اس کی ماں نے اسے ایک دم سے اپنی مٹا کے حصار سے باہر نکال دیا ہو اور یہ دوری یہ اس کی ذات کا انکار ہمیشہ سے اسے ماما کی طرف سے ملا تھا۔

وہ برسوں سے ماما کے اس اظہارِ ناراضی کو سنتا آ رہا تھا۔ مگر آج بہت سو اورد ہوا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آیا تھا۔ پھر وہ گارڈن میں بیٹھا تھا۔ جب کوئی اس کے قریب آیا تھا۔

"کافی۔" اس نے سہرا اٹھا کر دیکھا۔ یہ سارے جسم الہین تھی۔ اس نے کافی کا کپ تمام لیا تھا۔ "آپ کو بھی کافی کی عبادت ہے۔"  
 "اور کس کو ہے؟" وہ اس کے برابر بیٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے ہے، بابا گوئے، ظفر بھائی کو تھی۔" اس نے گھوٹ بھرا اور ایک دم سے اسے لگا، کافی کا گھوٹ بہت زہریلا ہو گیا ہے، اس کے چہرے کا رنگ پھیلا پڑ گیا تھا اور وہ اس کی کیفیت سے بے نیاز آہستگی سے بولی تھی۔

"جب ظفر بھائی کا عادیہ ہوا، میں خالد کے گھر تھی، بہت چھوٹی تھی، مگر میں نے سنا تھا، سرمد بھائی بھاگے ہوئے آئے تھے اور بہت بے قراری سے بولے تھے۔ اسی ظفر چلا گیا۔ اسی ظفر کی ڈینٹہ ہو گئی۔" خالد اس وقت سالن میں ٹمک ڈال رہی تھیں اور ان کے ہاتھ سے ٹمک کی بول چھوٹ کر چٹکی میں کر گئی تھی اور

میں نے اس لیے سوچا تھا، ظفر بھائی کے ساتھ کچھ بہت برا ہوا ہے۔ مجھے ظفر بھائی اس لیے ان کا کھیت کی وجہ سے زیادہ یاد آئے تھے، جو وہ ہر سڑے کو میرے لیے لایا کرتے تھے۔ مجھے تو چاکھٹ اور ان کی بانگ پر گھومنا ہی یاد آیا تھا، پھر جب پہلی بار میں نے انہیں خاموش لے کر دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔  
 "میں ظفر بھائی میں نے اٹھانے کی کوشش کی تھی اور وہاں سب کے رونے دھونے میں تیزی آئی تھی۔"  
 "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے اسی سے پوچھا تھا وہ اور حیرت سے رونے لگی تھیں۔

"آپ کے ظفر بھائی کو جانے کی جلدی تھی وہ چلے گئے ہیں، ملک عدم بابا نے کہا تھا۔ اس روز میں نے سوچا تھا۔" وہ بہت اچھی جگہ چلے گئے ہیں۔ انہیں گھونٹے کا شوق بھی تو بہت ہے، فرانس، مصر جیسا کوئی ملک ہو گا، مگر وہ تو کہتے تھے سویت ڈول تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا، جہاں بھی جاؤں گا۔ مگر وہ اگلے چلے گئے تھے، مگر یہ ملک عدم کیسا ملک تھا کہ ظفر بھائی انہیں نظر تو کر رہے تھے، مگر سب کو کہہ رہے تھے وہ چلے گئے ہیں شاید کوئی جاؤ گئی تھی وہ۔ میں بہت عرصے تک یہ ہی سمجھتی رہی، پھر جب ظفر بھائی کو دوبارہ بھی نہ دیکھ کر میں نے بابا سے پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ جو لوگ مر جاتے ہیں، وہ اللہ کے پاس چلے جاتے ہیں، ملک عدم وہی راستہ ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا اور ظفر بھائی بھی کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ اس دن میں سارا دن اور ساری رات مروٹی رہی تھی۔ اس دن مجھے پتا چلا تھا موت کیا ہوتی ہے۔ کسی کا چلے جانا کیا ہوتا ہے۔"

اس نے کہہ کر سر اٹھایا تھا اور مونٹس شہباز کی آنکھیں سمندر ہونے کے باوجود نہیں روٹی تھیں۔  
 "تم نے اتنی تفصیل سے بتایا ہے کہ مجھے ہر منظر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ابھی یکدم سانس روک کر رکھا تھا اور ایک دم سے گہری سانس لے کر جیتے لگا ہے۔"  
 "وہ دن میں نہیں بھول سکتا، چاہوں بھی تو نہیں"

ظفر بھائی زندگی سے جا کر بھی میری زندگی میں آج بھی زندہ ہیں، مجھے ان کے ساتھ رہنا اور جینا اچھا لگتا ہے پتا نہیں آپ یقین کریں گی یا نہیں، لیکن میں نے ہمیشہ وہ ہی خواب چینے کی کوشش کی ہے جو بھی ان کے خواب تھے، آپ کو پتا ہے سارے، جب ظفر بھائی شاعری کی کوئی کتاب پڑھتے تھے تو مجھے وہ سب سے زیادہ برے لگتے تھے، میں جان جان کر اس لکھے لکھے اسکول کا ہوم ورک لے بیٹھا وہ مجھے سوال سمجھاتے رہتے، زیادہ تک کرنے کو کہتے اور میں کندہن بن جاتا۔ وہ کتاب رکھ کر میرے پاس اٹھ کر آتے اور مجھے ان کی اس توجہ میں رہنا بہت اچھا لگتا، جب وہ کتاب رکھ دیتے تو مجھے ان کی ہر بتائی ہوئی بات آسان لگتی۔ شروع شروع میں ظفر بھائی میری یہ چال کی نہیں سمجھتے تھے، مگر جب مجھے پتا چلا تو بہت ہیسے تھے۔"

"کتنا پتھر ہے، مونس تو؟" انہوں نے ایک بار میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا تھا اور میں نے کہا تھا۔  
 "وہ تو ہوں آگے کہیے۔"

"مگر کتنی توجہ دیا ہے مجھے میری زندگی، اس دن کب وہ جہاں تک لے گئے اور میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا تھا اور بہت دل سے کہا تھا۔"

"مجھے ہر چیز سے زیادہ آپ کی محبت چاہیے، میرا دل چاہتا ہے آپ میری ایک ایک بات پر نظر رکھیں، مجھے ہر وہ دن اچھا لگتا ہے جو آپ مجھے سوتے سے جگانے آتے ہیں، جب ماما کہہ ہونے پر آپ میرے لیے ایلٹ بنا تے ہیں، میرا دل چاہتا ہے میں آپ کے ہاتھ چوم لوں۔ آپ مجھے مانتے ہیں۔" اور ظفر بھائی ایک دم سے اٹھ کھڑا اٹھے تھے۔  
 "بہت چار کرنا ہے مجھ سے؟"

"بہت زیادہ بھائی۔" میں نے جذب سے کہا تھا اور انہوں نے ایک دم سے مجھے دیکھ کر کہا تھا۔ "اگر کسی دن مجھ سے دور ہو جاؤں تو کیا کرو گے؟" میں ان کے سینے سے اور چمٹ گیا تھا۔

"میں ایسا بھی نہیں ہونے دوں گا بھائی! میں آپ کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتا، مگر نورس کے مونٹس

کو نہیں پتا تھا کچھ عرصے بعد وہ اپنی ضد کے ساتھ آ گیا کھڑا ہو گا سارے، آپ نہیں جانتیں میں نے ہر وہ دم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ تب نہیں ظفر بھائی کے بغیر چلتا سیکھا ہے۔ اور پھر پتا نہیں مجھ میں کسے ظفر بھائی کی پسند و ناپسند میرا مزاج بن گیا، ایک بار ظفر بھائی نے کہا تھا۔"

"جو باتیں تم کرتے ہو اتنی سی عمر میں، وہ ہی تو شاعری ہے، وہ ہی تو جذبہ ہے، وہ ہی تو محبت ہے اور تمہیں محبت کی بات کرنا آتی ہے تو محبت کی بات پڑھنے سے کیوں بڑے؟"

"میں ابھی بہت چھوٹا ہوں بھائی۔" میں نے جان بچائی اور انہوں نے کہا تھا۔

"میں چھوٹی کلاس میں تھا جب غالب کو پڑھتا شروع کیا تھا میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، میں اردو کی لغت پلایا کی لاہوری سے چرا کر چکے چکے شعروں کے مطلب دیکھا کرنا تھا، مجھے تب بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا اور یہ ہی نہ سمجھ میں آتا میری بعد بن گیا۔

میں چہرے سے محالاً اسے پتہ نہیں ہے کبھی نہیں بھگا کا مجھے حالات کو اسے پتہ نہیں کرنے کا جو صلہ سے اور شوق بھی تب مجھے لگا تھا، جس کی محبت کی قسم کھا سکتا ہوں، وہ بہت مشہور اور بھی نہ مٹنے والا حصار ہے، مگر ضامیہ! ہم جن لوگوں کے لیے سوچتے ہیں، وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے، وہ پتا نہیں اچانک ہاتھوں سے رشتہ زور کی طرح جیسے پھسل جاتے ہیں۔"

سامنے نے ہولے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا اور خاموشی کی زبان میں کہا تھا۔ "میں آپ کے ساتھ ہوں مونس!"

اور اس نے بہت اہستگی سے کہا تھا۔ "کوئی ایسا وعدہ مت کیجئے گا جو آپ زیادہ نہ سکیں۔"

"میں بہت کم وعدے کرتی ہوں اور مونس! جو کم وعدے کرتے ہیں وہ ہمیشہ سچا وعدہ کرتے ہیں۔" اس نے بڑے دل سے کہا، مگر سر اٹھانے کے لیے اور پھر بہت سارے دن مل کر اس کے وعدے سے پھرنے کا راستہ بن گئے تھے۔



”میں نے اگر تمہیں مولس کے اریب قریب بھی دکھا تو میں ساری رعایت ساری مصلحت بھول کر تمہیں جاپس پاکستان بھیج دوں گی۔“

”پاکستان۔“ اس نے ذریعہ ہمت بے چارگی سے اس ملک کا نام لیا تھا جہاں وہ بی ہوش تھی جہاں ساری عمر سجائی سے محبت کی تھی محبت اوڑھی تھی محبت جی تھی اور پھر وہ ہی پاکستان تھا جہاں اس نے اپنے اندر سے محبت وطن کی تھی۔



وہ بچپن میں مصروف تھی ملازمہ کے ساتھ مل کر مگر خاموشیاں اس کے ہم قدم چل رہی تھیں۔ اس کے قدموں میں صرف بے چارگی تھی اور پیروں کی ریکھاؤں میں جلاوطنی کا دکھ۔

”اب بیگم صاحبہ کی سگی بھانجی ہیں؟“ اس نے پلیٹ کو خشک کرتے پوچھا۔

”نہیں میں ان کی سگی بھانجی نہیں رہتی بھانجی ہوں۔“ اس نے بصورت بول کر اپنا بھرم رکھنے کی معصوم سی کوشش کی اور گل اس کو حیرت سے دیکھے۔

”میں صاحب کے پاس پندرہ سال سے ملازم ہوں۔ بیگم صاحبہ کو میرے کام کی عادت سے متنب ہی وہ جب یہاں آئیں تو انہوں نے مجھے دو سال کے اندر اندر میرے شوہر کے ساتھ بلوایا تھا اور گھر کی تصویروں میں میں نے اکثر آپ کو بیگم صاحبہ کی پہلی کے ساتھ دیکھا ہے جب بڑی بی بی صاحبہ بیگم صاحبہ کے گھر آیا کرتیں تو وہ آپ کا نام لے کر ہر وقت آپ کو یاد کیا کرتی تھیں بتایا کرتی تھیں کہ آپ ان کا کیا خیال رکھا کرتی تھیں۔“

”ہمت جتنی تھیں اگر وہ مجھے اپنی اولاد جیسا سمجھتی تھیں۔“ وہ اس حوالے سے صاف مگر تھی اس لیے نہیں کہ زینب ممانی کا رویہ اس کے ساتھ برا تھا بلکہ اس لیے کہ گل یہ نہ سمجھے کہ ان کے گھر کے لوگ اپنے غریب قرابت داروں سے اتنا ناروا سلوک کرتے

ہیں اس گھر کے لوگ جہاں داوی بیگم کی تربیت اور محبت نے سخی گھروں کے اندر سے گھر میں سکون و آسٹی کے دیے جلائے تھے وہ اس وقت بھی صرف داوی کا بھرم اور ان میں نہیں ٹوٹے کچھ ملتی تھی۔

”پتا نہیں جی۔ مجھے تو یاد ہے آپ صاحب نے کہا تھا آپ ان کی سگی بہن کی بیٹی ہیں۔“

”کنہہ دیا ہو گا ماموں جان کو یوں بھی دل رکھنے کا ہوا شوق ہے نا۔“ وہ چٹپٹیں ریکہ میں رکھ کر بچپن سمیٹ کر زینب ممانی کی پاس ڈرا تنگ روم میں آئی تھی۔

”توئی اور کام تو نہیں ہے ممانی؟“

”ہاں یہ دو تین ساڑھیوں ہیں استری کر کے میری وارڈروب میں رکھو پھر سونے چلی جانا۔“

ایک پرسکون نیند پتا نہیں تکتے سالوں سے وہ ٹھیک طرح سے سو نہیں پاتی ہے اس نے اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر جلتی آنکھوں نے اس کے اس حساب کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

استری کرنا بہت مشکل کام لگتا تھا اسے مگر اسے یہ بھی مشکل کام کرنا پڑتا تھا مگر وہی استری کرنا مشکل ترین کام تھا وہ بھی زینب ممانی کی ساڑھیوں کا تقصیر نکالتی تھیں ٹھیک سے استری کے باوجود وہ تیسری ساڑھی کو پھیلا رہی تھی کہ اچانک کمرے میں مولس شہباز داخل ہوا تھا اس کے ہاتھ میں برگر تھا۔

”تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا نا۔“ اس نے مڑ کر بے بسی سے دیکھا تھا۔ ”نہیں جیہاں سے نمٹوں گی تب ہی کھانا کھاؤں گی جا کر۔“

”اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ تو یہ ہے ساسہ۔ آپ بھی تا اور یہ ماما بھی کتنی ظالم ہو جاتی ہیں کبھی کبھی۔“

”ارے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ میں خود ڈر رہتی سی ساڑھیوں اٹھا کے لائی تھی۔“

”چچا چٹپٹیں آجائیں ایک یا اسٹلر ریٹورنٹ سے لایا ہوں پودینے کی چٹنی کے ساتھ کچھ چھینچھینچ نہیں ہے اس لیے نہیں ڈالاسے اس برگر میں۔“

”مگر مجھے کام کرنا ہے۔“ وہ لپٹائی ہوئی نظریں سے برگر

کو دیکھ کر بولیں۔

اور وہ اس بڑا آجائیں ماہاس وقت سونے کے لیے لیٹ چکی ہوں گی آپ کھائیں گے تم سے کیا کھانا یاد آکر رہ جائے گا۔ سچ تو جیسی مجھے اپنی فانی شباب کے مقابلے میں برگر ٹائم کے ٹھیلوں سے برگر لے کر کھانے کا شوق رہا ہے۔“

”سامیہ کو بھی آگئی تھی اس شخص کی تمنا میں اور پسند و ناپسند کتنی عام ہی تھیں۔“

”ہاتھ دھو لوں۔“ وہ تمنائی۔ اور وہ فنی میں سر ہلا کر بولا تھا۔

”ایسے ہی آجیو ہاتھ دھونے باہر جاؤ گی تو پڑھی جاؤ گی اور پھر سیر کی اولادیں منہ ہاتھ کب سے دھونے لگیں۔“

بے ساختہ قہقہہ ابل برا تھا وہ پیٹ میں پودینے کی چٹنی سے برگر لگا کر کھانے لگی تھی بھوک میں تو سوکھی روٹی بھی اچھی لگتی ہے یہ تو پھر برگر تھا کسی زمانے میں اسے بھی برگر کھانا کتنا پسند تھا مگر ایک بیسی بی ایل میں اٹھ کر وہ کئی چھری اس کا آخری پائٹ تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور دیکھے ہوئے وہ دونوں حق دق رہ گئے۔

”یہ سب میرے گھر میں نہیں چلے گا بی بی ہمت سنی ہیں میں نے تمہاری کہانیاں۔“

وہ شرم سے پائی پائی ہو گئی تب مولس شہباز کھڑا ہو گیا۔

”آپ کو سامیہ پر اعتبار نہیں مگر میں تو آپ کا ہی بیٹا ہوں نا۔“

”ہاں تب ہی میں نے تمہارا ہر روپ دیکھا ہوا ہے۔“

”میں ماسک لگا کر نہیں گھومتا ماما! جیسا اندر سے ہوں ویسا ہی باہر سے ہوں۔“

”نخوش نہیں ہے تمہاری ڈگر نہ دنیا میں اگر مجھے کسی پر اعتبار نہیں ہے تو وہ تم ہو۔“

”آخر میں نے لیا کیا کر دیا ہے ماما کہ آپ مجھ پر ہمیشہ بے اعتبار رہی ہیں۔“

”کیا یہ بھی تمہیں بتانا پڑے گا مگر سزاخہ کی بیٹی کی داستان لوگ ابھی نہیں بھولے۔“

”مگر وہ بات کاغذ ہو گئی تھی کہ ان کی بیٹی نے بھوت کیوں بولا تھا جب امریک نے خود اسے بیک میل کر کے تھک لیا تو کھٹ اگر سب کے سامنے کسی راز کی طرح فاش کر دیا تھا آپ کی سوا کلاڈ کئی پارٹی ہمت یادگار تھی ہاں۔“

”تم اپنی لفظی سے توجہ ہٹانے کی کوشش مت کرو۔“

”ہاں! ہم برگر کھا رہے تھے اور بس۔ سامیہ کو بھوک لگ رہی تھی شدید۔“

”آخا! تو اب یہ الزام بھی سر تھوپو گی لڑکی کہ زینب ممانی تمہیں بھوکا رہتی ہیں۔“

”نہیں تو زینب ممانی میں ایسا کیوں کہوں گی میرے لیے تو آپ فرشتہ ہیں۔“

”ہاں فرشتہ سب کے سامنے ورنہ تمہارا دل جو مجھے ظالم جلاؤ سمجھتا ہے میں اچھی طرح سمجھتی ہوں بی بی۔“

”بتانا نہیں زینب ممانی آپ کا دل میری طرف سے کیوں صاف نہیں ہوتا حالانکہ میں اسی طرح چلنے کی کوشش کرتی ہوں جیسا آپ کو پسند ہے۔“

”لوگوں کو برکنے کا میرا الگ انداز ہے اور میں اس میں کسی کی ڈکٹیشن قبول نہیں کرتی میرا دل کہتا ہے تم مجھے کہیں نہ کہیں دھوکا دو گی تم اس گھر کی خیر خواہ نہیں ہو یہ میری رائے ہے۔“

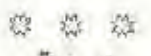
”میں مانتی ہوں زینب ممانی! لیکن آپ یہ تو سوچیں میں آپ کو دھوکا کیوں دوں گی کس کے لیے دوں گی میں یہاں جلا وطن ہوں زینب ممانی! مجھے میرے گھر میں کوئی پسند کرتا ہے نہ مجھے اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا ہے شہباز ماموں کا تو احسان ہے کہ وہ مجھے ایک بری زندگی سے بچا کے لے آئے ممانی قسم سے میں جاؤں بھی تو آپ کے سامنے مر اٹھا کر آپ کو دیکھ نہیں سکتی میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر یہاں آئی ہوں آپ ہی بتائیے پھر میں اپنی پناہ گاہ کو خود اپنے ہاتھ



سے کیوں اجازت کی؟ جب سے زندگی نے حق اختیار چھینا ہے تب سے زندگی خاموشی اور سر جھکانے کا نام ہے میرے لیے۔

”بس بس میرے سامنے یہ کتابی باتیں مت کیا کرو مجھے زہر لگتی ہیں ایسی باتیں۔“  
 ”مگر آپ کو ظفر بھائی کی یہ کتابی باتیں کبھی بری نہیں لگی تھیں ماہ۔“ اس نے سوچا کہ وہ کچھ نہ بولے اور واقعی اس نے اس بار بھی سختی بھرا جملہ ہی کہا تھا۔  
 ”ظفر تمہاری طرح لفظوں کی نمائش نہیں کرتا تھا میرے اس بے بسی میں بہت صبر تھا بہت کچھ ضبط کر لینے کا وہ جیل تھا وہ تمہاری طرح اٹھتا نہیں تھا کہ پھانسی بھی چھپی تو ساری دنیا کو اپنے گرد تماشاکھڑا کر لو۔“

”بس ایسا ہوں ماہ۔“ مونس شہباز کی آواز یک دم مرتے سی لگی تھی۔  
 ”میرا دل چاہتا تھا کبھی آپ صرف آپ مجھ پر رائے دیں میرے دل پر اور میرے باطن میں جھانکنا کر مجھے دیوانت کریں مگر مجھے آج چاہیے میں آپ کے لیے ایک شوگر کرپڑا ہوا پتھر یوں بس ایسا پتھر جس پر نہ آپ توجہ دے سکتی ہیں نہ توڑ سکتی ہیں کیونکہ اگر میں ٹوٹ گیا تو آپ کے لفظوں اور آپ کی نفرت کا زہر کون پیے گا۔“  
 ماما نے نفرت سے اس کی طرف سے پشت موڑ لی تھی۔



دوسری صبح بہت ہنگامہ خیز تھی۔  
 ”یا تو اس لڑکی کو پاکستان چھینیں یا پھر اس کو جلد سے جلد شادی کر کے اس گھر سے وفغان کریں“ ان کا لہجہ بہت تیز بہت سخت تھا مگر شہباز صاحب سر جھکانے کسی بہت گہری سوچ میں گم تھے۔  
 ”میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں شہباز! انہوں نے اس بار ان کا نشانہ ہلایا اور وہ جھرمجھری لے کر ان کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھنے لگے۔

”تو یہ لگتا ہے اگر آپ کسی سے دل کی گہرائی سے محبت کرتے ہو مگر آپ کو بتا چکے کہ آپ سے وہ شدید نفرت کرتا تھا؟ اتنی نفرت کہ اس کے اختیار میں وہ نا تو وہ آپ کو کب کا چھوڑ دے گا چاہے وہ اتنا ہی جیسے محبت کا بندھن سمجھتے ہوں وہ صرف مجبوری کا ساتھ ہو تو کیسا لگتا ہے؟“  
 زہنب شہباز نے انہیں حیرت سے دیکھا تھا۔

”آپ کس کی بات کر رہے ہیں شہباز؟“  
 ”ایک ناول پڑھ رہا تھا کل عجیب سی کہانی تھی نئی پڑھو مجھ پر بھائی۔“  
 زہنب یک دم ان کے پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ ”یہ آپ کب سے ان خرافات میں پڑ گئے کہانیاں ناول یہ تو بے کار لوگوں کے کام ہیں۔“

”ہاں مجھے پہلے یہ ہی لگتا تھا کہ ناول اور کہانیاں لکھنا پڑھنا بے کار کام ہے مگر کل پتا نہیں مجھے کیوں لگا کہ یہ سب کہانیاں ہمارے اندر سے جنم لیتی ہیں ہماری طرح کے لوگ کہیں نہ کہیں وہ زندگی ہی رہے ہوتے ہیں جنہیں لفظوں میں لکھا دینا بہت ہی آسان ہے۔“  
 ”آپ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔ آپ تو بہت مضبوط اعصاب رکھتے تھے۔“

”مضبوط اعصاب۔“ وہ خود پر طنز بہتے تھے وہ تو وہ رشتوں کے پاتوں میں پس گئے تھے تب ہی انہوں نے اپنے اعصاب کو آہستہ آہستہ بے حسی کی سمت موڑ دیا تھا تاکہ وہ دونوں فریقین کی ذہنی کا استقامت سے مقابلہ کر سکیں۔ ”ورنہ شہباز شروع میں وہ اماں کی شکایت پر زہنب شہباز سے بد سلوکی کر ڈالتے تھے اور کبھی بیوی کے کہنے پر ماں سے جھڑپ کرنے جا بیٹھتے تھے۔ بہت سال تک یہ ہی چکر چلا رہا مگر ظفر کے زندگی سے چلے جانے کے بعد ان میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی تھی انہیں لگا تھا وہ مکمل طور پر خالی ہو گئے ہیں۔ انہیں لگا تھا کوئی جیسے ان کی عمر بھر کی کہانی چھین کر لے گیا ہے وہ جھجکے تھے نہ رو سکے تھے اور تب انہیں لگا کہ ان کے اندر آسو مکمل ششون کر جم گئے

تھے۔  
 اور اتنے برسوں بعد زہنب کہہ رہی تھیں وہ بہت مضبوط اعصاب کے مالک ہیں۔  
 زہنب شہباز اسی تک ان کی طرف متوجہ تھیں اور شہباز صاحب یک دم ان کے سامنے سے اٹھ کر باہر چلے گئے تھے پھر وہ جیسے بعد کی بات تھی انہوں نے اپنا سوٹ کس پیک کرنا شروع کر دیا تھا۔  
 ”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”پاکستان؟“ بہت عجیب دکھ کی طرح لفظ ادا ہوا تھا۔  
 ”کیوں جا رہے ہیں؟“ زہنب نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر پوچھا۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کہا پھر وہ ڈرائیور کے ساتھ ایر پورٹ پہنچے تھے اور اپنے سامنے مونس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔  
 ”تم یہاں کیوں؟“

”پتا نہیں مگر مجھے لگا تھا آپ کو رخصت کرتے وقت اپنی محبت کا شدید اور سوغات آپ کے ہاتھ ضرور پیچھا چاہئے تھا ظفر بھائی کو پتا نہیں میں یاد ہوں گا۔“ مونس نے کہا۔  
 ”تو میں جب آپ ان سے ملیں تو ضرور بیٹھے گا کہ مونس کو ایک لمحے کے لیے بھی وہ نہیں بھولے ہیں ہمیشہ میں نے ان کو اتنا یاد کیا ہے جتنا شاید خود کو بھی یاد نہ رکھا ہو۔“

”تمہیں کیسے پتا نہیں پاکستان کیوں جا رہا ہوں؟“  
 ”ظفر بھائی کہتے تھے محبت میں کے بغیر ایک دل دوسرے دل کی سمجھ لیتے ہیں اور مجھے یقین ہے مجھے آپ سے بہت محبت ہے بابا۔“

شہباز صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں اور وہ نم آلود شام تھی جب وہ کراچی اپنے گھر آئے تھے۔ اماں جان کو ان کی آمد سونگے دھانوں پر بڑنے والی بارش جیسی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بھی اماں کے گلے سے لگ کر ایسے روئے تھے کہ جیسے پہلی بار پتھر کر ملے ہوں۔

”اماں! کیا آپ کا دل گزروے سالوں کی بے رخی پر مجھے معاف کر سکتے گا؟“

اماں نے ایک لفظ کہے بغیر انہیں اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور وہ پھٹکی ہوئی شام کی طرح گھر میں سو گوار بیٹھے تھے اماں نے انہیں کسی کلمہ نہ کہنے کی طرح حسیٹ رکھا تھا۔ مگر ان کی آنکھوں کی گی۔

”کیوں واپس آیا ہے شہباز؟“ مجھے پتا ہے پہلے میں تیرے اپنے آپ سے جدا ہونے سے بہت ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا تم جو میری پہلی اولاد ہو اگر تم مجھ سے دور چلے گئے تو میرے سارے بچوں کے درمیان جو ایک کشش کا دائرہ ہے وہ دائرہ ٹوٹ جائے گا اور میں اپنے سارے بچوں کے درمیان یہ محتاطی کشش برقرار رکھنا چاہتی تھی مگر جس دن میں نے ظفر کا ہاتھ دبوڑا کر لیا اس دن دیکھا اس دن مجھے لگا تمہیں اب پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ مجھے لگا ظفر کے وجود کی ساری خاموشیاں تمہارے اندر سما کر تمہیں دیکھ گیا وہیں گی۔ تم دور چلے جاؤ گے اس غم کے راستے سے تو خوشیوں کی طرف تمہارے قدم تیز رفتاری سے بڑھتے چلے جائیں گے اس لیے میں نے تمہاری جدائی سہہ کر لی۔“

”کیا سوچ رہے ہو شہباز؟“ کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر متوجہ کیا ایک دم جیسے وہ اماں کی گود سے نئی کی حد تک چلتا ہی ہوئی سچائی میں لاکھڑے کر کے لگے۔

وہ اماں کے کمرے میں اکیلے بیٹھے ماضی کی کسی شام کے لفظوں سے دل کو ڈھارس دے رہے تھے مگر شازبہ آیا جوان کی خالہ زاد تھیں اور ان سے آٹھ برس بڑی تھیں انہوں نے ڈھارس کا یہ کندھا ایک دم چھین لیا تھا۔

”اماں نے جانتے وقت کیا کہا تھا؟“ کئی برس سے وہ جب بھی فون پر بات کرتے ایک یہ ہی سوال کرتے آ رہے تھے اور ان دنوں شازبہ نے آپا کے بالکل سامنے آکر کھڑے تھے اور ایک بار پھر یہی سوال کر رہے تھے۔

”وہ تمہیں آخری بار دیکھا چاہتی تھیں وہ تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔“  
 ”مگر مجھے کیوں لگتا ہے وہ مجھے آخری بار نہیں



و کھینچا ہوا ہے، ہوں گی، آخر انہیں مجھ سے ملائی گیا تھا میں کبھی ایک اچھا بیٹا نہیں ثابت ہو سکتا۔  
 ”ممنے اس گھر کے لیے بہت کچھ کیا ہے، جو تم اچھا کر سکتے تھے، وہ تم نے کیا۔“  
 شازیہ نے اپنے انہیں تسلی دی، مگر وہ کیسے مان لیتے کہ جب بھی اماں ان کے خواب میں آئیں، ہمیشہ منہ مڑے، خفا خفا کسی نظر آئے، وہ ہمیشہ ان سے باتیں کرتے، مگر وہ چپ خاموش کفری رہتیں اور ظفر چپکے سے اگر ان کے کان میں کہتا۔  
 ”واہ ناراض ہیں، پہلے مجھ سے بھی ناراض تھیں، مگر میں نے تو سنا لیا، آپ کبھی مانگیں۔“  
 ”کیا سوچتے تھے، شازیہ اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا اور وہ کرا لائے۔  
 ”ظفر کتا ہے میں اماں کو متاویں، شازیہ کہا کیسے متاویں، کیا میرا دل، تو اماں جان جائیں گی۔“ شازیہ نے تپا روئے گی تھیں۔  
 ”ظفر بہت یاد رہتا تھا، وہ کبھی کسی کو اتنا مایوس نہیں کرنا تھا۔ یہ صرف تمہارا دم ہے۔ کہ اماں ناراض ہیں، اس لیے تمہیں ایسے خواب نظر آتے ہیں، یہ تمہارے اندر کا گھٹ ہے، شہناز اور نہ ایسا کچھ نہیں ہے۔“  
 ”مگر شازیہ کیا، میں جب آپ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوں، مجھے آپ کی آنکھوں میں اماں روتے ہوئے کیوں نظر آتی ہیں، میں جب ان کے پاس آیا تھا، انہوں نے مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا، ناراض تھیں تو غصے ہی میں دستکار دیتیں، اچھی کی طرح جو وہ رخصت ہوئیں یوں بھی کوئی جاتا ہے شازیہ آیا؟“  
 وہ بتائیں گس دکھ کو چھپانے کے لیے کتنے رانے دکھوں کو یاد کر رہے تھے، شازیہ آیا ان کے پاس آکر بیٹھ گئی تھیں۔  
 ”وہ خفا نہیں تھیں۔ آخری وقت تک تمہارا انتظار کرتی رہیں، مہادی اولادیں ان کے پاس تھیں، مگر انہیں صرف تمہارا انتظار شہناز میں نے کئی بار تمہیں فون کیا، مگر تمہارا موبائل روکنگ پر تھا اور

زینب نے جتنی بار فون اٹھایا، اس نے یہ ہی کہا کہ تم بہت ضروری بیٹنگی کی وجہ سے انگلنڈ سے باہر ہو۔ میں مایوس ہوئی تھی، جب اشرف بھائی کا بیٹا اچانک تم سے امریکہ میں ملا، اس نے تمہیں خالد کی اطلاع دی، قصور تمہارا نہیں تھا، شہناز! اس قیمت میں خالہ اور تمہاری آخری ملاقات نہیں دکھائی تھی۔“  
 ”ایسا کیوں ہوتا ہے شازیہ، کیا کہ ہم جن سے زندگی بیٹنا سیکھتے ہیں، جن کے لیے سب سے زیادہ حساس ہوتے ہیں، قسمت جانتے سے ہمارے اور ان کے بیچ اتنی خاموشیاں بھرتی ہے، کہ ہم چاہ کر بھی اس خاموشی کے دل میں حرارت بن کر نہیں رہ سکتے، میں نے کتنا کتا اماں! میں ہوں، شہناز! آپ کا شہناز، مگر اماں نے بیٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ میرا ایک آسوان کا دل کھلا دیا کرتا تھا، مگر اس دن میں حسدوں روایا تھا، مگر اماں کا دل نہیں کھلا تھا۔ پتا نہیں کیا خرابی ہے، مجھ میں کہ مجھے چھوڑتے ہوئے نہ اماں کا دل بیٹنا تھا، نہ ظفر کا۔“  
 وہ اماں کی آرام کر ہی کیاں بیٹھے تھے، بے حال، بے گس سے، شازیہ نے کہا، ان پر ایسے طرح ترس آیا تھا، تب ہی انہوں نے اماں کی طرح انہیں اپنے بیکراں سینے سے اگایا تھا، وہ روئے جا رہے تھے، یہاں تک کہ پھر وہ خود ہی چپ ہوئے تھے اور اٹھ کر ظفر کے کمرے میں آگئے تھے، ظفر کی کتابیں، لکھنے کی میز، ہریز ویسی تھی۔ شازیہ آیا مردانہ اس کمرے کی ایسے ہی صفائی کرداتی تھیں، پیچھے وہ ابھی کہیں سے آجائے گا اور نئے سرے سے زندگی جینا شروع کرے گا۔  
 انہوں نے ہر چیز کو چھو کر ظفر کے نہ ہونے کو محسوس کیا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کی دراز میں رکھی تصویریں لے کر بیٹھ گئے تھے، ہر تصویر میں وہ ’ظفر‘ مونس اور زینب تھے۔  
 انہوں نے آنکھیں بند کی تھیں۔ ”تمہیں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے، مجھ سے یا اپنی ما سے؟“  
 ظفر کی چمکتی آنکھیں ان پر جم گئی تھیں۔  
 ”مونس سے۔ مجھے سب سے زیادہ مونس سے

محبت ہے، بابا! وہ جان کر ہلکا ہوا، کہا تھا۔ دونوں ہی اس کی جان تھے، سو کسی ایک کو رو کرنا کسی ایک کو منتخب کرنا مشکل تھا۔ مگر انہیں پتا نہیں کیا، سو کبھی کسی اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کے کہا تھا۔  
 ”بولو نا میں یا ما ما؟“  
 ظفر کا شہن چہرہ مڑ گیا تھا۔ ”میرے لیے ہر رشتہ بہت ضروری ہے، بابا! لیکن اگر دونوں میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو وہ آپ دونوں میں سے کوئی نہیں ہوگا، کیونکہ پھر میں جینا ہی نہیں چاہوں گا۔ میری زندگی کی تصویر میں ہمارے رنگ آپ دونوں سے ہیں، بابا اور اس تصویر کا سب سے شون، کھلکھلا، تارنگ، میرا مونس ہے۔“  
 شہناز اسے نویں جماعت کے اسٹوڈنٹ بیٹے کو دیکھتے رہ گئے تھے۔  
 پھر اس دن ان کا اور زینب کا بہت زیادہ دوست۔ بھگلا ہوا تھا اور اس دن وہ ہر حد چھلانگ مٹی تھیں، تب ہی درگزر کر جانے کے بجائے وہ زینب سے لڑ پڑے تھے۔ اپنی اماں کی اس درجہ بے عزتی کو وہ سہ نہیں دیا کرتے تھے اور پھر ایک طویل تجربات کے بعد، اس دن جاسوچے گئے انہوں نے اپنے ایک دوست وکیل کو فون کیا اور ملاقات کے کاغذات بنانے کا کام سونپا تھا۔ وہ پہ بھول گئے تھے کہ بیٹے کے دو بہری طرف ڈراما مونس بھی بیٹھا ہے، وہ باہر نکل گئے تھے۔ زینب ناراض ہو کر اپنے گھر چلا گئی تھیں۔ اماں انہیں سو کو سنا کر گھولانے کا کہہ رہی تھیں۔ مگر وہ غلطی پر نہیں تھے، اس لیے مٹے کھڑے تھے۔  
 پھر اچانک یہ دو مردانہ تھا جب ظفر ان کے کمرے میں آیا تھا۔ ”مونس کو کھالے پلا، وہ آس کی فائلیں پھیلائے بیٹھے تھے، چونکہ گئے تھے۔ ”کیا مطلب؟“ اسی را بوجہ کے ساتھ تھا۔“  
 ”مگر را بوجہ چھو بیٹو تو کہہ رہی تھیں، وہ آپ کے پاس جانے کا کہہ کر ان کے کمرے سے نکلا تھا۔“  
 وہ یک دم کھڑے ہو گئے اور تیزی سے بیڑھیاں اترے تھے۔ ”آپ نے مونس کو کھالے اماں؟“

وہ اماں کے کمرے تک پہنچے تھے اور ظفر اس وقت تک اسے دھوئے کھڑے باہر نکل گیا تھا۔  
 وہ گھر کے ارد گرد اسے دھوئے رہے تھے، پھر آوٹھے کھنڈے بعد کی بات تھی، انہیں مونس اسپتال کی لالی میں ملا تھا، وہ ایک بالکل انجان شخص کے ساتھ کھڑا تھا۔  
 ”جی میں ہی ہوں شہناز۔“ وہ آگے بڑھے تھے اور ان کا جسم اذیت ناک خبریں کر رہا ہوا تھا۔  
 ”ظفر! ایک دکھ کی طرح یہ عام ان کی زبان پر آ کر ٹھہر گیا تھا۔  
 ”ایک گاڑی نے بٹ کیا آپ کے بیٹے کو، وہ اس وقت اس بچے کے پیچھے بھاگا تھا، وہ جتنا تیزی سے اس کی طرف دوڑ رہا تھا، اتنی تیزی سے یہ پڑا، ان سے دور بھاگا رہا تھا، پھر میں نے دیکھا ایک گاڑی اس بچے کو کھینکے والی تھی کہ اس نے اس بچے کو گاڑی کھانٹنے سے بٹایا، مگر وہ خون نہیں بچ سکا۔ بہت زور سے گاڑی نے اچھال کر نیچے چٹا تھا، اس بچے کو میں ہی سے اسپتال لایا ہوں، ورنہ تو لوگ بس ٹماشا دیکھنے کھڑے ہوتے تھے۔“  
 شہناز اتنی سی لڑکے کے ساتھ کھڑے ہو گئے تھے، وہ وفا کی چٹ کی وجہ سے بے ہوش تھا، مونس ان کا کوٹ تھام کر کھڑا تھا۔  
 ”میں نے کچھ نہیں کیا، بابا! میں تو ما کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔ ایک بار چاہو مجھے اپنے ساتھ تالی کے گھر لے گئے تھے، مجھے لگا تھا میں خود تالی گھر جا سکتا ہوں، مگر مجھے راستہ یاد نہیں آ رہا تھا، پھر جب میں سڑک کراس کرنے والا تھا، اچانک مجھے ظفر بھائی کی آواز سنائی دی۔ وہ زور سے چیخے تھے۔ ”مونس! یہ غلط کر رہے ہو، زور کو میں آ رہا ہوں۔“  
 میں نے پلٹ کر دیکھا اور پہلی بار مجھے ظفر بھائی سے ڈر لگا۔ میں نے سب کی ڈانٹ اور مار کھائی ہے، مگر ظفر بھائی۔  
 مجھے ڈر لگا، اماں میں اور تیزی سے بھاگنے لگا، مجھے لگا میں تالی گھر پہنچ گیا تو پھر ظفر بھائی غصے نہیں کر سکیں گے، پھر بس اچانک یہ سب بابا میں بے قصور ہوں۔



شہباز صاحب نے اس کی کہانی نہیں سنی تھی وہ خاموشی سے آگے ہی بیٹھیں داخل ہوئے تھے اور دم میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے دونوں کے تھے۔ ایک دوست کو طلاق کے کاغذات نہ بنانے کے لیے اور ایک فون زینب کے لیے۔

”ہمارا ایٹا اسپتال میں ہے آیا آپ اب بھی ناراض ہیں؟“  
 ”کون؟“ زینب کی بے قرار آواز پر ان کی آنکھیں پٹیگ گئیں۔

”ظفر! زینب آؤنا پلیز“ اگر اپنے بیٹے سے کہو وہ ہمیں چھوڑ کر نہ جائے ہمارے سارے خواب اس سے وابستہ ہیں اگر اسے کچھ ہو گیا تو تم ساری اور میری آنکھیں تو بھر ہو جائیں گی نا۔“ زینب جھکلا ہلا کر فوراً اسپتال پہنچی تھیں۔ ظفر نے تیسرے دن آنکھیں کھولی تھیں مگر اس نے صرف موتوں کو پایا تھا۔ ڈاکٹر کی خصوصی اجازت کے بعد موتوں آگے ہی بڑھیں داخل ہوا تھا۔

”خدا کا شکر ہے تم ٹھیک ہو۔“ ظفر نے اس کا ہاتھ چوما تھا۔ موتوں نے ہمیشگی طرح اس کی پیشانی چومی اور بس جیسے بیک وارتھ کے قیدی کی سزا پوری ہو گئی تھی، کمرے میں ساری مشینیں ایک دم سے شور مچانے لگی تھیں ڈاکٹر نوڈیک دم روم میں داخل ہوئے تھے اور ایسے باہر نکال دیا گیا تھا مگر باہر کی فضا بہت ناسازگار تھی۔

”اما کی سرح انگارہ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔“ اگر آج میرے ظفر کو کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ پاپا انہیں ساری بات چاٹنے تھے تب ہی وہ ایک دم سہم کر اپنے پیپا کے پیچھے چھپنے لگا تھا۔

پھر بندہ منٹ بعد ڈاکٹر باہر آیا۔ ”آئی ایم ساری سہرا“ شہباز صاحب یک دم زمین پر بیٹھ گئے تھے اور زینب دیوانوں کی طرح چیختے لگی تھیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ میرا بیٹا ہے وہ میرا ظفر ہے“ میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ مجھے کیسے چھوڑ گئے

چا سکتا ہے ڈاکٹر آپ جھوٹ بولی رہے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر سے لڑ رہی تھیں اور شہاز سے چھوٹے عباس نے گھروں کر دیا تھا وہ ڈیڑھ باڈی کو لے کر جانے کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ مظفر بھائی شہباز کے بہنوئی شہباز کو اپنی گاڑی میں بیٹھا کر لے گئے تھے۔ عباس، زینب اور موتوں کے ساتھ ڈیڑھ باڈی گھر لائے تھے۔

”ظفر! وہ ایک دم سبکا شے تھے۔“ اور ایک نو عمر عورت آواز گونجی تھی۔ ”ظفر مر رہیں ہیں“ اسے نقل کیا گیا ہے، آپ دونوں نے مل کر مارا ہے اسے۔ دن رات کے جھگڑے، جھگڑوں سے تنگ آکر اس نے زندگی اور موت میں سے موت کو قبول کیا، یہ حادثہ نہیں خود کشی ہے، ہاں وہ میرا دوست تھا ہر روز زینب بھی آپ کا مانی سے جھگڑا ہوا تھا وہ میرے پاس آگریہ آئی کہتا۔ میں اس زندگی سے تنگ آیا ہوں۔ میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کچھ لینا کسی دن برداشت اور صبر کا دامن چھوٹ گیا تو میں خود کشی کر لوں گا۔ ٹولے ہوتے تھری وراثت اسے قبول نہیں تھی اور موتوں نے اسے واقعی مار دیا۔“

”اتفاق! بگو اس بند کو یہ ساری باتیں پھر کبھی ہو سکتی ہیں۔“ عالیہ نے اپنے بیٹے کو چپ کرانے کو پہنچی تھیں اور سیکنڈ ایر کے اتفاق مصطفیٰ نے جموٹی سنبیل کولات ساری تھی۔

”میرے چپ ہونے سے حقیقت نہیں بدلے گی ماما! میرے دوست کو شہباز ماموں اور ماما نے ہی نقل کیا ہے۔“

وہ لوٹ گیا تھا اور وہ ظفر کے چالیسوں والے دن بہت چپکے سے گھر سے نکلے تھے اور اتفاق مصطفیٰ کے کمرے میں داخل ہوئے تھے وہ انہیں دیکھ کر ایک دم تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ظفر کی موت والے دن جو کچھ کہا تھا جو کچھ ہوا تھا وہ اس کے اندر کا بیجان ہڈیاہیت تھی۔ اسے خود ہاتھ نہیں تھا وہ کیا کہہ رہا تھا مگر جب بعد میں اس کی ماما نے اسے بتایا تو وہ چپ رہ گیا تھا تب سے اب تک ظفر کی موت پر اس نے خاموشی کی

ایک چادر تان لی تھی۔ اور آج شہباز ماموں کو دیکھ کر اس کی جان آنکھوں میں ٹپکنے لگی تھی وہ اپنے کیے پر ناام اور شرمندہ تھا، زندگی اگر اس کے دوست برائے انسان نہیں تھی تو اسے یہ حق کب پہنچتا تھا کہ وہ اس کی موت کو بھی اتنے مشکل زاویہ پر لاکر بھڑوڑتا۔ وہ جس سوال بھری زندگی سے بھاگا تھا آیا تھا وہی سوال اس نے اس کی موت کے سہانے رکھ دیا تھا۔

ظفر کی موت خود کشی تھی کہ حادثہ۔ اور آج وہ ہر روز کے اپنے اندر کے سوال کو لے کر اس کے سامنے بیٹھے تھے۔

”مجھے بتاؤ وہ ہمارے بارے میں تمہارے کس طرح کہتا تھا۔ اس کے لہجے میں کیا ہوا تھا؟ جب وہ میرے حوالے سے بات کرتا تھا۔“

”صرف محبت وہ آپ سے اور زینب ممانی سے بہت محبت کرتا تھا ماموں۔“ شہباز صاحب اس کیلئے سچ اور جھوٹ کے درمیان لگتے ہوئے کواٹھائے بغیر ابلیس جیسے لگتے تھے اور آج لگتے ماما اور موتوں کی باتیں پھر لگتے تھیں اس وقت میں تحقیق لاتی تھیں کہ وہ اپنے آراستہ پیرا استہ گھر سے کسی جوگی کا چہرہ لے کر اس ملک میں دلہنس لوٹ آئے تھے۔ وہ ساری رات سے بھی زیادہ اور اس تھی وہ اپنے بھانجے کے گھر بہت خاموشی سے پہلے پڑے تھے اتفاق اب دو بچوں کا باپ اور ایک کامیاب بزنس میں تھا۔

مگر شہباز ماموں کو دیکھ کر وہ آج بھی کینفو ز ہو کر کھڑا ہو گیا تھا اس نے سگریٹ بجھا دی تھی اور اپنے ارد گرد کے دھوئیں کو اپنے فریشتر سے ختم کرنے کی ٹنگو دوڑا تھا۔

جب انہوں نے اس کا ہاتھ ہولے سے تھاما تھا۔ ”تمہیں ظفر کبھی یاد آیا پھر؟“ اتفاق مصطفیٰ کی آنکھوں میں غم تیرنے لگا تھا۔ ”میں اسے کبھی نہیں بھول پایا شہباز ماموں! اس کی نگاہوں میں موت نے مجھ سے میرا دوست ہی نہیں میرے اندر کا ناپرسر مرد بھی مار

دیا تھا میں نے اس کی کوکھ بھری موت کی بوجھ سے اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ ماحول کو سازگار بنائے رکھا، رضہ مزاج کی بہت تیز ہے مگر میں اپنے بچوں کے لیے ہمیشہ اس کی باتوں کو درگزر کرتا ہوں لوگ کہتے ہیں میں بے حس ہوں مگر زندگی کو آسان بنانے کے لیے کبھی کبھی بے حس ہونا بھی پڑتا ہے اپنے آپ سے لڑ کر کچھ چہروں کی خوشی کے لیے خود کو فٹا کرنا ہی پڑتا ہے تب ہی محبت کا سیلاب ہوا کرتی ہے۔“

شہباز صاحب کی آنکھوں کا خالی پن ایک دم کسی فقیر کی طرح ان کے برابر میں آن بیٹھا تھا۔

”ظفر کو مجھ سے نفرت تھی نا؟“ اتفاق مصطفیٰ کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی پھر اس نے ٹھہر کر کہا تھا۔ ”نہیں تو ماموں وہ تو آپ دونوں سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اسے لڑیچ میں دوپٹی تھی مگر وہ آپ کی خواہش پر سانس پڑھ رہا تھا۔“

”تمہارے اس کے خوابوں میں یہاں بھی ڈنڈی مار دی تھی اس نے بھی نہیں بتایا تھا کی اسے لڑیچ پڑی ہے۔“ وہ رات میں بھی اسے سامنے میں جانے کی صلاح نہ دیتا۔ اس دن والدین کی طرح ہمیں تھا جو اپنے خواب اپنے بچوں کی آنکھوں میں نمودار ہیں بے وردی سے یہاں تک کے جب تک وہ خواب تعبیر پاتے ہیں تب تک ان کے سچے جینا بھول کر خود کو ایک مشین سمجھتے لگتے ہیں جس کے پروگرام ان کے ماں باپ ہوتے ہیں۔“

”وہ بھی کہتا تھا کہ آپ اتنے سوئٹ ہیں کہ کبھی اس پر اپنی سوچ کا وزن نہیں ڈالیں گے لیکن اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ وہاں ہی رہے اسی راستے پر چلے جس راستے پر آپ نے اپنے خواب پورے تھے۔“

شہباز صاحب کی آنکھوں میں برسوں پرانے سائون نے دستک دی تھی اور دکھ کی دھوپ سے ان کی روح جل رہی تھی۔ دھوپ میں بارش کی بوندوں کی حدت سے ان سے سانس لینا دشوار لگ رہا تھا تب ہی انہوں نے بوجھا تھا۔

”تم نے کہا تھا یہ حادثہ نہیں خود کشی ہے ایسا کیوں



”وہ میری بے وقوفی تھی ماموں بگرنہ یہ صرف حادثہ تھا ظفر جیسا انسان خود کشتی نہیں کرتا۔“ اتفاق مصطفیٰ نے تم آؤ لیجئے میں کما تھا شہباز صاحب نے اس کی بات پر اس یار یقین نہیں کیا تھا۔  
”مجھے بتاؤ۔ میں جانتا چاہتا ہوں۔ اتفاق! کیا ہوا تھا۔ اس دن۔ اس دن سے پہلے جو تم یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔“

”وہ بہت دل گرفتہ تھا اس نے مجھے فون کیا تھا اس نے بتایا تھا کہ آپ اس کی ماما کو طلاق دے رہے ہیں اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتا وہ کہہ رہا تھا وہ مرکز آپ کو ایک ساتھ جڑے رہنے کا موقع دینا چاہتا ہے۔ میں فون بیچ کر اس کے پیچھے آیا تھا اور اس وقت آیا تھا جب وہ سلیپنگ پلاننگ رہا تھا میں نے اس کے ہاتھ کو چھو لگا دیا تھا۔ وہ ج رہا تھا۔“ مجھے مر جانے لگی۔ اتفاق بھائی! اور میں اسے گلے سے لگائے روئے جا رہا تھا۔ وہ رات میں نے تالی کے گھر میں گزار دی تھی۔ اس دن بھی ماما آپ سے لڑ کر گھر گئی ہوئی تھیں۔ مونس سو رہا تھا۔ آپ گھر نہیں لوٹے تھے اور وہ تمنا تھا میں نے اس کی شنائی کو اپنی باتوں سے دور کر دیا تھا۔ بہت سے واقعات سے قرآن و حدیث سے اسے اس عمل سے باز رہنے کی تلقین کی تھی پھر وہ وعدہ کر کے سو گیا تھا۔ دو دن بعد یہ حادثہ ہوا تو مجھے لگا وہ اپنا وعدہ نہا نہیں سکا اس لیے اس کی سیت روہ سے کچھ کہہ گیا لیکن ماموں چاہن آج سوچتا ہوں تو مجھے اس کی ایک عادت بہت یاد آتی ہے۔ کہ وہ وعدے بہت کم کرنا تھا کیونکہ وہ وعدے بھاتا تھا۔“

شہباز صاحب سر ہلا کر چپ ہو گئے تھے پھر خاموشی سے اٹھے تھے۔ ظفر اور اماں اب کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر اپنا سالن باندھنے لگے تھے۔  
”بس جا رہے ہو شہباز؟“ شازیہ کیانے حسرت سے بوجھا تھا۔  
اور پڑے رکھتے رکھتے یک دم مڑے تھے۔  
”ہم سمجھتے ہیں گھر کو بہترین املا جیڑوں سے بھریں“

آرامتہ پیراستہ گھر میں رہیں آسائشات کو ضرورت کا نام دے کر زندگی سے بھاگ کر پیسے کی دوڑ میں شامل ہو جائیں تو بہت سالوں بعد کھٹکا ہے۔ بہت عالی شان گھر خالی رہ گئے ہیں اور وہاں صرف اپنی بلایت کے ساتھ تنہا کھڑے ہیں۔ اس گھر میں دنیا کی ہر چیز موجود ہے مگر اس گھر میں شنائی زندگی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ماں، ”ماں“ ظفر عمارہ کوئی بھی نہیں ہے جنہیں میں چھو سکوں یا سکوں میں اماں اور زینب میں توازن نہیں رکھ پایا شازیہ آیا! مجھے پتا ہے اماں کو مجھے سے بہت سے گلے تھے! نہیں لگتا تھا میں ان کی نہیں سنتا زینب کی زیادہ سنتا ہوں اور وہ ٹھیک سمجھتی تھیں۔ میں صرف اچھا شور برپا چاہتا تھا اور اچھا بیٹا بنانا؟ مجھے لگتا تھا۔ میں اگر برا بیٹا ہوں۔ تب بھی اماں کے لیے وہی شہباز رہوں گا۔ لیکن اگر میں برا شوہر ثابت ہوا تو میرا گھر اور بچے سب ٹل جائیں گے۔ اس لیے میں کبھو واپس نہ آؤں گا۔ یہاں تک کہ ظفر کی موت کے بعد وہ جو ایک پانچا سا احتجاج کا عنصر بچا تھا مجھ میں وہ بھی ختم ہو گیا اور پھر یہی کچھ ختم ہو گیا شادی آپاش تو کہیں کا نہیں رہا۔“

”نہیں شہباز! تم نے اپنے گھر کو جانے کے لیے جو کیا۔ اماں بھی جانتی تھیں۔ حنفیہ بھی تم سے ہمدردی رکھتی تھی میں نے ان کے آخری وقت میں تمہارا نام لے کر کہا تھا تمہوں نے آپ کی کوٹھی معاف کی تھی وہ جو دنیا میں کائنات جیسے بر آپ کے لیے تری تھی تھی تمہیں کیسے ممکن تھا کہ آخرت کے لیے آپ کو مورد الزام لوگوں میں کھڑا ہوتے دیکھ سکیں۔“

شہباز پھر بہت مدد ہم لیے میں بولے تھے۔  
”لوگ کہتے ہیں ابراہیم مصر نہیں متوجہ کرتا ہے کچھ لوگوں کے لیے وہ عبرت پتھ کے لیے لینڈ سٹی اور کچھ کے لیے جتو سب اس کی مسز کی طرف دوڑتے ہیں کہ وہاں کیسے لوگ رہتے تھے مگر ہم جن کے ساتھ رہتے ہیں۔ انہیں پتا نہیں کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہیں توجہ نہیں دیتے اور خاک اڑاتے وہ باتوں میں دوڑ جاتے ہیں شازیہ آیا! پتا نہیں ہم سب کے بعد

اس گھر میں کوئی راجا لانے والا ہو گا بھی یا یہ عالی شان گھر کسی اجرام مسخر کی خاموشی جیسا اجازتین اور حسرت لے کر تھلا رہا ہے۔“

”ایسا نہیں ہو گا شہباز! میں خالد نے محبت باقی“ محبت بی تھی اور محبت تقسیم کرنے والے لوگ بھی ویران ہوتے ہیں نہ ان کے گھر اجازت ہوتے ہیں۔“  
شہباز ایک خوش گمانی کا ٹھکان لے کر واپس لوٹ گئے تھے اور اپنی ایک ایک رواد ڈائری میں لکھی تھی یہی ڈائری مونس کی ٹیبل پر پڑی تھی جیسے پچھلے ہفتے ہی اس نے پاپا کے اسٹڈی روم سے خراب کر دی تھی۔ وہ پندرہ بیس دن اس کے لیے لڑتے بھرے تھے۔ ماما اپنی ہر اہم کی وجہ سے ہی سمجھتی تھیں اور وہ جو سرمایہ کے لیے کچھ اچھا کرنا چاہتا تھا ماما اس کے خلاف اتنا سخت ایکشن لیتی تھیں کہ اس کے لیے زندگی گھر کے بجائے گھر سے باہر لڑی تھی عمر اور ارم ٹاپا کے موٹے کی وجہ سے اس سے دور رہتے تھے وہ اگر ان کے لیے ظفر جیسا بھائی بننا بھی چاہتا تو ان کے کہنے سے ناگرم کر دیتے ہیں اور اس کے اور گھر بھائی کا ایک مطلوب مھرا تھا اور اس لیے اس مھرا میں وہ تمنا بیٹھا تھا ظفر بھائی کی تصویر اس کے سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی جس طرح ایک بچے کو ماں کی گود یاد آتی ہے اسے ظفر بھائی یاد آ رہے تھے۔

”کاش! اس دن آپ نہیں میں زندگی بار جانا ہم از کم ماما مجھے دل سے روٹیں۔ اب میں زندگی کے اس کنارے پر کھڑا ہوں، کوئی بھی لمحہ مجھے زندگی کے اس پار لے جا سکتا ہے مگر ظفر بھائی کی موت سے زیادہ کئی ہے میرے لیے تم مجھے یہاں کوئی ایک لمحے کے لیے نہ روٹے گا“ اور بھول جانے گا! میں میرا کہہ بھی بھی مجھے اپنے اکیلے پن سے گھبرا کر یاد کیا کرے گا۔

اس کی آنکھ کا نم چہرے پر پھیل گیا تھا۔ پھر وہ کچھ اور سوچنا چاہتا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکا تھا۔  
”ماما! کیا آپ کے دل میں میری ذرا سی گنجائش ہے۔“ اس کا دل زور زور سے دھڑکا تھا جب اچانک

زینب شہباز نے لڑائی ہو کر پھلکارا تھا۔  
”تمہاری یہ جرأت کہ تم پیرس بغیر پوچھے اٹھا لیجئے ہو۔“

”اتفاق سے تمہارا تو دور کا بھی تعلق نہیں، تمہیں پتا ہے پچھلے ایک ہفتے سے تمہارے پاپا اپنی یہ ڈائری ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہر روز مجھ سے پوچھتے ہیں کی آپ کی گم شدگی سے اتنا اداس اور پریشان میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا، تمہیں کسی کی تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوتا ہے۔“

”آپ کا صرف ایک براہم سے ماما! آپ کو پرانی چیزوں کو الٹنگ کر کے سنبھال کر رکھنے کی عادت ہے، اس ڈائری کے لیے آپ بھنا مجھ سے لڑ رہی ہیں کبھی اپنی ضد اپنی انا اپنی خود پسندی سے لڑتا میں تو شہباز ہمارے گھر کا دن ایک طلوع ہوتے سورج کی کرن جیسا ہوتا، ہم الگ الگ زندگی سے ہارے ہوئے لوگوں کی طرح نہیں جیتے بلکہ واقعی زندگی جیتتے۔“

اس نے ہنسا تو وقت کیا پھر اس نون میں بولا۔  
”ظفر آپ کو تمہوں پر ویسے چلانے کی ایسی عادت ہے کہ زندگی بھی آپ سے چلے ہی تو دوسری نہ کہیے۔“  
مجھے پتا ہے میں انھی آپ کو یاد نہیں آؤں گا مگر جب سٹی میں ٹی ٹی ہو کر مل جاؤں گا تو آپ مجھے بھی ظفر بھائی کی طرح یاد کیا کریں گی، یاد کریں گی آپ کو اداسی اور دکھ سے لگاؤ ہے ورنہ زندگی اپنی بے رنگ نہ ہوتی۔“

زینب شہباز نے غصے سے اسے دیکھا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ تم اتنے بد تمیز ہو گئے ہو تمہارے بیٹا کو تمہارے پارے میں نے سرے سے بریف کرنا پارے گا مجھے۔“ اس نے کچھ نہیں کہا تھا اور لائٹ آف کر کے لیٹ گیا تھا۔

زینب شہباز ڈائری کرنے میں اٹھا لائی تھیں پھر جیسے جیسے وہ صفحے الٹی کیں، ان کی ذات کے سارے پتھر ایک ایک کر کے اپنی جگہ چھوڑنے لگے تھے یہ تو بہت مضبوط تعمیر تھیں، زندگی میں ہمیں کبھی کسی مقام پر



انہوں نے ہار نہیں مانی تھی۔ ہر جگہ شہباز صاحب جھکے تھے اور وہ ہر بار اپنی جیت کو بچیلے سے زیادہ مستحکم کر کے لینی تھیں زندگی میں اگر واقعی کسی کو دکھ کو دل میں جگہ دی تو وہ ان کا لاڈلا بیٹا تھا مگر آج کھلا تھا۔ وہ اس بیٹے کے سامنے کتنی بڑی نوزر تھیں۔ انہیں آج اپنی ماں بہت یاد آتی تھیں۔ جنہوں نے انہیں جب بھی کوئی سبق دینے کی کوشش کی تب انہوں نے اپنے لفظوں سے ان کو رو کر دیا تھا اپنی بے بسی کے ایسے نقشے کھینچے تھے کہ وہ روز چاہتے ہوئے انہیں سپورٹ کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ "لوئی کو گھر سے سپورٹ ملے تو وہ اپنا گھر بھی نہیں بتاتی شہباز بہت سنجیدہ اور نفیس انسان ہے اپنا زہن تب میں صبر حوصلہ اور برداشت نہیں ہے راحت صاحب۔"

اماں کے یہ الفاظ وہ ایک نہیں کسی بڑے ایک قسم کے دوروں میں دوہرا چلنی تھیں اس سے قبل انہیں اپنی غلطی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اتنی سچی اور خالص نفرت کا پڑھ کر ان کی چشموں پر ٹپک گئی تھیں۔

"ظفر! وہ زمین پر بیٹھی آج صبر پر ہاتھ رکھ کر رہ رہاں تھیں۔"

عمر اور ام کہیں گئے ہوئے تھے۔ شہباز صاحب آفس میں تھے صرف مونس ہی تھا جو اٹھ کر ان تک آیا تھا۔

"آپ نے کیوں پڑھی یہ ڈائری آپ کو نہیں پڑنا چاہئے تھی ماں۔" اس نے انہیں بازوؤں میں بھرا تھا اور وہ ذہنی طور پر اتنی ابتری کا شکار تھیں کہ انہوں نے اس کے ہاتھ نہیں جھینکے تھے۔

"ماما آپ بیڈ پر بیٹھیں میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔" انہوں نے اسے جانے نہیں دیا تھا ہاتھ تمام لیا تھا پھر ٹوٹے لیج میں بولی تھیں۔

"کیا واقعی ظفر مجھ سے نفرت کرتا تھا اتنی نفرت کے زندگی کو گنوا تا چاہتا تھا۔؟"

خالق آنکھیں اس پر جھمی تھیں تب ہی اس نے ان کا سراپے بیٹے سے لگایا تھا۔ "نہیں ماں! ظفر بھائی کو کسی سے بھی نفرت نہیں تھی ان کے دوست اور

سارے گزنو سے پوچھ لیں انہوں نے کسی ایک سے بھی کبھی نفرت نہیں کی۔ وہ صرف محبت کی منلی سے گوندھ کر بنائے گئے تھے انہیں صرف محبت کرنا آتی تھی۔ وہ سب کے ساتھ یکساں دل سے ملتے تھے ماں! وہ سب جذباتی باتیں تھیں ایسی باتیں تو میں بھی اکثر کر جاتا ہوں مگر تمام تر نفرت کے باوجود آپ کا دل جانتا ہے میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں مرنے کی زندگی میں آپ اور پاپا کے سوا ہے ہی کیا جیسے ظفر بھائی کے لیے آپ پاپا اور میرے سوا کچھ نہیں تھا۔"

وہ کچھ نہیں بولی تھیں مگر کچھ پر رکھ کر لیٹ گئی تھیں۔ وہ انہیں تمنا رہنے کا موقعہ دینا چاہتا تھا سو آستنی سے ان کے کمرے سے باہر آ گیا تھا اور زینب شہباز کے سر پرانے شوہر سے ملتا تو خیال رکھتا ہے تیرا۔"

اور ان کی جوانی ان کے بچا پے سے لڑ بڑی تھی۔ "کب رکھتے ہیں وہ میرا خیال آج تک ایک بھی سٹکھ نہیں ملا مجھے ان سے۔" اماں نے کالوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

"توبہ کر زینب! ناشکری نہ کیا کر اللہ کو یہ سب بہندہ نہیں میرے آقا کا قرآن ہے عورتیں اسی لیے جنم میں جائیں گی کہ جب تک سٹکھ ملتے ہیں تو غم و غم و غم ہی ایک بھی تکلیف شوہر سے ملتی ہے تو کتنی ہیں ہمیں آج تک کوئی سٹکھ نہیں ملا تم سے تو قرآن پڑھی ہوئی ہے۔ پھر جمالت کی باتیں کیوں کرتی ہے شہباز بہت پیارا انسان ہے گھر میں ترتیب دوا ان چاہتا ہے اس پر گھر میں بڑے ہونے کی وجہ سے بڑی زبرداریاں ہیں اس لیے جیسے وقت نہیں دے پاتا مگر جب فارغ ہوتا ہے تو اڈ کر تیرے اور بچوں کے پاس ہی آتا ہے۔ پھر تو بچوں شکوے لے کر بیٹھ جاتی ہے جو مرد و عورت کے باز ہوتا ہے تا وہ آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات نہیں کرتا کیا کبھی شہباز نے تجھ سے منہ موڑ کر اپنی مصروفیات گنوائی ہیں؟"

زینب شہباز نے مگر کھلایا پھر سر اٹھایا تو وہ ہی تھیں

تھا۔

"نہیں پتا ہے میں غصے کی تیز ہوں تو وہ اپنا غصہ ختم نہیں کر سکتے۔"

"مرد غصہ کبھی ختم نہیں کرتا۔ عورت کو ہی دجیما ہوتا ہے۔ وہ تیرے گھر نہیں آیا تو اس کے گھر گئی ہے پھر کبھی ظفر اور مونس کو دکھانے بہت کتنے سسے ہوئے ڈرے ہوئے رہتے ہیں۔" اماں نے سسے سر سے سمجھایا مگر۔

"ظفر سمجھ دار بچہ ہے دیکھئے گا وہ چند سال بعد اتنا مضبوط سہارا ہو گا میرا کہ پھر شہباز چاہیں بھی تو مجھ سے تیز آواز میں بات نہیں کر سکیں گے۔"

"اماں! آپ اور میرے کو ایک دو سرے کے مخالف کھڑا کر کے کی تو بھی تیرا ہی گھر برباد ہو گا دونوں میں سے کسی ایک کو پھینکا آسمان نہیں اور محبت رشتوں کے رچ رہ جائے تو ہی گھر بننا ہے زینب۔" اماں کہہ کر چلی گئیں اور شام کو زینب کی بھانجھی سمجھانے آئی تھیں۔

"نہیں پتا ہے ماں باپ کی لڑائی سے بچوں پر کتنا برا اثر پڑتا ہے ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے ایسے بچے جن کو والدین کی طرف سے مضبوط سپورٹ نہیں حاصل ہوتی وہ اپنی بقا کی جنگ کے لیے پھر ہر غلط اور صحیح کو اپنی زندگی میں پیلانی کرتے ہیں وہ بوجہ بھی ہو سکتے ہیں اور معاشرے کے سب سے کرپٹ انسان بھی۔"

"بھانجھی پلیز فضول باتیں مت کریں مجھ سے ایسا میں نہیں جانتی کہ آپ اور بھائی کتنا لڑتے ہیں۔" وہ غصے میں ہر حد چھلانگ جاتی تھیں انہوں نے ٹوڈ کو منیالے ہوئے کہا۔

"ہاں ہم لڑتے ہیں مگر بچوں کے سامنے کبھی نہیں لڑتے ہماری لڑائی بیڈروم کے اندر ہوتی ہے۔" باہر ہم ایک دو سرے کو عزت دیتے ہیں اور بچے ہم سے ہی سیکھتے ہیں۔"

وہ منہ پھیر کر اپنی دی آن کر کے بیٹھ گئی تھیں تب بھانجھی نے اپنی زندگی کا ٹکھن کام کیا تھا ان کا ہاتھ تمام

کران کی ساری بد قسمتی پر اس نرٹی سے کتا تھا۔

"مونس کتنا چھوٹا ہے مگر تم نے یہ دیکھا ہے وہ رو توں میں سے پیار نفرت اور بے توجہی کو کتنی جلدی مار کر کرتے لگا ہے اگر ایسا ہی رہا تو زینب یہ بچے اپنی عمر سے بہت پہلے کم سنی کی عمر چھلانگ جائیں گے اور ایسے بچے جو کم سنی سے یکدم عمر و سمد کی میں چلے جاتے ہیں ان کی زندگی میں سب کچھ ہو تب بھی زندگی کی بے رنگی کتنی ختم نہیں ہوتی۔" اکیلا بن غیر محفوظ ہونے کا احساس انہیں دل سے ہٹنے نہیں دیتا کیا تم چاہتی ہو تم ایسے بچوں کی ماں کہلاؤ؟"

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، ان کے اور بھانجھی کے درمیان خاموش چپ اگر بیٹھ گئی تھی اور اتنے سالوں بعد یہ خاموشی لفظ ہی تھی تو کتنا زہر تھا اس کے لیے میں انہوں نے ڈائری شہباز صاحب کے اسٹوری روم میں رکھی تھی اور خاموشی سے بیستر پر آکر لیٹ گئی تھیں آنسو تھے کہہ کر کے کانام نہیں لے رہے تھے۔

"تمہیں وقت گزرنے کے بعد ہی کیوں عقل آتی ہے زینب۔" بڑے بھیا کا مونس ان کے ارد گرد بکھرتے لگا۔ انہوں نے کتنی محنت اور کتنی جدوجہد کے بعد شہباز کی زندگی پر تصرف حاصل کیا تھا۔ ایسا تصرف کہ وہ ان کی آنکھوں سے دیکھتے تھے ان کی کئی سنتے تھے مگر اس ڈائری کے ہر لفظ میں موجود تاسف نے انہیں آسمان سے زمین پر سچ دیا تھا صرف اپنا گھر بچانے کے لیے وہ زینب شہباز کو برداشت کرتے آئے تھے۔

اور وہ ظفر اس میں تو ان کی جان بند تھی مگر وہ بھی اپنی ماں کو ناکام لوگوں کی صف میں لے جا کر کھڑا کر چکا تھا اور ایک یہ مونس ہے یہ بھی پتا نہیں کیا سوچتا ہے میرے بارے میں۔

توچ پوچھ باران کے دل یہ بات آئی تھی کہ وہ جانیں کہ مونس ان کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔

وہ لیٹے سے اٹھ کر یکدم بیٹھ گئی تھیں اور انہیں لگا تھا ان کی سانس ان کے سامنے اکھڑی ہوئی ہیں۔



”کیا ملا زینب تمہیں ایسا کر کے؟“ مینا چھین لیا تھا تو بھی دل نے کوئی دہائی نہیں موی گیا ہوتا اگر جانتے سے میں اپنے بیٹے سے دو گھڑی بات کر گئی تو ایک خاموش بے ضرر عورت تھیں وہ خود سے مکالمہ کر رہی تھیں صاحب وہ اپنی تین جوان اولادوں کا دکھ دل میں محسوس کر رہی تھیں تم نے اپنے ہوان بیٹے کی موت کا دکھ سہاگر پھر بھی تمہارا دل نرم نہ ہوا سخت ہو کر پتھر ہو گیا۔ ایک عورت پتھر کیسے ہو سکتی ہے؟ زینب عورت کے دل کو تو خدا سخت کر دیا اور نرم نہ پایا مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔“ انہوں نے گھر سے کی لائٹ آن کر دی تھی۔ اندر گاڑ پتا نہیں باہر آکر کیوں بیٹھا گیا تھا شاید جذباتی طور پر آج سے پہلے وہ اتنی کمزور نہیں پڑی تھیں کیونکہ وہ بزم شوقانے شوہر کی محبوب ہوئی اور ظفر کی محبت کرنے والی مام تھیں مگر آج یکدم کسی نے ان کے ہاتھ سے سب کچھ چھین لیا تھا وہ کمزور اور کوزل کھڑی تھیں۔

”یہ بڑے ٹھیکے گھر کے نیچے رہے وہ بالکل بے جان بیٹھی تھیں۔“ مام اب کیسا قفل کر رہی ہیں میں نے بیبا کو فون کیا تھا مگر ان کا نمبر بڑی جارحانہ ہے وہ آفس میں ہیں انہی تک۔“ ”مونس دوبارہ کیوں آیا تھا؟ کیا وہ ان کی کم ہائیلی ان کے دکھ کا تراشوا کیسے آیا تھا؟ ایک دم سے آسمان سے زمین پر گرنے سے کیسی تکلیف ہوتی ہے۔“ مینا نے نہیں مونس سے وہ کوئی اچھی سوچ کیوں وابستہ نہیں کر پاتی تھیں حالانکہ ان کی بیانی اولادوں میں وہ ان کا سب سے قراں برادر بیٹا تھا۔ آج پہلی بار انہوں نے اس کا چہرہ غور دیکھا تھا۔ ”ماما! میں غصہ آئی کو بلاؤں وہ آپ کو بہت اچھے سے سمجھتی ہیں۔“

اس نے زینب شہباز کا سٹل فون اٹھایا تھا اور وہ اس کی بے قراری دیکھ رہی تھیں رات کے بارہ بجے ان کا شو ہر آفس میں اپنی فائلوں کے ساتھ گم تھا۔ ان کا عزیز بیٹا دوستوں میں مومن مستی کے لیے نکلا تھا تو آرام کے

دوست کی دیوان بعد شادی تھی اور وہ اس کے گھر ٹھہرتے تھی مونس اور ان کے لیے وہی قصا جو پریشان کن تھا۔

وہ ایک ایسا بچہ تھا جس کو انہیں یاد نہیں پڑتا بھی نرمی سے دیکھا ہوا ہوتا تھا۔ ”مونس آپ کو مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے مام۔“ ایک بار ظفر نے اپنے ناز اٹھائی ہوئی مام کو بتاتے ہوئے عجیب سے لمحے میں کہا تھا سب انہوں نے اتنے غور سے پڑے کو تھا سے گھر سے مونس کو نہیں دیکھا تھا مگر کیا واقعی وہ ہمیشہ سے ظفر کے ہوتے ہوئے مونس کو اہمیت نہیں دیتی تھیں؟ نئی واقعات ایک ساتھ یاد آگئے تھے ہر واقعہ میں مونس شہباز آیا گیا تھا اور ظفر اور اس کی زبان پر حرف احتجاج تک نہ ہوا تھا پہلے ظفر کی وجہ سے وہ اس کی طرف متوجہ نہ ہو سکیں اور ظفر کی موت کے بعد وہ خود بخود ان کی زندگی کے کیوس سے صاف ہو گیا تھا۔

”اپنے گھر سے تین دن بعد میرا آپ پیش ہے۔“ مونس نے کہا۔ ”یہ شخص ایک وہیم ایک خوش ملن خیال کا دامن تھا سہ سے کھڑا تھا۔ اگر کوئی اجنبی ہوتا تو کیا ان کا دل نہ تیرتا پھر یہ تو ان کے اپنے وجود کا حصہ تھا مگر اتنے سالوں کی جو خاموشی اور لفظوں کی تلخی ان کی طرف سے اس رشتے میں خلل پکٹی تھی وہ کیسے اسے مٹھاس میں بدل لیں۔“

”غصہ آئی کا نمبر بند ہے مام۔“ وہ ان کی سوچوں سے دور اب بھی صرف ان کے لیے ہر اسان تھا۔ ”مونس! بہت وقت سے انہوں نے کہا۔ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ اتنی محبت سے کہ ان لبوں نے اسے پکارا تھا۔

”خیریت ہے ماما۔“ ”مگر جا کر سو جاؤ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ یکدم ٹھہر گئی تھیں۔ اس کے لہجے نے انہیں سہاوا تھا مگر وہ کمزور بن کر اس کے سامنے آئیں گی تو وہ کہیں اتنے برسوں کی تلخی

کا بدلہ ان کی لقمہ لٹ کر گئے نہ لے اور آج رات وہ دو اتنے قریب ترین رشتوں کے ان پر کیے گئے گھٹت کو سہ نہیں پار رہی تھیں۔

”تمہارے سر میں بھت درد ہے؟“ انہوں نے نرمی سے کہا وہ ابھی تک خاموش کھڑا تھا ان کے کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا اور ان کا دل اس درجہ توجہ پر پتھر سے ممتا سے بھر آیا تھا۔

ممتا کا گوشہ تو شاید شروع سے تھا ظفر کی موت سے پہلے بھی ظفر کی موت کے بعد بھی مگر لفظوں میں بس سفاکی در آئی تھی جتا نہیں کیوں شاید وہ اس طرح احتجاج نہیں کرتا تھا جس طرح کے احتجاج سے کوئی وجود اپنے ہونے کا یقین دلا سکتا تھا۔

”پتھکے بہت تھا مام! مگر ابھی میڈن مل ہے تب کہیں تھوڑا درد کم ہے۔“ ”گوھر بیٹو۔“ انہوں نے دل میں کہا زبان سے نہیں اور وہ مایوس بنا ہو گیا۔ اسے لگا تھا کوئی ڈرل سا درد پکھت کا اس کے لیے کھلا تھا گرام کاروبار مام چننا کر رہا تھا۔

اس نے زینب شہباز کو سیلیننگ پلڈوی تھی پھر ہونے سے ان کے رویے سے بے تیار ہو کر ان کی پیشانی پر دم کر بولا تھا۔ ”سب بھول جائیں مام! آپ بیبا کے لیے اچھی دانف اور ظفر بھائی کے لیے بہت محبت کرنے والی ماں ہیں۔“

”اور تمہاری کسی ماں ہوں میں۔؟“ ان کا دل چاہا وہ یکدم اس کا ہاتھ تھام کے پوچھیں مگر تھکا ہوا دل چاہے کہ نیند کی داوی میں اتر گیا تھا پھر صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو شہباز پہلے سے جاگے ہوئے تھیں وہی دیکھنے کے ساتھ ساتھ چائے پی رہے تھے۔ ”آج تو بہت مزے کا رو کر مام چل رہا ہے پاکستانی رسم و رواج شادی زیادہ کے گیت کی تہہ ہم کے ساتھ دکھا رہے ہیں۔ ایک ہفتے پہلے ہی تم مونس کی شادی کی بات کر رہی تھیں نا۔“

وہ ست قدموں سے چلتے ہوئے ان کے برابر

صوفے پر ٹکر بیٹھ گئی تھیں اور ان کا سویا چاگا دل چیراں تھا انہوں نے اتنی کمزورت کے باوجود مونس کی زندگی کے بارے میں کب اور کیسے سوچ لیا تھا۔

”تمہاری آنکھیں اتنی سرخ کیوں ہو رہی ہیں زینب؟“ اور زینب شہباز پھر سے آنسوؤں میں بھجک بھجک گئی تھیں۔

”ظفر یاد آ رہا تھا پھر؟“ شہباز صاحب نے اندازہ لگایا اور وہ خاموشی سے ان کے کندھے سے ٹک کر ہونے سے سہلا کر رہ گئیں؟

اور شہباز صاحب نے انہیں دیکھ کر نرمی سے کہا۔ ”اسے تمہا میں بھلا ہی کب پانے ہیں کہ وہ ہمیں یاد آئے وہ تو پھر کچھ ہمارے اندر ہمارے ساتھ جیتا ہے زینب۔“

اور جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے مونس یکدم ایک بیگ کا ڈرہے پڑا دل کران کے سامنے آگھڑا ہوا تھا۔ ”کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے بیبا؟“ ”کہاں جانا ہے وہ بھی اتنی صبح صبح جاؤ وہ حیران ہوئے۔“

اور مونس بہت سہم ہو کر بولا۔ ”تین دن بعد میری مہر جی ہے برن بیو مہر کی وجہ سے۔“ شہباز صاحب کے ہاتھ سے کپ پھوٹ گیا تھا اور زینب شہباز نے اس خیر کو ایسے سنا وہ جیسے پہلی بار سن رہی ہوں۔

”تم نے ایک مرتی ہوئی ماں سے اس کے بیٹے کو ملنے نہیں دیا، دیکھ لینا وقت تمہیں اس عمل کی تلخی سخت مزو سے گا۔ اتنا کھو تو کوئی سفاک قابل بھی نہیں ہوتا جتنی تم ہو زینب!“

کبھی شہباز قبا کے کے لفظوں نے ان کے اندر بھنور ڈال دیئے۔ ”پی مزہ ہے کہ ایک پٹا چاہتے ہوئے اپنی مرتی ہوئی ماں سے نہیں مل سکا اور میں اس شخص کے سامنے ہوں یہ ہو میرا بیٹا ہے میرے وجود کا حصہ ہے میں چاہ کر بھی اس کا ہاتھ تھام کر یہ نہیں کہہ سکتی مت جاؤ۔ میں



تم سے ایک ماں کی طرح ہی شہادت سے محبت کرتی ہوں۔  
"ایک ماں دو سوسری ماں کو بددعا نہیں دے سکتی۔" ان کا دل گر لایا تھا اور شہباز صاحب نے ان کا ہاتھ پھینچ کر پھر سے کہا تھا۔

"زینب! تم نے ناموسوں کو کیا کہہ رہا ہے؟" اور موسیٰ شہباز نے دکھ سے کہا تھا "وہ جانتی ہیں پاپا! مگر انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ کو بھی کوئی فرق پڑتا ہے کہ انہیں اس لیے ایک دوست کو بھی اسٹینڈ بائی پر رکھا ہے پہلے میرا ارادہ تھا وہ ہی مجھے ہسپتال لے جائے مگر پھر میں نے سوچا میں آپ کو بھی اطلاع کروں کیونکہ آپ کو مجھ سے ویسے ہی شکایتیں ہیں کہ میں اپنی مرضی بہت کرتا ہوں۔"

لحہ بھر کور کا پھر بولا۔ "سامیہ میرے ساتھ ہے اگر میں آپریشن ٹیبل سے واپس زندہ نہ آسکا تو اس کو میں نے اپنی تدفین کا اختیار بھی دے رکھا ہے آپ چاہیں تو شریک ہو جائیے گا ورنہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اکیلا بیٹھے والا انسان اکیلا مرضی سکتا ہے کیونکہ اکیلے پن کا دکھ تو صرف زندگی تک کا ہوتا ہے نا پاپا۔"

شہباز صاحب یکدم اٹھ کر اس کے قریب آگئے تھے بھر بہت خفگی سے بولے۔

"موسیٰ! تمہارا داغ خراب ہو گیا ہے تمہیں کسی نے کہا۔ مجھے تم سے محبت نہیں۔"

"مجھے آپ نے یہ احساس کب دلایا تھا کیا کہ آپ میرے بھی ہیں مجھے تو لگتا تھا آپ صرف عمر آرم گئے پاپا ہیں اسکو ہویا زندگی پر جگہ میں اکیلا چلا ہوں یا صرف ظفر بھائی کی محبت تھی جس نے مجھے تقاے رکھا ورنہ کتنی بار زندگی کی کٹی کو ایک ہی گھونٹ میں پی جانے کو دل کرتا تھا آپ کو ہتا ہے میری دراز میں سلیڈنگ چلڑیوں اور اور زہر ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مگر میں زندگی پر اور زندگی بنانے والے کی محبت پر اندھا یقین رکھتا تھا اس لیے آج تک حرام موت مرنے کی کوشش نہیں کی مجھے لگتا تھا کبھی تو زندگی میری کتاب

میں محبت کا باب رقم کرے گی کبھی تو میں بھی آپ کو یاد آؤں گا مگر اتنے برسوں بعد مجھ پر کھلا ہے محبت مرے لیے نہیں بنائی گئی۔"

شہباز صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا "یہ گمانی مت کرو وہ تم جانتے ہو تمہارا دل بھی جانتا ہے مجھے تم سے کتنی محبت ہے موسیٰ۔"

موسیٰ نے چونک کر شہباز کی صاحب طرف دیکھا تھا یہی پہلے اس نے نام سے کہا تھا۔ اس کے پاپا اس کی طرح سوچا کرتے تھے۔  
"ہم جو سوچتے ہیں ایک دوسرے کے لیے وہ ہم کہتے کیوں نہیں پاپا۔ ہم انتظار کرتے کرتے خود بھی تشہ کام رہتے ہیں کسی اور کو بھی تشہ کام ماردیتے ہیں۔"

پاپا نے کچھ نہیں کہا تھا اور اسے خود سے لپٹا لیا تھا اور زینب شہباز یکدم اٹھ کر کہیں اندر گم ہوئی تھیں۔

"لہذا آخری بار بھی مجھے یاد نہیں کریں گے پاپا۔" "آخری بار کیوں بہت بار کریں گی تم نے دیکھا نہیں سوچنا ہے موسیٰ۔"

پاپا سے لے گئے تھے اور وہ فون پر شازیہ آپا سے معافی مانگ رہی تھیں۔

"ماں! مجھے بددعا نہیں دے سکتیں۔ کہہ دیں نا شازیہ آپا! وہ میرا موسیٰ آج اس کا آپریشن ہے۔ برین ٹیو مر ہے اسے کور میں چلا کر بھی اسے اسے سینے سے لگا کر اس کو اپنی ممتا کا حوصلہ نہیں دے سکتی ماں تو بہت محبت کرنے والی روح تھیں نا پھر مجھے کیوں بددعا دیں۔"

شازیہ آپا اٹھ اٹھ کر ہراساں ہو گئی تھیں۔  
"کوئی ماں دو سوسری ماں کو بددعا نہیں دے سکتی تم گھبرائو مت۔ یہاں ہیں نا اتنے سارے لوگ اس کے لیے دعا کرنے والے تم بھول جاؤ برائی باتیں نہی طرح سے جینا شروع کرو چاہو اسے گلے لگا کر کہو۔ تم اس سے کتنا محبت کرتی ہو وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاسکے گا۔ تمہاری محبت کی کشش اسے جانتی ہی نہیں دے

میں تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا وہ اس کی بھینٹ پر کوئی امید کا جتنور رکھتا۔  
"ہر رادار م سے ملنا تھا مجھے مگر میں انہیں نہیں مل پاپا۔"

"میں نے کہہ دیا ہے وہ ہسپتال ہی آجائیں گے۔" پاپا نے کہا اور اس کی آنکھوں کا خالی پن دیکھ کر گرا لے۔

"سچ پوچھو تو ان دونوں بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے میری بے توجہی اور تمہاری ماں کی ہر وقت تم سے المسلطگ رویے نے انہیں بھی تمہارے قریب نہیں آنے دیا۔ محبت تو وہ بھی کرتے ہیں مگر وہ جذباتی طور پر تم سے استا الفج نہیں اور بات ہم اچھی طرح جانتے ہو میں جب پاکستان گیا تھا مجھے لگتا تھا میں سب کچھ ٹھیک لوں گا لیکن واپس آیا تو زندگی نے ویسے ہی ہاتھ باندھے رکھے۔ تمہیں جب بھی دیکھتا تھا مجھے ظفر یاد آجاتا تھا اور میں تمہارے قریب آتے آتے رہ جاتا تھا۔ بہت عرصے بعد میں نے سوچا میں نہ سہی تمہاری اگر تمہاری زندگی میں آجاتے تو تمہاری زندگی کی ہر کی دور ہو سکتی ہے۔"

"کیا کسی ایک رشتے میں اتنی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر رشتے کا تم البدل بن سکے؟" ایک نیا سوال پاپا نے بار کر کر سنا لیا تھا۔  
"میں اور زینب لوزر ہیں۔ ہم نہ اچھے میاں بیوی بن سکے نہ اچھے بیٹا ہو سکے کردار بنا سکے نہ اچھے ماں باپ بن سکے ہاں دنیا کے لیے محبت گنوا کر ہسٹ چل کا منفہ ضرور حاصل کر چکے ہیں مگر محبت گنوا کر کچھ اور دہ جانا ہے زندگی میں کرمہ جی سکیں۔"

وہ پتا نہیں سوال کر رہے تھے یا جواب دے رہے تھے مگر یہ تھا کہ اس کے ہسپتال میں ایڈمٹ ہونے کے چند روز ہی منٹ بعد ہی ارم اور عمر اس کے قریب بیٹھے تھے ہونق پریشان عمر تیرہ سن کی تفسیلات لے کر آیا تھا اور جی جان سے دال گیا تھا۔

"میں آپ کے قریب نہیں تھا مگر سچ نہیں ہے کہ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے جس حالات زندگی

کی۔ زینب درمست کرو۔ فوراً چلاؤ اس کے پاس۔" انہوں نے فون رکھا تھا اور چپکے سے بیڑھیاں اترنے لگی تھیں۔

کار شہباز صاحب ڈرائیو کر رہے تھے ان کا رخ ہسپتال کی طرف تھا اور وہ تھا ہر چیز کو پہلی بار کی طرح دیکھ کر آخری بار کی طرح دوران کر رہا تھا ہم زندگی میں جب تک جیتتے ہیں ہمیں لگتا ہے ہم جیتتے رہیں گے موسیٰ ہمیں ہر چیز بے معنی لگتی ہے لیکن ہمیں پتا چل جائے زندگی ہمارے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے رت کے ذروں کی طرح پھین رہی ہے آخری گمانی کی طرح تو ہمیں زندگی کی ہر بات میں ایک نئی بات لگتی ہے۔ موسیٰ! ہوا زندگی ہر چیز خود سے باتیں کرتی محسوس ہوتی ہے نا پاپا۔"

"اسے مت بولو تو ہمیں زندگی کا یہ معرکہ سامیہ کے لیے سر کرنا ہے موسیٰ! کل میں آس میں نہیں تھا زینب کی آنکھوں و اہم دوست فضا کے پاس گیا تھا اس کی باقی رہا وہ آٹھ بج کر کے تھیں کرتی ہے۔ باقی ہے اس کی بات۔ دنیا میں بس زندگی ایک ہے جس کے پاس تمہاری ماما کو سہرا ڈگروا نے کا ہنر موجود ہے تمہاری ماما تمہاری شادی کا تذکرہ بہت بار کر چکی تھیں۔ موسیٰ اسے یہی سمجھانے گیا تھا کہ وہ کس طرح زینب کو اس مجال میں سامیہ کے نام پر تڑپ کر سکتی ہے۔"

"کس طرح شریب کر سکتی ہیں ماما کو وہ۔" اس نے یونہی پوچھا۔

لوہ پاپا مسکرا لے۔  
"یہ بہت خفیہ ہے یہ نہیں بتایا جاسکتا تم بس تم کھاؤ پڑمت گنوا سامیہ سے شادی کرو اور اپنی زندگی مزے سے گزارو۔"

"شادی اور زندگی۔" وہ حسرت زدہ ہوا اور پاپا نے اسے غور سے دیکھا مگر موسیٰ عام سی بات کی طرح ایک بہت خاص بات سن کر خوش نہ ہو سکا وہ سامیہ کو کوئی عہد کوئی خوش گمانی نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس لڑکی کے کتنے برس اس گھر میں گزرے تھے ایک ملازمہ کی طرح اس لڑکی کے پاس کوئی خواب زندہ



نے ایک اور ٹھکانا دیا تھا۔ بھائی مونس اس رائے کو توڑ نہیں سکا نہ ہی کسی آپ نے ہی ہاتھ دھوا کر اس رشتے کو نئے سرے سے جینے کی کوشش کی پھر ماں کی آپ سے نفرت پلپلا کی ہے تو یہی میرا دل میں ان ہی الجھاؤں کی وجہ سے آپ کے قریب نہ آسکا۔ مونس نے اس کا چہرہ دیکھا۔ ساری رات جاگنے کی وجہ سے آنکھیں سرخ تھیں دو دنوں ہی مونس نہیں سکتے تھے مگر اس کے لیے یہاں بیٹھے تھے کاش وہ مدت پہلے اس محبت کو پکار لیتا۔

تاکست سائل میں اٹھا اور اس نے عمر کے ہاتھ ختم کر کہا۔

”پرانی باتیں جانے دو۔ ہم اب تو ساتھ ہیں مونس یہ یاد رکھو۔“

عمر اور م سمرلا گریٹنگ سے انداز میں ہنس پڑے پھر وہ دونوں پیلا کے پاس آکر گرے تھے جب اسے بھائی میٹر آگئی ماں اس کے قریب بیٹھی تھیں اتنے قریب کہ وہ جانتا تو انہیں سمجھ سکتا تھا اتنوں نے اسے ڈھیر سارا پیار لیا تھا۔

”معم جانے دو نا ظفر کو ہارنا بالکل بے بند نہیں تھا۔“ اس نے ماں کی آنکھ کا آنسو انکلی کی پور پر لیا تھا اور ڈھیر سے مسکرایا تھا پھر دم سا بولا تھا۔

”مجھے زندگی بے زندگی کی سخاوت پر اور محبت پر پورا یقین ہے ماں اگر آپ یہ بھی کہیں مونس مرنا موت جیو میں تمہیں جی بھر کر ظفر کی طرح روٹنا چاہتی ہوں تو میں ایک لمحہ نہیں لگا تا اور مر جاتا ماں۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

”ظفر کو کھو دیا ہے میں نے مگر مونس میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی۔“ اس بار مونس کو حیرت ہوئی تھی اس بار ماں کا کس لے اپنے ہاتھوں پر جیتا جاتا محسوس ہوا تھا۔

”تو یہ کوئی خیال نہیں تھا۔“

اماں کے پاس صرف اس کے لیے ہر اسماں بیٹھی تھیں۔

صرف اس پر اپنی مسکرائی تھیں۔

”اماں۔“ اس نے اس بار ماں کو کچھ کہا تو چہرہ کو دیکھا تھا۔

”میں نے جو کیا بہت بڑا کیا مگر اب تم میرے ساتھ پر امت کرنا مجھ سے بدلہ لینے کے لیے مجھے چھوڑ کر مت جانا مونس میں بدلنا چاہتی ہوں میں تمہارے حصے کا سارا پیار تمہیں دینا چاہتی ہوں کیا تم مجھے میری غلطیوں پر معاف نہیں کر سکتے؟“

”اے مت بولیں ماں! آپ کی کوئی غلطی نہیں یہ تو بس قسمت میں لکھا تھا جو میں نے سہاں ہر دکھ پر تکلیف آج باطل ہوئی کہ آج میری ماں نے مجھے دل سے قبول کیا۔“

وہ ہنس پڑا تھا اس نے سامنے کوشیے کے پار سے دیکھا اور اپنی باپو سی کے ان لمحوں کو یاد کیا بوساں اگر اس پر طاری ہوتے تھے اس نے آنکھ بند کر لی۔

”کچھ ٹوٹک ہاتھ خالی کیوں رہ جاتے ہیں۔“ اس نے بیبا سے پوچھا تھا مگر بیبا ڈاکٹر کو دیکھ کر جس سے ملنے اٹھ گئے تھے اور اس کا وہاب سامنے نے دیا تھا۔

”ہمارے ہاتھ خالی اس لیے رہتے ہیں تاکہ ہمیں صبر کرنا آئے ہمیں صبر کرنا آئے گا تو ہمیں کوشی پور کی طرح خوش کرنے کی نظر ہر جو ہاتھ خالی دکھائی دیتے ہیں اگر وہ ہاتھ ان لوگوں میں محبت نسلی اور دلاسا پاتا جانتے ہیں تو وہ ہاتھ کبھی خالی نہیں ہوتے ایک غریب الدیار لڑکی سے پوچھیے اب کا ساتھ اس کے لیے ہفت الیم کی دولت سے کم تو نہیں تھا۔“ اس لمحے سامنے نے اس کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے تھے اور سوال کیا تھا۔

”کیا یہ اب بھی آپ کو خالی لگتے ہیں مونس؟“ وہ کچھ نہیں بول پایا تھا اور اس نے کہا تھا۔ ”زندگی ایک بار ملتی ہے یہ حتم بھی ایک بار ہی ہوتی ہے سو ہم پہلی اور آخری بار کے درمیان کا سفر لا حاصل کیوں گزاریں اور ہر دیکھیں کہ ہمیں جس جذبے نے ایک دوسرے سے ملایا۔ وہ ہر رومی انبیت ہو یا محبت یہ طے ہے ہمیں اب کوئی خوف ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا زندگی اور زندگی کا ہر راستہ مجھے صرف

آپ کے ساتھ طے کرنا ہے۔ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے جینا پسند ہے۔“ اس نے سر تھکا لیا تھا اور سامنے پھرتے ہوئے بولی تھی۔

”آپ لوٹ کر آئیں گے نا؟“

”دیکھیے زندگی نے ہمیں کبھی پسندیدہ منظر نامے میں بیٹھ نہیں کیا نہ میری خوب دیکھنے والی کسی شہزادے کے سنے بننے کی لہجہ عربے تاہی آپ کے لیے محبت سیرت مستحسن لاکوئی ترانہ ہے ہمیں زندگی نے ایک نا محسوس دکھ سے ملایا ہے اور جبران کہتا ہے جو دل کسی دکھ کی وجہ سے تنگیا ہوں وہ کبھی نہیں چھڑتے۔“

اس نے سمرلا کو سامنے کا ہاتھ ہولے سے دیا کر چھوڑ دیا تھا اور سامنے حسام الدین کی آنکھوں میں شگونی ستارے جگمگانے لگے تھے۔

”ظفر بھائی کی طرح آپ بھی مدت کم وعدے کرتے ہیں کیونکہ آپ وعدہ بھانا جانتے ہیں۔“

”کیا سوچتے لگے؟“ اماں نے مدہم سا پکارا اور وہ مسکرایا۔

”میں میرے ہاتھ بائیں خالی تھے مگر زندگی میں صبر کرنے کی سخاوت نے مجھے اس خوشی کو محسوس کرنے کا ایسا بہتر ہنستا ہے ماں کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ آپ سب کی کیفیتیں مجھے کبھی پار نے نہیں دیں گی۔ میرے ایک ہاتھ میں سامنے کی محبت ہے اسٹک کی طرح ایک ہاتھ میں آپ کی چاہت اور نہت اور دنیاؤں کو سنوار دینے والے اسم اعظم کی طرح اور دل میں بابا عجزار م اور ظفر بھائی کی محبت جو سسکے کی طرح موجزن ہے۔ مجھے زندگی کی سخاوت پر اور محبت پر آج ہی یقین آیا ہے محبت کی آنکھوں سے ابھرنے والی رخ کیسے ممکن ہے کہ مجھے اندھروں میں ڈوب جانے دے گی مجھے یقین ہے میں نہیں مر سکتا ماں! کیونکہ میں نے آج ہی بیٹنا سیکھا ہے آج ہی محبت کی مدد کو چکھا ہے اور میں محبت کی اس حیات نو کو پوری طرح دل سے محسوس کرنے کا تمنا ہی ہوں۔“

زینب نے مونس شہباز کی پیشانی چوم کر اسے

زندگی کی دعاوی تھی اور سامنے عجزار م شہباز صاحب اس دعا پر آمین کہتے اس کے ارد گرد مونس جو تھے۔

”محبوبوں کا یہ حصار جدائی توڑنا بھی چاہتی تو محبت کا خدا ایسا کبھی نہ ہونے دیتا کہ محبت اگر امید اور حیات نو نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں۔“

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بیدل	آمنہ بیانی	500/-
زردوم	راحہ نجیب	600/-
زندگی ایک روٹی	رخسانہ کاندھان	500/-
خوشبو کوئی کر نہیں	رخسانہ کاندھان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازینہ چوہدری	400/-
سیرت ماں کی محبت	شازینہ چوہدری	250/-
دل ایک شہر بنوں	آمینہ مرزا	450/-
آنکھوں کا شہر	فاخرہ افکار	500/-
بھول بھلیاں تیری گہرائی	فاخرہ افکار	500/-
بھلاں دے رنگ کا لہ	فاخرہ افکار	250/-
یہ گہرائی ہے چہارے	فاخرہ افکار	300/-
جس کا ہے موت	غزالہ عزیز	200/-
دل اسے ڈھونڈ لیا	آمینہ زبانی	350/-
کھرنا جا سکی خواب	آمینہ زبانی	200/-
بہتر کونسا تھی سجائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماں کا چاند	شرابی سعید	200/-
رنگ خوشبو ہولاد	اطصال آفریدی	450/-

ناول نگاروں کے لیے کتاب ڈاک ٹریج - 30/- دہے

منگوانے کا پتہ:

کتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 - اندھا دار کراچی۔

فون نمبر: 32216362



## قہقہے

بے تحاشا ہونے کا شوق اسے وراثت میں ملا تھا۔ اس طرح کھانے کا شوق بھی وراثتی تھا۔ نانا اور ستین پکانے میں ماہر تھے اور وہ کھانے میں۔

”ولنشیہا“ میں ننانے جب گھریا تو فریاد نے خوب داویلا مچایا تھا۔ ڈینٹس سے اٹھ کر ولنشیہا میں شفٹنگ کی کم از کم فریاد کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جس قدر بلند اور عالی شان اس ایسے کی عمارتیں تھیں اتنے ہی بلند اور پتھر پیلے لوگوں کے ہاتھ تھے۔ مزہ اور آہن۔ فریاد یہاں اگر خوب بد مزہ ہوئی تھی۔ وہ بھی پھسلنے والوں جاکنگ کے دوران اس نے ایک آئی کو چلو بولا تو وہ اسے نہ جانے کیوں گھومنے لگی تھیں۔ پھر بغیر کچھ کے پارک کی طرف چل دیں۔ فریاد نے اس تجربے سے لطف اندوز ہونے کے بعد تعلقات بنانے سے توبہ کر لی تھی۔

اہل بلاگ سے مارکیٹ کا فاصلہ تو اتنا نہیں تھا۔ تاہم فریاد جان بوجھ کر لہنا راؤ بیڑے لے کر آئی تھی اور اس تھا کا دینے والی راؤ بیڑے کی وجہ یہ قیامت کا موسم تھا۔ موسم کی خوب صورتی انجوائے کرتے اور گنٹاتے ہوئے فرسٹ ٹرن لینے کے بعد ایک دم وہ ٹھنک کر مرگ گئی تھی۔ ہری چیلی، خوشنما پھولوں سے دھکی بیلوں والی اس کے گھر کی بیرونی دیوار سے آگے بنے فٹ پاتھ پر ایک طرف رکھے پتھر پیلے بیچر جیٹاہ کوئی انسانی وجود ہی تھا۔ سکیوں کی دھپے دھپے سے آئی آواز اور اس کا ہلتا وجود دیکھ کر فریاد کا شک یقین میں بدل

شام کا سامنا تھا۔ صبح ہونے والی بارش نے ہر شے کو نکھار بخش دیا تھا۔ وہ موسم کی دلفریبی کو انجوائے کرتی بہل گم چہ جانی تیز قدموں سے چلی رہتی تھی۔ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی جہاں اس کی پیاری نانا اس کے انتظار میں سخت جھنجھالی ہوئی تھیں۔

مارکیٹ سے خریدی ہوئی اسلٹن اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ بریڈ انڈے اور کوکیز وغیرہ۔ ایک ڈیڑھ منٹ کو بنانا چاہی کا تھی تھا۔ وہ ناشتے میں چیلی بریڈ کے ساتھ شوق سے لیتی تھی اور اسے کھانے سے بہت شوق تھا۔ وہ کھاتی تھی اور بے تحاشا کھاتی تھی جس طرح

## مکھنٹا ناول





گیا تھا وہ جو کوئی بھی تھا گھنوں پر سر جھکائے یقیناً کد  
 رہا تھا۔ مگر وہ تھا کون؟ قریا کا نظری تجسس خود کر آیا۔ وہ  
 دو قدم کا فاصلہ مٹاتے اس کے قریب چلی آئی۔  
 "ہیلو مین!" قریا نے گانا گھنگار کے اسے اپنی طرف  
 مٹوید کرنا چاہا تھا۔ اتنا اندازہ تو اسے ہو چکا تھا کہ مقابل  
 صنف مخالف میں سے ہے۔  
 "تم رو رہے ہو؟" وہ اسے اپنی طرف مٹوید کرنا  
 چاہتی تھی۔ مگر وہ سری طرف ہونو خاموشی تھی۔ فرق  
 صرف اتنا پرا تھا کہ سسکیوں کی آواز آتا فوراً بند ہو چکی  
 تھی۔  
 "تم کون ہو؟" قریا نے ہمت نہیں ہاری تھی۔  
 "اور مجھ کو پلیر!" اب قریا نے چکی بجا کر مستوی التجا  
 کی تھی۔  
 "ارے۔۔۔ کچھ تو بولو کم از کم میرا تو پرا اٹھاؤ۔" قریا  
 کو غصہ آ گیا۔ "تم کہیں ولیف تو نہیں۔" وہ ایک دم  
 اچھل کر رو رہی۔  
 "کوئی نہ بہرے کچھ تو بولو۔" وہ سخت بھجلائی۔  
 "اب گوئی نہ بہرے بولتے سنتے کہاں ہیں؟" قریا نے  
 اپنا ہاتھ پٹیا۔ "مگر فوں خاں تو کر سکتا ہے۔" وہ زہر اب  
 پریدالی۔  
 "مسٹر کیا تکلیف ہے کیوں رو رہے ہو؟"  
 اب کے سارا لحاظ بالائے طاقت رکھ کے وہ غصے سے  
 دباڑی۔  
 "آپ کو کیا تکلیف ہے؟" گوئی نہ کو زبان لگ گئی  
 تھی۔ گھٹنے پر سر جھکائے ہونو زہر ای پوزیشن میں بیٹھی  
 ہوئے بھرائی ہی آواز سنائی دی تھی۔  
 "شکر ہے بولے تو سہی۔" قریا نے گھرا کر سرکون  
 سانس خارج کیا۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں  
 خدا ختم راستہ صرف اتنا پوچھ رہی ہوں یہاں کیوں بیٹھے  
 ہو۔"  
 "آپ سے مطلب؟" کافی ناراضی سے روٹھے  
 روٹھے انداز میں کہا گیا تھا۔ قریا کی آنکھیں حیرت سے  
 پھیل گئیں۔  
 "تم ہمارے گھر کے سامنے ہمارے ہی بیچر بیٹھے

ہوئے کوئی چوراچکے بھی ہو سکتے ہو۔ اٹھو یہاں سے۔"  
 "یہ آپ کا گھر ہے اور یہ بیچ بھی اہم سو رہی۔"  
 گھنوں سے سر اٹھایا گیا تھا۔ گری سبز سبھی سوئی  
 آنکھوں میں ابھی تک صبروں میں چمک رہی تھی۔  
 "مگر یو فارنز؟" قریا کا لہجہ اور انداز دونوں بدل گئے  
 تھے۔ شہد رنگ بالوں والے سر سے کپ اتر چکی  
 تھی۔ مغربی تین نقوش اسٹریٹ لائٹس کی روشنیوں  
 میں واضح ہوتے چلے گئے تھے۔  
 "سرخ ہوشوں کے کوئے پکھتا وہ اجنبی لڑکا ایک دم  
 کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی قریا کو اس  
 کے طویل قامت ہونے کا اندازہ ہوا۔ قریا اس کے  
 سامنے بولی ہی لگنے لگی تھی۔  
 "تو۔۔۔" اپنی شرٹ کی آستینوں سے چہرہ صاف  
 کرتے ہوئے وہ رخ مٹو گیا تھا۔  
 "مشکل سے تو فارنز لگتے ہو۔ خیر۔" قریا ہونٹ  
 سیڑھے بخور سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ بیس سال کا  
 نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر شہری رویاں چمک رہی  
 تھیں۔ آنکھوں سے جینا چہرہ قریا نے اندازہ لگایا۔ اس  
 سے تو وہ وہاں سال پھوٹا ہی تھا سو اس لیے اس نے  
 اپنے لیے میں کچھ رعب سمویا۔  
 "تم رو رہے تھے مگر کیوں؟ اتنے بڑے ہو کر روتے  
 ہو؟"  
 "رونا کیا صرف بچوں کا ہی حق ہے گیا آپ نہیں  
 رو رہیں۔" بہت شہد اردو میں بغیر اس کی طرف دیکھے  
 پوچھا گیا تھا۔ ساتھ وہ جانے کے لیے سڑنے لگا تھا۔ مگر  
 قریا بھی ملال پھرتی سے اس کے سامنے آئی۔  
 "ایسے تو نہیں جانے نہیں دوں گی۔"  
 "کیوں؟ کھانا کھانا ہے کیا؟ آپ کو کیسے خیر ہوئی کہ  
 میں صبح سے بھوکا ہوں۔" اس تمام عرصے میں شاید وہ  
 خود کو سنبھال چکا تھا تب ہی کافی اعتماد سے پوچھنے لگا۔  
 "کھانا بھی کھلا سکتی ہوں۔" قریا اس کی آنکھوں  
 میں جھانکتے ہوئے اپنے ازل بلاتوا انداز میں بولی۔  
 "مگر کسے روئے کی وجہ تو تاتا۔"  
 "پہلے کھانا کھا لیں۔" وجہ بعد میں پوچھے گا۔"

اس سے بھی زیادہ بولنے تھا۔ تاہم قریا نے غور کیا اس  
 کے چہرے پر سادگی اور مصدومیت تھی۔ وہ عیار یا مکار  
 تو نہیں لگتا تھا۔ مگر اس طرح کسی پر اعتبار بھی نہیں کیا  
 جاسکتا۔ وہ سوچ میں گم ہو گئی تھی۔  
 "میں نے آپ کو مشکل میں پھنسا دیا ہے، چلا  
 ہوں یہاں بغیر پریشانی کے بیٹھ گیا تھا۔ ایک چھوٹی  
 میں شدید ڈر ہلکا تھا سو کچھ بتا نہیں چلا۔ سو رہی  
 آہن۔" وہ بیٹھے لگا تھا جب قریا نے پھر سے بازو آگے  
 کر کے اس کا راستہ روکنا۔  
 "روکو تو۔ کھانا کھائے بغیر چلے جاؤ گے اور نہ جانے  
 مگر جا کر تمہیں کھانا ملے گا بھی یا نہیں اور پتا نہیں  
 تمہیں کتنی دور جانا ہے۔" قریا قرآن سے بول رہی  
 تھی۔ وہ رُک گیا تھا کھانا بھی تھا اور پھر نم نم ہی آنکھوں  
 سے مسکرایا۔  
 "کھانا گھر جا کے نہیں ملے گا۔ اتنا مجھے یقین ہے۔"  
 مجھے بہت دور نہیں جانا ہے سامنے میرا گھر ہے۔" وہ  
 نوجوان کے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ چار طرف دیکھو  
 بعض عالی شان ہی ہی کو کسی اس بلڈ کے سب ہی  
 گھروں میں الگ نظر آتی تھی۔  
 "صبح سے بھوکے ہو گیا رات بھی نلے کے ساتھ  
 گزار رہی ہے۔" قریا سنجیدگی سے بولی۔  
 "مجھے قانون کی عادت ہے۔" وہ بھی سنجیدگی کے  
 ساتھ مسکرایا۔  
 "ترج میرے توسط سے تمہیں فائدہ نہیں کرنا پڑے  
 گا۔" قریا نے نیل پر ہاتھ رکھ دیا تھا جبکہ رویا سا وہ  
 لڑکا بیچ گھبرا گیا۔  
 "آپ۔۔۔ آپ کیا کر رہی ہیں؟"  
 "مافی سویت میم قریا سنجیدگی۔" اس نے پلٹ کر  
 جواب دیا تھا۔ "اپنا نام بتاؤ؟" آواز میں بلا کارعب تھا۔  
 اجنبی اور بھی گھبرا گیا۔ چونکہ گٹ کھل چکا تھا اور قریا خود  
 پیچھے بے اور اسے اندر جانے کا اشارہ کر رہی تھی وہ  
 گھبرا نہ تو اور کیا کرتا۔  
 "ابھی چکو مجھے خود بہت شدید بھوک لگ رہی  
 ہے۔" قریا اسے اپنی جگہ پر جمے دیکھ کر بے صبری سے

بولی۔ وہ ایسے بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ چوں ہی وہ  
 دونوں لڑکے کا داخلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تینا  
 کی تھا خناسی آواز سنائی دی۔  
 "قری! کہاں رہ گئی تھیں تم؟ فکر کے مارے میرا برا  
 حال تھا میں تو۔۔۔" قریا کے ساتھ کھڑے نوجوان کو دیکھ  
 کر تینا ایک دم خاموش ہو گئی تھیں۔  
 "یہ کون ہے؟" ان کی سوالیہ نگاہیں قریا پر جمی ہوئی  
 تھیں۔  
 "مائی نیو فرینڈ۔" تینا کے ساتھ ساتھ وہ بھی حیران  
 تھا بلکہ شاکت تھا۔  
 "اپنا نام تو بتاؤ۔" قریا نے ساتھ کھڑے مجھے کو زور  
 سے ٹھوک دیا۔  
 "مجھ جنو۔"  
 "اوہ! تینا کے ساتھ قریا بھی بر سکون ہو گئی تھی۔"  
 کیونکہ وہ اسے غیر مسلک سمجھ رہی تھیں۔  
 "اس کی طبیعت تھیک ہے؟" تینا مزہ کی طرف  
 اشارہ کر رہی تھیں۔ اس کی سوئی آنکھیں اور سرخ پتا  
 لپا سا چہرہ کچھ اور کھانی ستا رہا تھا۔  
 "طبیعت تو اس کی تھیک ہے البتہ ہم دونوں کو سخت  
 بھوک لگی ہے۔ آپ کھانا تو لگوا لیں۔" قریا ڈانٹتے دم  
 کی طرف بڑھ گئی تھیں۔  
 "کھانا تو کھال ہی کب کا کھا چکے ہیں۔" تینا سنبھل کر  
 مسکرائیں۔ "یہ بھوک کی اور تیند کی بہت بچی  
 ہے۔" اب وہ مزہ کو تار رہی تھیں۔  
 "مزہ تو یہ ملن اور لکھو پالک لڑائی کرنا! اچھا یہ گولا  
 مہاب تو چیکو۔ اور اس اچاری ہانڈی کا تو سواد ہی الگ  
 ہے۔ پار! یہ ویسی گلڈو چا پیٹیز رائس مائی نیوٹ  
 ڈش۔ تم نے چاول کیوں اتنے کم لیے ہیں اور لکھو پار!  
 کھانا اور کھاتے جاؤ ہم کھانے کے لیے ونیا میں آئے  
 ہیں۔"  
 جب تک ڈنر چلتا رہا تھا قریا کی زبان بھی اسی رفتار  
 سے چلتی رہی۔ حمزہ پو کھلایا پو کھلایا سا اسے بوسا دیکھتا  
 رہا۔ وہ حیران تھا۔ یہ لڑکی کیا چیز تھی۔ ابھی وہ تینا ہا ہر  
 بیٹھا رو رہا تھا اور اب اس لڑکی کے برابر بیٹھا مسکرا رہا







سے کھاتی رہیں۔

بنگالی جی جائے کی لوازمات سے بھری ٹرالی گھسیٹ کر لائے تھے اور فریادے جھٹ پٹ پکڑوں سے بھری ڈش اٹھال تھی اور اب وہ چٹنی میں ڈبو ڈبو کر پکڑے کھا رہی تھی۔

وقاص نے سوئی کے حلوے کو چکھا۔

”بنگالی جی سے کیا کیا بوقاری رہتی ہو۔ یہ ویسی گھی کے تڑکے کھا کھا کر موٹی اچھٹ جاؤ گی۔“ وقاص نے بلوریں سی پیالی ٹرالی میں رکھ کے جانے کا گپ اٹھا لیا۔ ”مسٹر مین! میری صحت کو دیکھ کر مت جلا کرو۔ یہ بتاؤ میری چاب کا کیا ہوا؟“ فریا اب حلوے سے بھر پور انصاف کر رہی تھی۔

”اس قدر آتا ہی مت ہو۔ ورنہ میرے ہنس میں ایک ویکٹری تو ہے۔“ وقاص نے آنکھوں میں شرارت بھر کے کہا۔

”کیفین! میرے بارے میں تم نے ایک دفعہ بھی نہیں سوچا۔“ فریا کو شدید عذر سے گھیرا۔

”نہ جانے کا ایک اور کپ لی لینے دو پھر بتانا ہوں۔“ وقاص ہونے بڑے بڑے سب لیتا کڑی کی طرف دیکھتا ہوا کھڑا ہوا گیا تھا۔ کپ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ آخری رہا سا گھونٹے لے کر ہاتھ بلا آدروازے کی طرف بڑھا۔

”بچو! اسی کی ویکٹری خالی ہے۔ کلام بھی مشکل نہیں۔ تمہارے لیے اس سے اچھی چاب کوئی اور مجھے نہیں ملے گی۔“

”بد تمیز! وہاں بات آدمی اچانے بھی پنی گئے سینڈویچ اور یہ میرے ٹکٹس بھی کھا گئے۔“

اینا کوٹ لہراتا وہ فریا کو جوتا اٹھائے دیکھ کر بیجاگ گیا تھا۔ جبکہ اندر آتی ٹانہ پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔ ”اسے تو دنوں بعد پتہ آیا تھا کھانا کھانے بیغیر چلا گیا۔“

وہ لے تو رہا چلتے اجنبیوں کو بھی اٹھالقی ہو اور وقاص کو صوفے سے بچھڑا دیا۔

”اتنا کچھ تو چٹ کر گیا ہے! ابھی بے چارہ پھر صوفے سے اٹھا گیا ہے۔“ فریا تنا کو وقاص کی ہمدردی میں ہنسا دیکھ

ہی نہیں سکتی تھی۔ ”مگر یہ کس اجنبی راہ چلنے کو اٹھا کر کھلائی ہوں؟“

”کیا بجلا سا نام تھا اس بچے کا؟“ خاص سوچ میں پڑ گئیں۔

”حزرف۔ محمد حزرف۔“ فریا کی یادداشت کے خانے سے یہ نام نکل چکا تھا۔ نام نسا کے یاد دلانے پر وہ حمت سے بولی۔

”ہاں۔۔۔ حزرف۔“ ناسرا ملانے لگیں۔ ”قری! یہ تمہیں کہاں ملا تھا۔ کون ہے یہ؟ کس فیملی سے ہے؟ بیٹا! ایک بات جو میں تمہیں ہر دفعہ سمجھاتی ہوں کہ ہر ایک پر اعتبار نہیں کر لیتے۔“ دلنشیا ہمارے لیے نئی ہے اس سوسائٹی میں ہم ابھی نئے ہیں۔ کچھ اندازہ بھی نہیں کہ اردگرد کے لوگ کیسے ہیں، ایسے تو بھروسہ نہیں کر لیتے۔“

ناسرا دن بھی حزرف کے جانے کے بعد اس کی اچھی خاصی کلاس لیتی رہی تھیں۔

”حزرف تو پھر مارتا نہیں، وہ اب یہ سامنے ہی تو اس کا گھر ہے۔“ نانا پوچھ رہی تھیں۔

”نہ۔“ فریا اب لی ڈی کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

”تم خود پچ کر لیتیں۔“ انہوں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

”ننا! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔“ فریا نے لی ڈی پر سے نظریں ہٹا کر نانا کی طرف دیکھا۔ ”ایک مسٹر فریڈی نے ابھی تک جان نہیں چھوڑی۔ مزید کسی اور پرنوسی سے میں روایط نہیں بڑھا سکتی۔“

وہ وقاص کا حوالہ دے رہی تھی۔ اڑتیس سال نانا کی اور وقاص لوگوں کی فیملی بڑی رہے تھے۔ وقاص اس کی پھوپھو کا بیٹا تھا۔ اس کی فیملی انگلینڈ چلی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد نانا ہی یہاں شفٹ ہو گئی تھیں۔

وقاص کو یورپ سے پہلے ہونا پسند نہیں تھا۔ یہاں اس کی چاب بہت اچھی تھی اور وہ بھوشیا پاکستان میں ہی رہنا چاہتا تھا۔ نانا کو وقاص سے خصوصی آئینت تھی۔

”قری! تم نے پوچھا نہیں حزرف کیوں پڑ پڑا تھا؟“

”وقف نہ! مجھے کیا ضرورت پڑی تھی پر جسے کی۔ ویسے بھی میں نے کافی امتحانہ حرکت کی تھی۔ اسے گھر نہیں لانا چاہیے تھا۔ گھر نہ جانے کیوں جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ جھوٹا ہے تو مجھے ترس آ گیا۔ ہمارے گھر میں ففتوں کے انبار لگے تھے اور ایک ہمارا بے چارہ بڑی خالی پیٹ رو رہا تھا نانا! میں وہ بھوک کی وجہ سے تو نہیں رو رہا تھا۔“ وہ ہمیشگی کی طرح چٹکیوں میں بات کو اڑا رہی تھی۔

”وہ بچہ نہیں جو بھوک کی وجہ سے ہلچلا رہا تھا۔ بات کچھ اور لگتی ہے۔“ نانا کا انداز بڑھ سوچ تھا۔ فریا کی نکاس لینے کے بعد وہ بڑے دل گرفتہ انداز میں کہنے لگی تھیں۔

”تم نے اچھا کیا فری! حزرف کو لے آئیں ورنہ یہ گلٹ تو لازمی رہتا تھا۔“ یہ اس وقت کی بات تھی جب فریا حزرف کو سی آف گیٹ تک کرنے کے بعد آئی تھی اور خانے اسے ڈالنے کے بعد کہا تھا۔

”بے چارہ! کتنی پیاری صورت ہے اس کی۔“ بہت دن بعد نانا کو بے چارہ بیٹے یا آدمی گیا تھا۔ فریا اور وہ کھانے کی گئی تھی۔ لی ڈی پوچھ نکاس پوچھ کر ام بھی نہیں آ رہا تھا۔



”بھلا میم! وہ جو زور و شور سے بیرونی چھوٹے سے لان کے پودوں کی کانٹ جھانٹ میں مصروف تھی۔ اس مردانہ آواز پر چونک کر سیدھی ہوئی۔

”تم۔“ وہ اسے پہلی نظر میں پہچان چکی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو وہ فریا کو اسی جگہ ملا تھا۔ حزرف اس کے حافظے میں نہ جانے کے باوجود بھی محفوظ تھا۔ اور ایک دو دن سے تو پچھلے کے دل میں یہ خواہش اٹھز اٹھز اٹھ کر جاگ رہی تھی کہ کیوں نا حزرف کی خبریت ہی معلوم کر لی جائے۔ نانا نے بھی اس سے ایک دو مرتبہ کہا تھا۔ شاید ان کے ذہن میں بھی حزرف کا رونا محفوظ تھا۔

”مجھے دیکھ کر آپ شاکڈ کیوں رہ گئی ہیں؟“ وہ اس کے قریب ہی گھاس پر پھسکر امار کر بیٹھ گیا۔

”ننا! ایسی کوئی بات نہیں! ابھی میں تمہارے پارے میں سوچ رہی تھی کہ تم۔“

”تمہارے میں کیا اتنی اہم شخصیت ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچ رہی تھیں۔“ حزرف کا چہرہ برقی قسموں کی طرح جگمگاتے لگا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ ایک دم گھبرا گیا۔ ”تم مجھے فریا کہہ سکتے ہو۔ ویسے کیا اتنے بچے تمہاری؟“

”کچھ دن پہلے میری بیسویں سالگرہ تھی۔“ نہ جانے کیوں حزرف کا چہرہ اک چل کے لیے تاریک ہو گیا تھا۔

”میں تم سے دو سال بڑی ہوں مگر فرینڈ شپ تو ہو سکتی ہے۔“ فریا اس کے چہرے کو نورا دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم ایک اچھی اور سچی خاتون ہو مجھ سے دو سال چھوٹی ہی لگتی ہو تو کیا ان سے فرینڈ! حزرف نے اپنا دایاں ہاتھ فریا کے سامنے پھیلا دیا۔

”آف کورس فرینڈ!“ فریا سٹی سے ہتھڑے ہونے ہاتھ اپنی شرت سے رکھتے ہوئے پرمجوش سی بولی۔

”استے دن کہاں رہے؟“ وہ حزرف کے لیے ایک چیسر گھسیٹ کر لے آئی تھی۔

”میں اس بیچر بیٹوں گا۔“ حزرف گھاس سے اٹھ کر بیچر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ”کیا یہ بیچ میرے لیے بنوایا تھا۔“

”مجھے الہام ہو گیا تھا کہ دلنشیا! میں ایک باگلو سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ ایک بیچر بیٹا مجھے ملے گا۔ سو اسی لیے۔“ وہ بالوں سے کھچو آ کر حزرف سے بولی۔ ”تم نے بتایا نہیں اتنے دن کہاں رہے؟“

”ایک سوچ میں کم رہا ہوں تم فوسو کی تو نہیں۔“



”مجھے پتا تھا تم نہیں ہو گی۔“ حمزہ بغیر برائے خود بھی مسکرایا۔ ”تم بہت متقی ہو فریا! اس دن بھی تمہارے گھر سے آنے کے بعد میں یہی سوچتا رہا تھا کہ کسی کی جیسی اتنی زندگی سے بھرپور بھی ہو سکتی ہے اور کوئی تم جیسا احمق بھی اس تیز رفتار دور میں موجود ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ حمزہ! تم نے مجھے احمق کہا۔“ وہ عادت کے مطابق چلا اٹھی۔

”تم احمق ہی نہیں بہت انوینٹ بھی ہو۔ یاد ہے میں نے تم سے کہا کہ میں صبح سے بھوکا ہوں اور یہ میں نے اس لیے کہا تھا کہ تم کچھ کو کیز کے چیکٹ اور اتنے سے مجھے دے دو۔ جو میں تمہارے ہاتھ میں دیکھ چکا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ تم مجھے کچھ پیسے بھی دے دو گی۔ تاکہ میں کچھ پیٹ پوچھا کروں مگر میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے اپنے گھر لے جاؤ گی اور مجھے کھانا کھلانے کی آفر کرو گی۔ میں شاکڈ رہ گیا تھا۔ آج کے دور میں لوگ سگے رشتہ داروں کو بغیر انوسٹی گیشن کے اندر نہیں گھساتے، میرا حیران ہونا فطری تھا۔ تاہم تم سے اور تیسے ہی کر میرے اندر کی عقلی اور برہمگی ہے فریا!“

”تم چاہتے تھے کہ میں کچھ لہیزے اور کو کیز کے چیکٹ کے ساتھ کچھ روپیے بھی تمہیں دے دیتی۔“ فریا ایک دم گویا فریڈ ہو گئی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سامنے بیٹھایا لڑکا چاہے یا بھوٹا۔ مگر ایک چیز کا یقین تو اسے آ ہی گیا تھا کہ سادگی اور مصومیت ہر کسی کو دھوکا دے سکتی ہے۔ اگر اسے اچھے طریقے سے خود پر طاری کر لیا جائے۔

”مجھے اس دین ذمہ بھر بھوک نہیں لگی تھی۔ لگ ہی نہیں سکتی تھی۔ چند ٹکوں کے عوض بے عزتی کروانے کے بعد ہر اس شخص کی بھوک پیاس اور فریڈ تک اڑ جاتی ہے جو عزت نفس رکھتا ہے۔“ حمزہ نیلے آکاش کی طرف دیکھتے ہوئے ان ٹکوں میں گویا وہاں موجود ہی نہیں تھا فریا چونک گئی تھی۔

”ہم فریڈ نہیں اور فریڈ شپ کے آغاز میں میں تمہیں اپنے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ تمہارے

بارے میں تو میں جان ہی چکا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو۔ بہت اچھی کوکٹ کرتی ہو۔ فیکٹنگ میں بھی ماہر ہو۔ ماسٹرز کر چکی ہو۔ ایک اچھا کیڈک ریکارڈ رکھتی ہو۔ جی ڈیڈی ابراہمیں ہوتے ہیں۔ تم بچپن سے ہی نانا کے ساتھ رہتی ہو۔ ولنشیا میں گھر لے کر لوگوں کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ حمزہ اسے مزید حیران کرنے پر غما ہوا تھا۔ تاہم فریا کا ذہن ابھی تک کوکیز اور انڈوں میں ہی اڑکا ہوا تھا۔

”میں ایک ور میانے درجے سے بھی ذرا کم اسٹوڈنٹ رہا ہوں۔ بڑھانا تو میرا شوق تھا۔ مجھ پر میرا دل بڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔ اب تم پوچھو گی کہ میرا دل کس چیز میں لگتا تھا؟ میرا دل روٹیوں، احساسات، نفرتوں اور بھوکوں میں ہی الجھا رہا ہے۔ گھنٹوں میں کچھ اور پیچھے ماضی کی طرف جاتا ہوں۔ مگر اس سے بھی پہلے تمہیں بتا دوں کہ میں حمزہ ہوں۔ یہ سب سے بڑا راج ہے اور اس سے بڑے راج تمہیں آگے چل کر بتاؤں گا۔“

یہ بات تمہارے لیے شاکڈ ہو گی کہ یہ سامنے وسیع دلچسپ ہالی شان گھر رہا نہیں ہے۔ بلکہ میں فلائس گھر میں معمولی سا تنخواہ دار ملازم ہوں۔ اوپر کے کاموں اور سودا سلف لانے کے لیے مجھے لائسنس لینا پڑتا تھا۔ مگر اس گھر کی تک چڑھی ملازمہ جس کا بچپن پر عمل راج ہے، زبردستی مجھے شیفت بنانا چاہتی ہے۔ تم حیران مت ہو فریا! میں تمہیں بتاتا ہوں مجھ حمزہ کون ہے۔“ فریا واقعی اس انکشاف پر رنگ رہ گئی تھی۔

”میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو اندرون شہر کی غلیظ گلیوں میں پایا۔ گند کی بو میرے اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ سیٹے والا حمزہ روٹھ کر ڈکھایا تھا۔ میری ہاں کا تعلق انگلینڈ سے ہے۔ میرے ابو کا تعلق ایک لوئر میڈل کلاس فیملی سے تھا۔ میری دادی ایک معمولی سی ڈو آف تھی۔ جو اپنے اریبے کے علاوہ بھی جہاں جہاں زچہ بچہ کی بھنگ پانی فوراً دوڑ لگا دیتی۔ اس علاقے کی

واحد مشہور اور نامی گرامی دائی تھی جو ناچار تیرا کیس نمٹانے میں بھی ماہر تھی اور اس معاملے میں خاص شہرت رکھتی تھی۔

جہالت، عزت اور بھوک نے جس گھر میں میرا کر رکھا تھا۔ ایسے چھوٹے اور بیچ گھرانے میں میرے ابو تنویر اسرار جیسے بچوں کو پیدا نہیں ہونا چاہیے جن میں ہمت، لگن اور پورے گھر دکھانے کا جذبہ جنون کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

وہ اپنے ماحول سے الگ تھا۔ وہ لاکھوں لوگوں کی گھنٹوں میں اپنا ایک الگ مقام بنانا چاہتے تھے اور اس کے لیے چاہیے تھی بے تحاشا محنت، ان تک کو شش اور ایک طویل تھا کا سینے والا سفر۔ مگر مشن اور جیتو نے کبھی میرے ابو کو بائوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے تعلیم یافتہ فرد تھے جنہوں نے یونیورسٹی لیول تک تعلیم حاصل کی تھی۔

یہ ان کی خوش قسمت تھی کہ انہیں انگلینڈ کا ویزا مل گیا۔ نہ جانے کس کس سے قرض اور ادھار پکڑ کے بہت سے خواب بے پیر اسرار انگلینڈ پہلے گئے۔ ان کے ویزے کی مدت مختصر تھی اور انہیں جو کچھ بھی کرنا تھا ان چند مہینوں میں ہی کرنا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکری کی تلاش کے ساتھ ساتھ انہیں کسی سارے کی بھی ضرورت تھی اور یہ سمارا روٹھ کر ڈکی صورت میں انہیں میسر آئی گیا۔ روٹھ تیسرے درجے کی معمولی سی نرس تھی۔ اچھی صورت کی وجہ سے اور وائی آمدنی کے ذریعے بخوبی گزار بھر رہی تھی۔ نہ جانے کیسے میرے ابو کی ملاقات روٹھ سے ہوئی۔ روٹھ ابو سے خاصی متاثر ہو چکی تھی اور ابو کے آفر کرنے پر وہ ان سے پیپر مریج کے لیے رضامند ہو گئی۔ رقم و چیزوں کے معاملات بھی طے پا گئے تھے۔ ابو روزانہ کتنے پونڈز روٹھ کو دیا کریں گے یہ سب تو طے تھا۔

ابو کو روٹھ کے توسط سے لہستان بھی بھیجی تھی۔ مگر کچھ ٹیکس ادا کرنے کے چکر میں ابو ابھی کچھ بھی سیونگ نہیں کر سکتے تھے۔

پاکستان میں پیسہ بھجوانا تو دور کی بات تھی۔ ابو خود

بہت مشکل سے گزارا کر رہے تھے۔ جن لوگوں سے قرض لے رکھا تھا۔ وہ سب واوی کا ناک میں دم کیے ہوئے تھے۔ ادوی خود قرضوں سے عاجز آچکی تھیں۔ گھر کا چھوٹا سا پھول ٹھنڈا رہتا۔ دو دو دن کچھ کھانے کو نہ ملتا۔ ایسی صورت حال میں اگر ایک تین سال کے بچے کی ذمہ داری بھی ان پر نہ تو گھر کے سربراہ کی کیا حالت ہوگی۔

یہ بچہ میں تھا مجھ حمزہ۔ جس کی ماں اسے جنم دے کر باپ کے دروازے پر پھینک گئی تھی۔ روٹھ ایسے کنکلیے پاکستانی سے آتا چکی تھی۔ ابو نے کچھ عرصہ تو مجھے اپنے پاس رکھا مگر پولیس کی مہالیا نے مجھے میرے باپ سے دور کر دیا۔ بلاشبہ میرا باپ محبت کرنے والا بہت اچھا باپ تھا۔ مگر ابو کو قتل تھی کی بنا پر جیل ہو گئی۔ ابو کی خواہش کے مطابق ان کے اسٹور کے مالک نے مجھے پاکستانی ابو کی فیملی کے پاس بھجوا دیا اور میری زندگی کے رخ زمین دور کا آغاز ہو گیا۔

میں نے بھوک کا مزہ چکھا۔ میں نے نفرت اور ذہانت سے لطف اٹھایا۔ باپ چاہا چھوٹی اور دادی ان تین لوگوں کے پاس میرے لیے کچھ نہیں تھا۔ نہ محبت نہ توجہ نہ وقت۔ میں نے اس گھر میں واوی کی گلیوں کو سٹوں اور ٹھنڈوں کے درمیان بچپن گزارا۔ میرے ابو کے علاوہ دو لوگ اور رہنے کے شوقین تھے۔ چھوٹے اور چھوٹے کتا بول میں سرگھسائے رکھتے۔

چاہا کبھی کبھی ترک میں آگے کہتے۔ ”بھیا تنویر کی طرح بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔“

واوی کو چاہا اور پھوپھو کا پھرنا بھی سخت ناپسند تھا۔ چاہا بہت اچھے تھے۔ تاہم پھوپھو سخت بد مزاج تھیں۔ ہر وقت اپنے آپ میں گمن رہتیں۔ پھوپھو کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اسی حساب سے ان کے خواب بھی اونچے تھے۔

ان تین بھن بھائیوں میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ چیز تھی اس ماحول سے فرار۔ ابو تو فرار حاصل کر چکے تھے۔ باقی دو بچھی بھی اڑنے کو بے تاب تھے۔



چاہا گو مجھ سے کچھ نہ کچھ محبت ضرور تھی۔ داوی کو جب بھی میرے لیے ڈنڈا اٹھاتے دیکھتے فوراً میری ڈھال بن جاتے۔ اسکول میں چاہا کی مہربانی سے مجھے داخلہ مل ہی گیا تھا۔ اور اس کے بعد اڑتے والے پچھی اپنی اڑان بھر کے دور دست دور۔ چلے گئے۔

چاہا کو اس کا لڑ شیب مل گیا۔ پوچھو بھی من پسند ڈگری حاصل کر چکی تھیں۔ رحیم چال دانی - تقلیت کے معاملے میں تو خوش قسمت تھی۔ مگر اپنی اولاد سے عمر بھر فیض نہیں پایا۔

سننے میں آیا تھا چاہا نے بھی اپنی کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی اور وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ جاتے سے پہلے گھڑی بھر کے لیے داوی سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ آخری مرتبہ مجھے کچھ کچھ سمجھ کر ملے ہوئے چاہا نے کہا۔ "حاصل زندگی میں ہمت اور لگن کو ہمراہ رکھنا اور رویشیاں اپنی طرف بلا میں دوبارہ صبر سے پیچھے چھوڑ کر اشد عداوت بھاگ لیتا۔ ہم نے نام اور مقام کے لیے ہمت محنت کی ہے اور اب اس محنت سے لطف اٹھانے کا وقت آیا ہے۔"

میں کتنا چاہتا تھا تھا تو آپ کچھ بھی نہیں تھے۔ آپ کے پیچھے بھی تو وہ مشقت کی چکیا پیسنے والے ہاتھ تھے۔ مگر میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

چاہا چلے گئے اور میں خالی خالی نظروں سے چاہا کو جاتا دیکھتا رہا۔ چاہا نے اپنی بیوی سے داوی کو ملوانا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ داوی جو ایک بدنام سی ڈوا آتھ تھیں ان کا حوالہ شاید داوی کی اولاد کے لیے شرم ناک تھا۔ مگر جو بھی تھا داوی ان کی ماں تو تھیں۔ چاہا کے اس طرح چلے جانے کا سارا عتاب بھی مجھ غریب پر نازل ہوا۔ داوی نے جوتی اٹھا کر بی بھر کے مجھے مارنے کے بعد دل کی ساری بھڑاس نکالی۔ ان کے خیال میں مٹوس اور جین تھامیں۔ میرا بچت سیاہ تھا اور اس کی سیاسی داوی کے گھر پر سایہ فگن تھی۔

چاہا چلے گئے تو ایک روز اسپتال میں مقیم پھوپھو بھی ایسی غائب ہو گئیں کہ سالوں ان کا نشان نہ ملا۔ داوی رو دھو کر بیٹی پر قاتحہ پر ہنسنے کے بعد بھر سے اپنے

مشغلے میں مصروف ہو گئیں۔ مگر پھوپھو کے غم نے داوی کو ایسی دیکھ لگائی کہ پھر وہ صرف چند سال ہی کی سکی گئیں۔ پھوپھو بھی کبھی میری آمد سے پہلے ہی چاہا کی طرح دوران تعلیم چلے چکے گھر بسا چکی تھی۔ مرنے سے پہلے داوی نے مجھ سے وعدہ لیا۔ حالت اوعده کرنا مجھ سے میری بجلی کو ضرور دھونڈے گا۔ "میں نے روتے ہوئے انبات میں سر ہلا دیا تھا۔ داوی میرے حامی بھرنے پر خوش ہوئی یا نہیں مگر میرا دل ضرور مطمئن ہو گیا۔ داوی نے اپنی زندگی کی آخری رات مجھ ہی بھر کے بار کیا۔

داوی نے کہا۔ "ماتے ابو میرا اصل سوہ تھا اور میں کھوت کے پیچھے رہتی رہی تو میرا تھا مجھے ملی میں رول دیا اور جو کھوت کا مال تھا اسے پاس کر دیا۔ ہا میں نے پرا کیا اور میری کوکھ سے بنے بچوں نے میرے ساتھ پرا کیا۔" داوی کو آخری عمر میں ہمت سے کچھ تاویوں نے گھیر لیا تھا۔ عمر کی پوچھی لطف کے قریب ہو تو آنکھیں چورت ہو ہی جاتی ہیں۔ داوی مگر کبھی مجھے معلوم تھا داوی کے مرنے کے بعد میرے لیے دنیا میں کوئی اسالی نہیں رہے کی میری زندگی کا وہ سراخ کرین دور ضرور ہو گیا۔

پیٹ کے دونوں کو بچانے کے لیے مجھے مزدوری کرنا پڑی۔ اینٹیں اور پتھر ڈھوئے۔ بجزی اور گارا اٹھایا۔ بھوک میرے جسم سے ساری توانائی کھینچ لیا کرتی تھی اور میں بجزی کی ڈھیروں پر بے دم ہو کر اونگھنے لگتا تھا۔

دس ماہ خوار ہونے کے بعد مجھے پاجا لاک میرا باب پاکستان آچکا ہے۔ یہ خبر مرہ تن میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھی۔

ابو مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ وہ ہمت کمزور اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ بیمار تھے اور انہیں شاید میرے سارے کی ضرورت تھی۔

میں ابو کے ساتھ انگلینڈ آیا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی۔ طلسماتی دنیا تھی۔ مجھے لگتا تھا میں کسی جاوڈ گھری میں آیا ہوں۔ میں کالج کے اس شہر ہو شرا اس جگر جگر

جگر جگر دنیا کے حسن سے دم بخود تھا۔ میری آنکھوں نے حسن فطرت کے کئی نظارے دیکھے۔ میرا دل نہ جانے کس احساس تلے دبا چاہا۔ مجھ گیا تھا۔ ابو نے مجھے میری جانے پیدائش دکھائی۔ ایک معمولی سا کینک تھا جس میں مجھ حترہ نے آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر ابو نے مجھے وہ مکان دکھایا تھا جس میں وہ میری ماں کے ہمراہ چند سال قیام پذیر رہے تھے۔ ابو آہستہ آہستہ ایک ایک منظر سے پردہ ہٹا رہے تھے۔ یہ مکان ہمت مختصر اور غلیظ عالتے میں تھا۔ مجھے اپنے گھر کی گھریاں اور بازار یاد آگئے تھے۔

تو کیا میرے ابو اس دنیا کی تنہا لیے پردیس کی صعوبتیں جھیٹتے رہے ہیں۔ اسی لائف اسٹائل کی آرزو کی تھی انہوں نے؟ خواب کے اس سفر نے انہیں آخر دیا ہی کیا۔ جو کچھ وہ پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ وہ بتی کچھ تو انہیں یہاں آکر ملتا تھا پھر عمر گونانے میں کیا فلاح انہیں۔

میری اپنی سوچیں ضرور سفر کر رہی تھیں۔ شیکس کی رفتار کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی نل اسپڈ میں بھاگ رہا تھا۔

شیکس کی بڑی ایک جگہ جس طرح شیکس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تھی اسی طرح میرا ذہن بھی جھٹکا کھا کر روٹن اور جگمگاتا نظر۔

ابو میرا ہاتھ تھا اس وسیع و عریض گھر کے انٹرس ڈور کو کھول کر مجھے اندر لے آئے۔

"ماتے! تیرا گھر ہے۔" اب وہ مجھے خود میں سمو کے ہمت محبت سے کہہ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے میں گھبرا رہا ہوں۔ وہ میری گھبراہٹ دور کرنے کے لیے ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگے تھے۔

"ابو! میرا گھر ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے۔" میں کھنپوڑ تھا۔ میرے دل کی دھڑکن بے قابو تھی۔ لکڑی کی چھت والا گھر یا ہر سے ہفتا شان دار تھا اندر سے دکھنا شان دار۔ مجھے لگا میں بھی خواب ہی دیکھ رہا ہوں۔ یہ خواب کس قدر خوب صورت تھا اگر

سلامت رہتا۔ اس خواب کو ایک پچھلائی آواز نے چھانکے سے توڑ ڈالا۔ میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ بے حد ماؤرن ہی بوڑھی عورت جس کے چہرے پر بلا تعداد جھریاں تھیں۔ اس کے ہاتھ چہرے سے بھی زیادہ بد صورت تھے۔ جھریوں سے اس کے ہاتھ پر اور بوڑھے پر برابر چلا رہی تھی۔ اس نے ابو کو ہمت غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ مجھے بس لحد ہی لگا تھا اپنے شان دار سے ابو کے چہرے پر لکھی تحریر کو پڑھنے میں۔ ابو اس عمر میں کیوں اس قدر شکستہ اور بیمار بیمار رکھنے لگے تھے۔ میں کچھ چکا تھا۔ اور جب بات سمجھ میں آئی تو میرا سراور شانے بھی ابو کی طرح جھٹک گئے۔

"عزت اور محبت میرے نصیب میں نہیں۔ یہ دونوں چیزیں مجھے کبھی میرے نہیں آسکتیں۔"

میں ہر خواہش اور ہر خواب پر دل ہی دل میں فاتحہ پڑھنے لگا تھا۔ خوابوں پر فاتحہ پڑھنا آسان نہیں ہو سکتا مگر میں نے اپنے دل کو کچل کر ایسا کیا۔ مجھے یقین تھا سامنے گھڑا میرا باپ بھی ماضی میں یہ عمل دہرا چکا ہے۔ وہ بھی اپنے خوابوں اور تمناؤں کو دفن چکے تھے۔ میں نے بھی بالکل ایسا ہی کیا۔

میں اپنے باپ کی طرح اس گھر میں تیسرے درجے کا رہا کسی تھا اور اس شہر میں اپنی بچانے کے لیے بھلا مجھے ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے خود کو تیسرے درجے کا شہری اور آخری درجے کا رہا کسی سمجھ لیا تھا۔ مان لیا تھا اور اس پر صبر کر لیا۔

"جاتی ہو فرما ابو بوڑھی عورت کون تھی؟ میرے باپ کی دو سہری بیوی۔" فرمایا اس کے چند پرل خاموش رہنے پر سخت بے چینی محسوس کر رہی تھی اور جب اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا تو وہ پہلے کی طرح ہمت توجہ سے سننے لگی۔

"لیڈی تھی کے ساتھ رہتا کسی عذاب سے کم نہ تھا۔ وہ بے تحاشا جگر الو عورت تھی۔ جینے پر آتی تو پورا دن جینے پر تھی۔ میں اور ابو جارا دن اس کی ذاتی بیکری میں کو ابو کے تیل کی طرح جھتے رہتے تھے۔ ابو کی



صحت کو دیکھتے ہوئے میں ابو کو زیادہ کام نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ بہت جلد تھک جاتے تھے۔ انہیں پچھوے دن میں جس کا سانس نہ تھا۔ وہ ہر گھوڑے پر بیٹھ سکتے تھے۔ اگر وہ اپنی نہ کھاتے تو ان میں چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہ رہتی۔

ابو چاہتے تھے میں کالج میں ایڈمیشن لوں۔ وہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔ مگر لیڈی ہائی اسکول میں پڑھائی کا سونپ کر کے ایک ٹیوٹن کھڑا کر دیا۔ اور کالج میں تو نہیں البتہ مجھے ایک انسٹی ٹیوٹ میں انگریزی سکھانے کے لیے ایڈمیشن دلوانا گیا۔ لیکن میں نے کالے گورنمنٹ سکول ہوا تو ڈراما ٹیوٹن کے لیے کتا پتے پڑھنے شروع کر دیے۔ لیڈی ہائی اسکول میں اپنا ذاتی ملازم رکھ رکھا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی اسے ہزاروں کام پڑا جاتے تھے جو نہ جانے میرے آنے سے پہلے کون کرنا تھا۔

تین سال اس نے مجھے ذلیل کیا اور ابو بے بسی سے تماشہ دیکھتے رہتے۔ ایک دن میرے ضبط کے ٹانگے اڑھڑے تو ابو محل سے مجھے سمجھانے لگے۔

”تم اپنے قدم بچاؤ یہاں حالے! میں کچھ سہاویہ تمہیں دوں گا۔ میرا دل ہے تم اپنا اسٹور انٹرنیشنل بنائیں کر لو۔“ ابو نے میرے حوالے سے بھی کئی خواب دیکھ رکھے تھے جو ہمیشہ ادا ہو رہے ہیں۔

”ابو اگر آپ پاکستان میں رہتے تو ہاں جاہ گزر رہے ہوتے۔ تو ہمارا بھی ایک گھر ہوتا۔ بہت زیادہ نہ سہی ہم اچھی زندگی ضرور گزارتے۔ متوازن ماخول ہوتا“ میرے اور بن بھائی ہوتے ابو آپ نے کبھی نہیں سوچا کہ آپ نے یہاں اگر بہت غلط کیا ہے اور دادی سے بہت سال رابطہ نہ رکھ کے اس سے بھی زیادہ غلط اور برا۔“

”بہت دفعہ سوچا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے“ حالے! تم نہیں جانتے میں نے وقت کو اپنے اوپر جس قدر تنگ دیکھا ہے۔“ وہ نہ بھی جانتے تو ان کے مشقت بھرے سفر کی گواہ ان کی کھٹی کھٹی آنکھیں تھیں۔

پھر ایک روز ابو کو نہ جانے کیا سوچا۔ وہ لیڈی ہائی

سکول کے بغیر مجھے لیے ایک لادہ سرنے شہر آگئے۔ حالانکہ ابو تو شاید سانس بھی لیڈی سے پوچھ کر لیتے تھے۔ مجھے ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں اتنا بڑھل گیا ہوں اور ابو بے چارے بیویوں کے معاملے میں انتہائی بد قسمت۔

یہ شہر بھی میرے لیے نیا تھا اور مجھے کچھ دیر تک علم نہیں تھا کہ ابو مجھے کس سے ملوانے کے لیے لائے ہیں۔

میں پہلی نظر میں چاچا کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ وہ پہلے سے بھی کئی زیادہ گریس مل ہو چکے تھے۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ شان دار نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک اچھی خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے چہرے کی صحت ندری سے واضح تھا۔ وہ بہت اچھی جاہ گزر رہے تھے۔

”شما بے پناہ کون ہے؟“ ابو چاچا کو دیکھ کر ایک دم گواہ ہوا تو ہنسنے لگے۔ پر وہیں میں یہ اپنے کیا اہیت رکھتے ہیں۔ کوئی ہم جیسے پردیوں سے لو پو تھا۔

”یہ تو میرا حال ہے، اتنا بڑا اور لمبا ہو گیا ہے! اسے کب لائے ہیں بھائی پھر! چاچا نے مجھے نوٹس دینے کے لیے ساتھ میں جو شہر اور محبت سے کہا تھا میرے آنک

انگ نے محبت کی اس گری کو محسوس کیا تھا۔

”بھائی پھر! آپ حالے کو یہاں لے آئے۔ یہ ایک بہترین فیصلہ کیا ہے۔ آپ نے حامی کی زندگی بن جانے کی۔“

چاچا مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ البتہ ان کی بیوی کا شہدہ چاچا کی کافی نفرت سے ملی تھیں۔ مجھے محسوس ہوا تھا چاچا کی گواہی کو ہماری آمد گراں ندری ہے۔ ابو کا اتنا بھی انہیں پسند نہیں آیا تھا اور یہ بات کچھ عرصے بعد مزید کھل گئی تھی کہ چاچا چاچا کے رشتے داروں سے اچھا خاصا خار کھاتی ہیں۔ چاچا کے رشتے دار بھلا تھے ہی کتنے۔ واحد میرے ابو مگر میں حیران رہ گیا تھا۔ جب چاچا نے ابو کو بتایا۔

”نیاں دو لوں پڑھ رہی ہیں۔“

چاچا بڑی محبت سے پہلی پوچھ بھی گاؤ کر کر رہے تھے۔ میرا حیران ہونا فطری تھا۔ وقت شاید واقعی بدل گیا تھا۔ ہائٹس سے جانب ہونے والی بن کو بھائی جیسے سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ ابو خود پوچھ بھی سے ملنے کو بے تک تھے۔

میں نے محسوس کیا چاچا کو پوچھ بھی گاؤ کر گاؤ کر نہیں گزرا تھا۔ وہ پوچھ بھی کو اپنے گھر اوائٹ کرنے کا پروگرام بن رہی تھیں۔ وہ پوچھ بھی گاؤ کر بہت محبت سے گروہی تھیں۔

میں اور ابو ایک بھر پور دن گزارنے کے بعد واپس آگئے تھے۔ مگر گھر آنے پر ہمیں ایک طوفان کا سامنا کرنا تھا۔ اس بات سے میں اور ابو دونوں ناواقف تھے۔

لیڈی ہائی نے مجھے اور ابو کو بے پناہ کی سنا میں۔ ہمیں غلیظ غلیظ گالیاں دیں۔ یہاں تک تو تھیک تھا۔ ہم لیڈی ہائی کے روئے بلکہ ہر طرح کے روئے کے عادی تھے مگر ان کے نہیں گھر سے نکال دیا یہ اہماتے گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس پر فانی رات کو جو لو تک کو ٹھنڈ کر رہی تھی کھلے آسمان تلے ہم دونوں بے آسرا کھڑے تھے اپنی زندگی کے اس موڑ پر بھی میں حیران تھا۔ بے تحاشا حیران منتظر یہ کہ میں اور ابو شامے چاچا کے گھر چلے آئے۔ چاچا حسب معمول خوش ہوئے تھے بلکہ

سے تحاشا خوش ہوئے تھے۔ مجھ پر تو نہ جانے کیوں انہیں بہت پار آ رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر نرمی سے دبا تے۔

”جا تا میرا بیٹا ہے۔“

”تو ج کہہ رہا ہے شما ہے! ابو کی آنکھیں بے لگیں۔“

”بھائی پھر! تم بھی نا حال میرا بیٹا ہوا! میں نے کہہ دیا“

آج سے تم اس کی فکر کرنا چھوڑو۔“

چاچا اور اپنے بیٹے سے فرقا گریزی بولتے چاچا ابو کے ساتھ اپنے برائے لب و لہجے میں گفتگو کرتے تھے اور چاچا کو اس انداز پر آگ لگ جاتی تھی۔

وہ ہمارے درمیان نہیں بیٹھتی تھیں۔ انہیں اس جاہلانہ طرز گفتگو سے نفرت تھی۔ انہیں ہمارا اپنے گھر میں قیام بھی کھٹکتا تھا اور وہ اپنے دل کی بھڑاس چاچا کے آس جہانے کے بعد اچھی طرح سے نکال جاتی تھیں۔

”جاہلوں اور ان بڑھ لوگوں کی طرح چاچا مت کہا مگر انکل بولا کرو پینڈو جنگلی نہ جانے کہاں سے اٹھ کر آئے۔“

”انکل تو کوئی بھی ہو سکتا ہے چاچا! چاچا ابو لے سے رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ مجھے داوی نے اسی طرح بولنا سکھایا ہے۔“

میرا بولنا تو چاچا کو اور بھی تباہ لانا تھا۔ کما کے جواب دیا۔ یہاں بھی میں تیسرے درجے کا رابا کٹی تھا۔ یعنی چاچا مجھ سے ایک میڈوالے تمام کام لینے کی کوشش کرتی تھیں اور میں صرف ابو کی خاطر سب کرنے پر مجبور تھا۔ وہ چاچا کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ وہ پوچھ بھی سے بھی بڑے تباہ سے ملے تھے پوچھ بھی بھی ابو سے مل کر خوب روٹی رہی تھیں۔

ایک دن ابو نے میرے پوچھے پر بتایا۔ ”شما نے پہلی کا نکاح فرقان سے کر دیا تھا۔ تب پہلی ابھی بڑھ رہی تھی۔“ ابو نے سرسری سا بتایا تھا۔ تاہم میں کچھ عرصے بعد کچھ نہ کچھ تو جان ہی گیا تھا۔ یہ کہ نکاح کے بعد پوچھ بھی جب پریگنٹ ہو میں تو ہائٹس سے انہیں نکال دیا گیا تھا۔ اور یہ بات میری پیدائش سے بھی پہلے کی تھی اور میں چاچا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر داوی کو اعتماد میں لے کر اتنا برا فیصلہ کیا جاتا تو اس میں کیا حرج تھا۔ مگر ایک طرح حقیقت یہ بھی تھی کہ داوی کا حوالہ ان کے بچوں نے ہمیشہ اپنی خوشیوں اور کامیابیوں کی راہ



# BIG SAVER

## Butterfly

LONG  
ULTRA NAPKIN



Butterfly Big Saver

سب سے زیادہ سائز والا سٹراپٹیکٹین  
استعمال کے دوران اوپری سطح خشک رہتی ہے جس کی وجہ سے ریشم نہیں ہوتے۔  
سب سے زیادہ بچت والا سٹراپٹیکٹین پیک۔

ہمارے پرانے محلے کے بعض راوی پول بھی بیان کرتے ہیں کہ واوی اپنی بیٹی کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف نہیں اور وہ جانتی تھیں کہ پھوپھی اپنی پسند سے نکاح کر رہی ہیں، جو بھی تھا کچھ تارا اور بھی تھا اور ابھی۔

کچھ دن بعد لیڈی مینی ہمیں خود لینے آئی تھیں۔ میں اور ابو دونوں ہی جانا نہیں چاہتے تھے مگر جانا تو ہمیں تھا ہی۔

ایک روز ابو نے مجھے بتایا کہ وہ چاچا کی بیٹی سے میری بات چینی کر چکے ہیں۔ چاچا کی بھی عمل رضامندی شامل تھی جبکہ چاچا اور پھوپھی دونوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا تھا۔ قصہ مختصر یہ طوفان مجھے دوبارہ اپنے مرکز کی طرف لے آیا تھا۔ یعنی میں پاکستان آ گیا۔ ٹھکانہ پہلے بھی میرے پاس نہیں تھا اور اب بھی۔

ایک برائے جانے والے کے توسط سے ایک اسکول میں مجھے بہت مختصر تنخواہ فرسٹ ہال کا پتھر رکھ لیا گیا تھا۔ رہنی کا سلسلہ تو چل رہا تھا۔ آہم رہنے کے لیے ایک چھت کی ضرورت تھی۔ اختیار بنی کے شہر نے ٹھکانہ بھی فراہم کر دیا۔

بڑا دل تھیلی کو اپنے پکان کے لیے میرے جیسے لڑکے کی ہی ضرورت تھی۔ یعنی پکان سے متعلقہ اشیاء ہر روز خرید کر لانے کی ذمہ داری میری تھی۔ علاوہ ازیں مجھے بچوں کا ٹیوٹر بھی رہنا یا گیا۔ میڈیم کو خیر ہوئی کہ میں اچھی انگریزی بولتا ہوں، سو مجھے بچوں کو انگریزی سکھانے پر مامور کر دیا گیا۔ پھر میڈیم کو بچوں کے توسط سے پتا چلا کہ میں فرسٹ ہال کا بہترین کھلاڑی رہا ہوں۔ یہ ہوائی نہ جانے کس دشمن نے اڑائی تھی۔ بہر حال ایک گھنٹہ قریبی پارک میں بچوں کو فرسٹ ہال کی پریکٹس بھی کروانا پڑی۔

میڈیم کو اندازہ تھا کہ میں اچھی ڈرائیونگ کر سکتا ہوں۔ سو مجھے بچوں کا ڈرائیور بھی بننا پڑا۔ بچوں کو اسکول تک لے کر ڈرائیو کی ذمہ داری بھی میرے ہاتھوں کاندھوں پر ڈال دی گئی۔ تاہم میں آخری میل میڈیم کی تک چڑھی کو کنک ایکسپریٹ مس ٹینا نے ٹھونک

میں رکارت سمجھا تھا۔ ظاہر ہے ایک ڈوائف کی بیٹی کو فرقان کے گھر والے بھی بیاہ کر نہ لے جاتے۔ اسی طرح چاہتا ہے ہی اپنی محبت اور پسند کو حاصل کرنا تھا۔ کیا فرق پڑتا تھا کہ ماں کی خوشی کا احساس کیا تھا یا نہیں کیا تھا۔

پھوپھی بھی کتنا عرصہ واوی کی نظروں میں دھول جھونکتی رہی تھیں۔ وہ وہ چال ڈھال سے چہرے چہرے سے جان جاتی تھیں کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ اپنی بیٹی کے انداز دیکھ کر قطعاً نہ خشکوں۔ کتنی بڑی سزا قدرت کی طرف سے انہیں ملی تھی۔ اللہ نے اگر کچھ اختیار دے رکھا ہو اور اسے ناجائز طریقے سے استعمال کیا جائے تو اس سے بڑا گناہ کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے علم اور ہنر کو غلط استعمال کرنا بھی گناہ ہوتا ہے۔ گناہ پھوپھی یا پڑا نہیں ہوتا، بس گناہ ہوتا ہے۔

میرے جاننے میں کہیں نہیں واوی کا چھپ چھپ کر رہنا بھی محفوظ ہے۔ شاید وہ اپنی اولاد کی بھارت کی بو یا ہی چکی نہیں یا پھر جو بھی تھا اسے کتاہوں کا اور آگ پیمانوں کے بیچ لڑھے میں دھکیلتا ہے۔ محلے کی کتاہاری لڑکیوں کے کیس لیتے ہوئے کبھی اپنے گھر کی عزت کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا۔

پھوپھی کے عائب ہونے کے بعد رجیمال والی کی بیٹی کے مجھے کئی گلی اور بازار بازار پختار سے لے کر سٹائے گئے تھے۔ مگر یہ کھیل تو پھوپھی نے شاید کالج کی شروعات میں رچا لیا تھا۔ مطلب نکاح کر لیا تھا۔

چاچا بھی شدید اسٹیس کا تنفس تھیں شاید۔ ظاہر ہے چاچا کے رشتے داروں میں ان کے دو بہن بھائی تھے۔ ایو تو چاچا کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ البتہ اسپارٹ سی خوب صورت پھوپھی جو بلا کی خوش لباس تھیں۔ چاچا کی پسندیدہ ہستیوں میں شامل تھیں۔

میں کبھی کبھی حیران ہو کر سوچتا تھا ابو کے علاوہ رجیمال والی کے دونوں بیٹے ہر لحاظ سے کامیاب زندگی گزار رہے تھے۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ کمی تو ضرور ہوتی ہے۔



دیا۔ سچوں کی فرمائش پر ایک دین کی ایک کیا بیگ کر دیا تھا؟  
 مس شینا سے شیف بنانے پر دل کی۔  
 مس شینا ویسے بھی مجھ غریب سے خار کھاتی تھی۔  
 اس روز معمولی سی جھڑپ گیا ہوگی مس شینا نے مجھ پر  
 چوری کا الزام لگا دیا۔ میں ناشتے کے لوازمات لےنے  
 مارکیٹ گیا تھا جب کسی نے میرا والٹ اڑا لیا۔ مگر  
 مس شینا نے ماننے سے انکار کر دیا۔ خواجوا میری  
 بے عزتی کی۔ مجھے خوب ذہیل کیا۔ مگر صلا ہو میڈم کا ان  
 تکیات پہنچی اور میری خلاصی ہوئی۔  
 ”اب تم ہٹاؤ کیا تم دوستی کے رشتے کو قائم رکھو گی۔  
 یہ سب جاننے کے بعد کہ میں کون ہوں۔“ حمزہ نے  
 اپنا تک ہی گفتگو کے سلسلے کو منقطع کر کے بے حد  
 نتیجہ پیشی فریا سے کہا۔  
 ”بولو نا فریا!“ فریا کی خاموشی نے حمزہ کو حد درجہ  
 متوحش کر دیا۔

”کیا بولو؟“ بہت دیر بعد فریا نے کہا بھی بولا۔  
 ”یہی کہ تمہیں ایک ڈرائیور، ایک پیونر اور ایک  
 شیف سے دوستی منظور ہے۔“ حمزہ کے چہرے پر  
 خوف ناک قسم کی شیدگی طاری تھی۔  
 ”بولو فریا۔“ وہ بے انتہا بے قرار ہوا۔ ”جو اب وہ“  
 خاموش کیوں ہو؟“ گویا وہ رو دینے کو تھا اور اسی۔  
 بے قراری کے عالم میں وہ گفتگوں کے بل فریا کے قدموں  
 میں پیٹھ گیا۔

”کہا تو ہے بار! منظور ہے منظور ہے منظور ہے۔  
 کسی انگری منہ برسا کروانے ہیں کیا۔“  
 وہ پشیمان ہوئے گھر رہی تھی جبکہ حمزہ کا کب کار کا  
 ہوا سا اس ایک دم بحال ہو گیا۔ اس کے چہرے پر  
 ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ اگر فریا دھیان دیتی تو  
 ضرور ٹھنک جاتی۔ وہ فریا کی اس احساس سے مسرور تھا  
 بے انتہا مسرور۔



وہ فریا سے اتفاقاً ہر اس جگہ ٹکرا رہا تھا؟ جن  
 اس کی مہجوں کی کا اسے یقین ہوتا۔ مارکیٹ، پارک،

کانوں کی سڑکوں پر۔ آئندہ آنے والے ان چار پانچ  
 مہینوں میں اس نے فریا کے گرد ایسا دائرہ کھینچ کر اس  
 میں محصور کر لیا تھا کہ وہ چاہے کبھی اس دائرے سے نکل  
 نہیں سکتی تھی۔ وہ اس دائرے سے نکلنا چاہتی نہیں  
 تھی۔ وہ ایسی کوشش کرتی ہی کیوں؟ کیونکہ فریا متفق  
 این۔ دو سالوں میں محمد حمزہ کی محبت میں گرفتار ہو گئی  
 تھی۔

وہ محمد حمزہ جو بزوالی ہاؤس کا ڈرائیور تھا۔  
 اک عام سا بیڑا تھا۔  
 معمولی سا شیف تھا۔

فریا حقیق جو پلاکی ڈیزین تھی۔ پوزیشن ہولڈر تھی۔  
 گولڈ میڈلس تھی۔ بے حد عام سے محمد حمزہ کی محبت  
 میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جس کا ایک ریکارڈ صاف  
 سیٹ کی مانند تھا۔ جس کے ہر صفحے پر اس کی زندگی  
 کے ذاتی تجربات درج تھے۔

جب وہ میس پر کھڑی ہوتی۔ سامنے والوں کے  
 دسمعہ عریض لان میں حمزہ جھٹلایا سا بچوں کے ساتھ  
 ہنس کھیلا رہا ہوتا۔  
 ”برا شوق ہے ان کی ماں کو انگریزی دان بنانے کا۔  
 بولنا ابھی آتا نہیں۔“ ذاتی تین سال کے ان بچوں کو  
 میں بھلا گیا کھلاؤں۔ ”وہ غصے سے بڑھتا ہے کچھ دیر بعد  
 فریا کے رو بہو ہوتا تھا۔

”ایک تو میڈم بزوالی نے ہر سا تڑکا پچھلا ہوا ہے۔  
 پورے نو بجے لگتا ہے ٹکڑے ٹکڑے ہڈی والوں کا زور  
 تھی تھکے طعنے پر چلتا ہے۔“ وہ سخت ہنستا ہوا تھا۔  
 ”تم کوئی ڈھنگ کی جاب کیوں نہیں کرتے؟“ فریا  
 نے اور بھی اسے بتایا۔  
 ”آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری ہولڈر ہوں تا!  
 ڈھنگ کی جاب تو مجھے نظری میں سجا کر پیش کر دی  
 جائے گی۔“ حمزہ نے حقیقت سے کہا۔

”تم نے فیوچر کی کوئی پلاننگ کی ہے یا یوں ہی مسز  
 بزوالی کا ڈرائیور بنے رہنا ہے۔“ فریا نے کافی شیدگی  
 سے کہا تھا۔  
 ”یار! میں مسز بزوالی کو کافی آئیڈیلٹری کرتا ہوں۔

فیوچر میں ان کی طرح فٹ بال کی ٹیم بنائوں گا۔“ وہ  
 مزے سے کینو پھیلتے ہوئے بولا۔ ”میرا فی الحال فیوچر  
 پلاننگ نہیں تک ہے۔“

”فٹ بال کی اس ٹیم کو خوار کرنے کے لیے پیدا کرو  
 گے۔ اپنے جیسا شیفت اور ڈرائیور بناؤ گے انہیں۔“  
 فریا نے اس کے کندھے پر ہمو کا بڑا۔  
 ”یہ تو ان کے نصیب ہوں گے وہ جیسے بھی بن  
 جائیں۔“

”جو موت ہمیں سہی نہیں ہوں۔“  
 ”میں ابھی مان اور پتے لگا کر آ رہا ہوں۔ مان سہی پس  
 نہیں ہوں۔“ وہ آدھا کینو فریا کو زبردستی تھما کر لاپرواہی  
 سے بولا۔

”مجھے کینو پسند نہیں۔ تم جانتے ہو۔“ وہ منہ بنا کر  
 پھٹے ہوئے کینو کو دیکھنے لگی۔

”شیر تو کرتا ہے۔ چاہے وہ بوا اگلا ایک ہو بریڈ کا  
 نہیں ہو۔ آس کر نیم کا کپ ہو۔ میرا دل ہو یا تمہارا  
 دل۔“ وہ سرصری انداز میں گہری باتیں کرنے کا عادی  
 تھا۔

”میں کبھی نہیں۔“ فریا حیران ہوئی۔  
 ”یہ فری! اتنی پھٹنی اور عام سی بات تمہاری سمجھ  
 میں نہیں آتی۔ میرے دل کا آدھا حصہ میرا اور آدھا  
 تمہارا۔ اسی طرح تمہارا دل بھی آدھا تمہارا اور آدھا  
 میرا رہی نہیں۔“

وہ ایسا کینو کھا چکا تھا اور اب ایک ایک بھانگ فریا کو  
 زبردستی کھلا رہا تھا۔ حالانکہ وہ اس ہانگ کینو کو دوسرے  
 ہاتھ میں دینے پیشی تھی اور حمزہ کو باتوں میں انکار کھاتا  
 تاکہ اس کا دھیان فریا کے ہاتھ کی طرف نہ جائے مگر وہ  
 بھی تو حمزہ تھا۔ اور اس کی نظرس بھی فریا کے ہاتھ پر جمی  
 ہوئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ فریا کو کینو سخت  
 ناپسند تھے۔

”مگر آدھا دل ہی کیوں؟ پورا کیوں نہیں۔“ اسے  
 سخت اختلاف ہوا۔  
 ”فری یار! تمہارے دل میں بھروسہ بھرا ہے۔  
 پورا دل مجھے دہی تو تم دل کے بغیر زندہ کیسے رہو گی۔

آدھا دل تمہارے پاس رہے گا اور آدھا میرے پاس۔  
 دونوں کا کام چلنا رہے گا۔“ وہ تیسری بھانگ فریا کے  
 منہ میں زبردستی ٹھونس کر بولا۔

”بس بھی کرو حمزہ! کھانا۔ اتنے کینو پسند ہیں  
 تمہیں۔ جب بھی آتے ہو ایک دو اٹھالٹے ہو۔“ فریا  
 نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے۔

”یہ تو تمہیں کھانا ہی بڑے گا۔“ وہ چوتھی بھانگ  
 اس کے منہ میں ڈالنا چاہتا تھا جب فریا نے پاس رکھا  
 چھلایا کینو پورا اٹھا کر حمزہ کے منہ میں ٹھونس دیا اور  
 خود بھاگ گئی تھی۔ جبکہ حمزہ کینو منہ سے نکال کر چونکا  
 ہی رہ گیا تھا۔



”بہت دن ہو گئے ہیں مسٹر مین جو میز کو نہیں  
 دیکھا۔“ وہ بڑے بڑے تھیلے اٹھائے ہانپ رہا تھا۔ فریا  
 بھی اپنی مطلوبہ اشیاء اٹھائے اس کے پیچھے بھاگی ہوئی  
 آئی۔ اب وہ دونوں فٹ پاتھ پر رکتے بیٹھ کر باتیں  
 کرنے لگے تھے جب آپناک حمزہ کو وقاص کا خیال  
 ”وہ کوئی تمہاری طرح فارغ ہے۔ اتنی بڑی  
 پوسٹ پر کام کر رہا ہے۔“ فریا نے اپنے بالوں کو کھینچو  
 سے آڑا لیا۔

”تمہارا آکرانہ کچھ زیادہ ادھر کے چکر نہیں لگاتا۔“  
 ”چکر؟ وہ تو ہمارے یہاں آنے سے پہلے سارا دن  
 ہمارے گھر میں رہا کرتا تھا۔“ تھیلے میں سے دو چاکلیٹ  
 نکالتے ہوئے فریا نے لاپرواہی سے کہا۔

”آج چھی پرستا تھی ہے وقاص صاحب کی۔“ حمزہ نے  
 براسا منہ بنا کر عرضی جملے ادا کیے۔  
 ”آج چھی نہیں بہت اچھی۔“

”اب ایسا بھی شرابہ گلفام نہیں۔“  
 ”تم کیوں جیلسن ہو رہے ہو؟“ فریا نے اسے  
 چڑایا۔

”ہونہہ“ مجھے کیا ضرورت ہے جیلسن ہونے  
 کی؟  
 ”مجھے تو جلنے کی سخت بو آ رہی ہے۔“ وہ ایک







جواب نہ ملنے کا قلق تھا۔

”تم کافی نہیں پیو گے؟“ نانا ابھی تک وہیں اٹھی تھیں۔

”فریاز کو پسند نہیں۔“

”وہ تو مجھے بتا ہے۔“ تاجران ہوئیں۔ ”یہ کبھی بھی کافی نہیں لی سکتی۔“

”فریاز کو میرا کافی بیٹا پسند نہیں۔“ حمزہ نے وضاحت کی۔

”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔“ ننانا نے گاؤری سے کہا ”یہ تو ایسے ہی کہتی رہتی ہے۔ تم کافی ضرور پیو۔“ وہ غور کافی بیٹا پسند کرتی تھیں۔ ”اگر کچھ چھوڑنا چاہتے ہو تو یہ شیفٹ کی جانب چھوڑ دو۔ تم برسوں نہیں کرتی۔“

ننانا نے فریاز سے اپنی ناپسندیدگی واضح کی۔

”غذیب ایسا ہی کروں گا۔“ حمزہ کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

”کیا مطلب؟“ فریاز چوکی۔

”کچھ نہیں یاد۔ ہمیشہ کی طرح جہ مال گیا تھا۔“

”کبھی کبھی تم بہت پراسرار ہو جاتے ہو۔“

”مطلب مشکوک۔“ حمزہ نے فریاز کے منہ کی بات پھینک دی تھی۔

”میں آف گورس۔“

”تیسرا آگیا خیال ہے۔ اس پر اسراریت کے پیچھے کوئی ریزن ہو سکتا ہے۔“ حمزہ ہنستے ہوئے بہت گہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔“

”یہ استادوں والے جواب نہ دیا کرو۔“ بیگم لالہ جی سوسوں سے بھری پلٹ کر فریاز کو تھما گئے تھے ان کو آخر کرنے کے بعد خود کھانے میں مصروف ہو گئی تھی حمزہ اور نانا دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔

”جسوریت کا ہی بیخام ہے۔“ حمزہ نے طنز کیا۔

”کون سا بیخام؟“

”وہ جو مجھے اور نانا کو نظر آ رہا ہے۔“

”آپ دونوں کو کیا نظر آ رہا ہے۔“ فریاز نے ہونٹوں

کی طرف انہیں دیکھا۔

”یعنی ہمیں ایک ایک مٹھی سی سموسی سے ہلا کر پوری پلٹ اپنے سامنے رکھ کے خود کھانے میں جٹ گئی ہو۔“ دراصل جسوریت کا بھی یہی سیج رہا ہے۔

”حمزہ نے مزید گل افشانی کی۔ ”کوٹ مار چھینا۔“

”مجھے نظر مت لگانا۔“ فریاز نے فوراً پلٹ سائیڈ پر کھینچی۔

”تمہیں نظر نہیں لگاؤں گا۔ بس یہ آٹھواں سموسہ مت کھانا۔“

”حاصل! تمہیں لکھایا گیا ہے۔“ وہ چیخی۔

”میری بھلا یہ خیال؟“ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”اس کا پتہ تنگ کا کیا مقصد ہے؟“ وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو چکی تھی۔

”صرف یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اگر تم لیڈی نیٹی کی بیکری کا چارج سنبھال لو تو بیکری میں میل کرنے کے لیے چھوڑ دوکٹ میں کچھ نہیں بیچے گا۔“ حمزہ نے

توڑے کا آخری سب لے کر اسے لے لیا۔

”اور لیڈی نیٹی تیسرا قیمہ بنا دے گی۔“ وہ آخری سموسہ منہ میں رکھتے ہوئے حمزہ سے بولی۔

”اور میں اس قیمے سے کونٹے اور کباب بنا لوں گا۔“

”حاصل بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔“

”مجھے محبت کا اثر ہے۔“ اور بیگم لالہ سے بولا۔

”بھول گئے ہو اپنا رونا دھونا۔“ مس بیگم لالہ نے

عزتی کروا کے شیخ پڑھتے رو رہے تھے۔ اگر میں دیکھ نہ لیتی تو ساری رات بھوکے پیاسے لڑھکتے رہتا تھا۔“ فریاز بھی جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

”احسان عظیم ہے۔ کیسے اناروں کا میں اس مبارک جتنے احسان کا بدلہ۔“

”آہہ! تمہیں ہوا۔“ فریاز نے نشو سے ہاتھ پونچھ کر مزے سے کہا۔

”کیسے؟“

”مجھے لائبریری چھوڑ کر آؤ۔“

”کیا مطلب؟ ایک سموسہ کھانے کے بعد اتنی بڑی سزا۔“ حمزہ نے دہائی دی۔

”لیگو نہیں۔“ مسز زولانی کے ڈرائیور بے رہتے ہو۔ حمارے شہر میں لور لور پھرتی ہیں۔“

”صفت میں نہیں گھماتا۔“ وہ جو گرز کے قسے کتنا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”اگتے جھٹکے جوتے اور کپڑے اور یہ سوٹر بھی امپورٹڈ لگا رہا ہے۔“ شعل سے ڈرائیور۔ لگتے نہیں ہو۔“ قریب ایشا لڈر بیک چیک کرتے ہوئے بولی۔

”ابو نے لے کر دیے تھے۔ ورنہ میں خواب میں بھی انہیں خرید نہیں سکتا تھا۔“ وہ صاف کو تھا اور اس کی صاف گوئی کی فریاد بولی تھی۔

”تم جانتے ہو۔“ مجھے تم میں کیا چیز ایسی دکھائی دی جو

میں نہیں رہی ہوں تم بہن کی ہوں۔ تمہارا دل بن گیا ہوں۔“ جو اس سینے میں اپھیل بجا رہا ہے۔“ فریاز نے کافی کی چالی اس کے ہاتھ میں تھامے ہوئے

بند کرنے کے شہادت والی انگلی اس کے سینے پر رکھی۔

”کون سی چیز؟“ کچھ مل کے لے حمزہ فریاز کو کہا تھا۔

”تم سچے ہو۔“ سچ بولتے ہو۔ مجھے صرف وہ قسم کے لوگ بے حد پسند ہیں۔ ایک وہ جو سخت جان ہوتے

ہیں۔ ہر قسم کی مشقت کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ محنت سے کھیلاتے نہیں۔ بلکہ پہلا قدم اٹھا کر چینی

سیڑھی پر قدم رکھنے والے لوگ میرا آئیڈیل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں۔ جو زندگی کی جدوجہد میں بھی پیچھے

نہیں رہتے۔ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں نہیں رہتے۔ مجھے ایسے لوگ ہی پسند ہیں جو لوہا کو ٹٹے سے

لے کر گار اٹھانے تک ہر کام لگن اور شوق سے کرتے ہیں۔ شرم محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لوگ تکبر سے

پاک ہوتے ہیں۔ تم میں ان دونوں قسم کے لوگوں والی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ہمیں ”سچ“ بولتے رہنا

ہے۔ محبت اور وفا میں بس یہی شرط لازم ہے۔“

”فریاز! کیا تم خود کار ڈرائیو کر کے لائبریری نہیں جا سکتیں۔“ ایک دم حمزہ سر سے لے کر تیر تک منجھد ہو گیا تھا۔

”حمزہ! تم ٹھیک تو ہونا!“ فریاز اس کے رنگ بدلنے چہرے کو دیکھ کر تھک گئی۔

”پلیز فریاز! نو کونسل جن۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر فریاز سے کہا۔

”مگر اندر چلو۔“ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔“

”فریاز! پلیز میرا ہاتھ چھو ڈو۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ فریاز سے فریاز کے ہاتھ میں دبا دیا ہاتھ چھڑوانے لگا۔

”مگر حمزہ!“

”تو اگر مگر۔ ہم شام کو ملیں گے۔ میں تمہیں شام کو لائبریری لے جاؤں گا۔ پلیز فریاز! ہائینڈ مت کرنا۔“ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا پھرتی گیسٹ عبور کر گیا تھا۔ جبکہ فریاز

چران حیران ہی رہا آگے کی سیڑھیوں پر بے دم کی بیٹھ گئی۔



”کیا ہوا تھا؟“ ہر گز۔ کیوں چلے گئے تھے اجانک؟“

وہ اسے لائبریری لے جانے کے لیے آیا تھا۔ امیرین باندھے ہاتھوں پر نجانے کیسے کیسے مسالاجات لگے تھے۔ اچھے سلجھے ہال۔ فریاز نے غور کیا۔ اس تمام عرصے میں پہلی مرتبہ فریاز نے اسے یوں سوچوں میں گم

پریشان پریشان دیکھا تھا۔

”کیا ہوا تھا؟“ وہ احتیاط سے ٹرن لے رہا تھا۔

”حاصل! اتنے انجان مت بنو۔“ فریاز خفا ہوئی۔

”مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ دوستی کے ایگری منٹ۔“ واضح حروف میں کیا لکھا تھا۔ ہاف کینو“

ہاف ایک ہاف بریڈ کہاں تو ہر چیز شیئر کرنے پر تیل ہوتے تھے۔“

”فریاز! تمہیں زردہ بنانا آتا ہے۔“ وہ نجانے کس مشکل میں پھنسا ہوا تھا۔

”زردہ؟“ فریاز کو شدید غصہ آیا۔ ”یہ سچ میں زردہ



ہو گیا نا... رنگ گورا

new **White Gold**

whitening cream  
with papaya extracts



SHINING  
GUARANTEED  
WHITENESS

GENUINE  
GUARANTEED  
PRODUCTS  
ONLY  
IN SHOPS



A Product of  
WHITEGOLD FRANCE INT.  
www.wgfrance.com | email: info@wgfrance.com

دشٹی۔ اس نے حمزہ کے لبوں پر اچھلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔  
 ”او۔“ فریا بات کر چکی تو حمزہ نے اطمینان بھرا سانس خارج کیا۔  
 ”آج تو نکال ہی بنا دیں گے۔ آئینہ بھی اگر میڈم کی زبان تمہاری طرح پتھارے لینے لگی تو پھر کیا کہوں گا۔“  
 ”پتھر بھی بنگلی ہی ہیں نا!“  
 ”چھو فریا عشق!“ وہ مطلوبہ جگہ گاڑی پارک کر چکا تھا۔ ”میں تمہارا ویٹ کروں یا جاؤں؟“  
 ”میرے ساتھ اندر آ جاؤ۔“  
 ”بڑھے لگنے والی لوگوں میں میرے جیسے بے ادب کا کیا کام۔ چلا ہوں، ایک گھنٹے بعد آؤں گا۔“ وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔  
 ”حمزہ! رکو تو۔ سنو تو۔ جانے! اوجھلے!“ وہ جتنی رہ گئی تھی گمراہ حمزہ ہی کیا جو سن لیتا۔  
 اپنی مطلوبہ کتابوں کو دیکھ دی تھی جب وقاس نے اسے دیکھا اور قریب چلا آیا ”تو یہ مال؟“ اسے دیکھ کر اس نے ہنسا نظر آ رہی ہو، کیا وہ برائے نہیں سمجھا گیا۔  
 ”وقاس نے چھوئے ہی کافی۔“  
 ”وقاس؟“ فریا نے کافی باراضی سے اسے دیکھا۔  
 ”حمزہ کے بارے میں اس لیے میں بات نہ کرو۔“  
 ”کیوں؟“ وقاس کی بھتوس تن گئیں۔ ”پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ مسٹر شیفت سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“  
 ”وہ اہی جو تم سے ہے یعنی دوستی گا۔“ فریا نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ”وہ بہت بے ضرر اور مخلص ہے۔“  
 ”چھا۔“ وقاس نے طنزیہ انداز میں ہوش سکیڑے۔ ”اس نے خلوص کے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں۔ یا خلوص کی بوریاں بھر بھر کے لایا ہے۔“  
 ”وہ چہا چہا کر بولا۔“  
 ”پلیز وقاس! تمہاری حمزہ سے کوئی دشمنی ہے کیا؟“

کہا کہ تم سے کیا پوچھ رہی ہوں۔“  
 ”چہا تو فری!“ وہ کافی ریش ڈرا سینگ کر رہا تھا۔  
 ”شاید وہ بہت جلدی میں تھا۔“  
 ”چھوڑی چھارے ہو یا جہاز؟“  
 ”جہاز اڑاتے ہیں۔“ وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”چلاو تے نہیں۔“  
 ”میں نے کا شکر ہے۔“ فریا جل کر بولی۔  
 ”تم بھی مجھے زردہ کی رپسی بنا کر شکر کا ماسج دو۔“ وہ شامی مسکرایا تھا۔  
 ”مجھے نہیں ہانا آتا۔“  
 ”میں رنگالی جی سے پوچھ لیتا تو بہتر تھا۔“  
 ”تو پوچھ لیتے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ناراضی صاف ظاہر تھی۔  
 ”پلیز فری! اپنا دونا!“ حمزہ نے خوشامدی مسکراہٹ لبوں پر سما کے کہا۔  
 ”یہ قسمی کی جان کتنے میں پھنس گئی ہے یہ سارا کیا دھرا میرا ہی ہے۔“ وہ خود کو کوس رہا تھا۔  
 ”چہا کیا ہے؟“ فریا زیادہ دیر بے نیاز بھی نہیں رہ سکتی تھی۔  
 ”میں بٹنا دفغان ہو گئی ہے۔“  
 ”کہاں؟“ فریا کی ہنسی بھوت گئی۔  
 ”کراچی۔ کسی اور جگہ سے آ کر کیا ملی، حمزہ نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لی تھیں۔ میڈم نے مجھے کچن میں کھپا دیا ہے۔“ وہ سخت مشتعل تھا۔ ”میڈم کی پکی نے مجھے بد اسٹی خانسا ماں یا خاندانی باقی سمجھ رکھا ہے۔  
 ”نجانے کیسی کیسی دشمن کے نام لکھا ہے ہیں۔ زردہ کینار گوشت کمریلے کی بھیجا۔“  
 ”نجانے یہ کمریلے کی بھیجا۔“  
 ”کیسے بنتی ہے۔“  
 ”آف مانی گاؤ!“ فریا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔  
 ”آراؤنڈ اٹ۔“ وہ بغیر رالے مزے سے بولا۔  
 ”تمہارے اس مسئلے کا حل ہے میرے پاس۔“  
 فریا نے ہنسی بجا کر سیل فون پر ایک نمبر ریس کیا۔  
 ”کس سے بات کرنے لگی ہو۔“ حمزہ نے حیرانی سے پوچھا۔



"زیب لگتا ہے مجھے" وہ عمل بھن کر بولا۔  
 "زیب کیا تمہارا کوئی دوست ہے" اس نے بڑا کی  
 معصومیت سے پوچھا۔  
 "میرا نہیں وہ تمہارا دوست ہے۔" وقاص نے  
 وانت ہیں والا۔ "نور کے والا۔"  
 "سنو کی بات کر رہے ہو؟"  
 "جی ہاں۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لائبریری سے باہر  
 نکل آیا تھا۔  
 "میری کتابیں۔" قریب چینی رہ گئی۔  
 وہ روڑہ کو اس کے ایک کپڑے میں گھس آیا تھا۔ فریا  
 بھی اس کے ساتھ گھس رہی تھی۔  
 "میں کیا کیوں لائے ہو؟" وہ ناراضی سے بولی۔  
 "تمہارے ساتھ چائے پینے کو دل چاہ رہا تھا۔"  
 وقاص نے طنز کے تیر پیٹنے کے "بات کرنی ہے تم سے"  
 دو ٹوک۔  
 "یہ جو تمہارے نا افسوس بانی کا شیف۔ ایک نمبر کا  
 فراڈ ہے لکھو الو مجھ سے۔" وقاص حد درجہ سنجیدہ  
 ہو گیا۔  
 "تم سے کس نے کہا؟"  
 "میں آنکھیں رکھتا ہوں۔ سوچنے کے لیے ایک  
 عدد دیا ہے جس کا ہے۔" وقاص نے ویز کو دو چائے لانے کا  
 آرڈر دیا تھا۔  
 "نیمس آؤں! میں شوہرا کھاؤں گی۔ چائے تم خود  
 پیو۔" فریا کی بھوک ایک دم بیدار ہو گئی۔ "پیس بھی  
 منگواؤ۔" اس نے تحکم سے کہا۔  
 "لو کے جناب!" وقاص نے ویٹر کو پھر سے آواز  
 دے کر آرڈر نوٹ کروایا۔  
 "تم تمہارے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" کچھ  
 دیر بعد وہ شوہرا کھاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔  
 "کچھ نہیں بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے  
 لکھو الو یہ حزن نہ بے ضرر ہے تا معصوم۔ اس کی  
 آنکھیں دیکھی ہیں۔ عجیب سی پنک ہوئی ہے اس کی  
 آنکھوں میں۔ شکل سے ہی پراسرار لگتا ہے۔ تم  
 نجانے کس دنیا میں رہتی ہو فریا!"

"تم کتنا کیا چاہتے ہو۔" فریا بھی ایک دم سنجیدہ  
 ہو گئی۔  
 "بہت غظیم نقصان سے دوچار کرے گا تمہیں۔"  
 وقاص نے سامنے رکھی چائے کی طرف دیکھا تنگ  
 نہیں تھا۔  
 "کیسا نقصان؟ زیور چائے گا؟ ڈاکو ڈالے گا؟ کیا  
 کرے گا؟" فریا سخت مشتعل ہو گئی تھی۔ "تمہیں  
 لگتا ہے تمہارے اس طرح کر سکتا ہے؟"  
 "ہاں۔ ڈاکو تو وہ ڈالے گا۔ لوٹے گا ضرور مگر  
 تمہارے دل کو۔ مجھے سب نظر آ رہا ہے۔" وقاص نے  
 لب کچل کر کہا۔  
 "تمہیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اگر درست ہوا تو  
 پھر؟" فریا کے چہرے پر تھکا دینے والی سنجیدگی پھیل  
 گئی تھی۔  
 "تو بیکر کیا؟" وقاص کا گویا میٹر گھوم گیا۔ "تم اپنے  
 لیے اس معمولی سے شیف کو سیکٹ کر لو گی۔ جس کا  
 کوئی فیوژر نہیں۔ کوئی آئیڈلک رکھو نہیں کوئی نام و  
 نشان نہیں۔ حسب سبب نہیں۔ خاندان نہیں اسحق  
 کہ زندگی کی بنیادی ضروریات فراہم کرنے کے لیے  
 پیر تک نہیں آسوس ہو رہا ہے مجھے تمہارے  
 انتخاب پر۔"  
 "انگریزات نکلی ہے تو میں وضاحت کر دیتی ہوں۔ یہ  
 بات میں تم سے چند دن میں شیئر کرنے والی تھی  
 وقاص! "فریا تیز ذہن کا شکار کچھ بل کے لیے خاموش  
 رہی۔ "مجھے اس معمولی سے نمبر تمہارے سے محبت ہو گئی  
 ہے۔ مجھے کب کس لیے؟ کس گھڑی مگر میں خود کو  
 اس معاملے میں بے بس پاتی ہوں۔" وہ ہوش کا کونا  
 کچلتی دیر دیر سے کئی بولی گئی۔  
 "فری! فری! تم سوچو! بن سن۔ طرز رہائش  
 کہیں بھی تو وہ تمہارے ہم پلہ نہیں کیا۔ کیا دیکھا ہے  
 تم نے اس۔ اچھو سے لڑکے میں۔" وقاص گویا  
 پھٹ پڑا۔  
 "اور فری! میری بات نہیں نہیں کر لو! جو وہ نظر آتا  
 ہے وہ ہے نہیں پرتیں چڑھا رکھی ہیں اس نے خود

"تم کتنا کیا چاہتے ہو۔" فریا نے بے بسی سے  
 پوچھا۔  
 "اس نے تمہیں بتایا کہ وہ برطانوی فیمنٹلی  
 ہولڈر ہے اور تم نے لیٹن کر لیا۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔  
 اس کے پاس برطانیہ کا ویزا ہوتا تو اسے ایک دو ٹکے کی  
 ملازمت کرنے کی پھیلا کیا ضرورت تھی۔ چند ہزار  
 کمانے کی بجائے پونڈز لگتا۔ احمق! وہ تمہیں  
 یہ وقت بنا رہا ہے۔ نالور تمہیں تباہ کر کوئی بڑا چکر  
 چلائے گا۔ یہ تمہارے لگایا تمہیں۔"  
 "ابو اس مست کرو وقاص!" فریا کا چہرہ ایک لمحہ  
 رنگ بدل گیا۔  
 "تمہارے بارے میں تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔  
 حزنہ ایسا نہیں ہو ہی نہیں سکتا۔"  
 "تمہاری آنکھوں پر مٹی بندھ چکی ہے۔ نام فریاد  
 محبت کی بنی۔" وقاص نے بے بسی سے اپنی پیشانی پر  
 مٹکا مارا۔ "ایک آخری بات سن لو۔ وہ ایک سچے بڑے  
 ہے۔ تم سے دو برس چھوٹا یا دو گھنٹا آٹنی دہائی پر۔  
 کھڑے قدم ہمارے گے لیے اسے سنگلخ زین  
 چاہیے۔ تم اگر زمین کا زرا اس حصہ سے پیش کر دو گی تو  
 وہ اپنے قدم مضبوطی سے جملے گا اور پھر کبھی اڑان  
 بھرنے گا۔ اس طرح سے کہ پھر فریا شوق ہاتھ ملتی رہ  
 جائے گی۔ ایک اچھے دوست کا مخلصانہ مشورہ ہے۔  
 ابھی سے خود کو روک لو۔"  
 "میرے اچھے دوست شوہرا کھلانے کا شکر ہے۔" وہ  
 سر جھٹک کر مائل پر چھائی کثافت کا اثر ڈالنے کرنے  
 کی غرض سے بولی۔  
 "تمہارے شکر کا شکر یہ! اٹھو۔ تمہارا مسٹر شیف  
 آ گیا ہے۔" وقاص گھاس و تھوس سے باہر دیکھتا ہوا کھڑا  
 ہو گیا تھا۔  
 "تو ایک بات تو واضح ہو گئی۔ میں تمہاری زندگی اور  
 دل میں نہیں نہیں۔" بل بے کرنے کے بعد وہ فریا کی  
 طرف دیکھ کر پھینکے انداز میں مسکرایا۔ "بہر حال میری  
 گڈوشن اپنی سب سے اچھی دوست کے لیے خدا

کرتے ہیں دیکھی انگریز تمہارے حق میں بہتر ثابت  
 ہو۔"  
 وہ دونوں ایک ساتھ کھینے سے باہر آئے تھے۔ فریا  
 نے غور نہیں کیا تھا ورنہ حزنہ کے ماتھے پر ناگوار سلولوں  
 کو دیکھ کر ضرور تھنک جاتی۔  
 "میں تمہیں لائبریری میں چھوڑ کر گیا تھا۔ برآمد تم  
 کینے میں سے ہوئی ہو۔ وہ بھی وقاص کے ہمراہ۔" وہ  
 ڈرائیونگ کرتے ہوئے عجیب انداز میں بول رہا تھا۔  
 "وقاص مجھے زبردستی لے گیا تھا۔" وہ اپنا بیگ  
 کھنگالتے ہوئے لائبررائی سے بولی۔  
 "کیا کیا باتیں ہوئیں؟"  
 "وہم ہی موضوع گفتگو رہے ہو۔" فریا نے  
 مسکراہٹ دیا کرتا تھا۔  
 "کیا کیا میری شان میں فرماتے رہے ہیں وقاص  
 صاحب! حزنہ کا انداز بھر پور طنز ہے ہونے لگا۔  
 "چاہتا ہوں اس نے اصرار کیا۔  
 "وقاص نے تمہیں پر پوز کیا ہو گا۔" اس نے  
 قیاس آرائی کی۔  
 "وقاص کو مجھے پر پوز کرنے کے لیے کھینلانے کی  
 ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنا پر پول کھڑ بھجوا سکتا  
 ہے۔"  
 "ہوں۔" حزنہ نے ہنکار ابھرا۔ "تو پھر پورا ایک  
 گھنٹہ وہ جھٹک مارتا رہا ہے سب سے سب سے گفتگو کرتا رہا  
 ہے۔ ملکی حالات کے بارے میں فکر مند تھا۔"  
 "ملکی حالات کے لیے نہیں میرے لیے فکر مند  
 تھا۔" فریا نے بیگ کی زپ بند کر کے آہستگی سے بتایا۔  
 "آجھا۔" حزنہ کے چہرے پر حشم پھیلا۔ "وہ  
 کیسے...؟"  
 "وقاص سمجھتا ہے تم بہت بڑے فراڈیے ہو۔  
 میرے دل کو بڑا لوگ۔"  
 "اسے بتا دینا تھا۔ میں آل بیڈی یہ کام کر چکا  
 ہوں۔" وہ مسکرایا۔







ہے۔  
"تناغلاہ کرتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا۔ ان کا اپنا پوائنٹ آف ویو ہے۔" حمزہ نے ہنسنے پر کی سورج پوچھا کہ بعد کتنا شروع کیا۔

"لیکن شعور اور میچورٹی عمر کے محتاج نہیں ہوتے جیسے علم و گمراہی منع کرنے سے نہیں ملتا۔ میں نے ایسے ایسے فصیح و بلیغ گفتگو کرنے والے لوگ دیکھے ہیں۔ جنہوں نے کسی درس گاہ سے کوئی بھی سبق نہیں لیا اور ان جیسا عالم فاضل یونیورسٹی آف امریکہ کا فارغ التحصیل بھی نہیں ہوگا اور وہی شعور آگئی اور اور اک کی بات تو ذہن کی ایک خاص کھڑکی کھلنے کی دیر ہوتی ہے۔ بغض لوگ لڑکھن میں جوان اور جوانی میں بوڑھے ہو جاتے ہیں جیسے کہ میں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں چالیس سال کا سفر طے کر چکا ہوں۔"

وہ فریاد کے چہرے پر نظر جمائے کھڑا تھا اور فریاد دم بخود تھی۔ وہ ایسا ہی تھا بل میں حیران کرنے والا۔

"زندگی کے اسباق بڑھتی عمر نہیں بھانگی وہ لڑتی گھڑی کی سوئیاں نہیں بلکہ حالات بہت اونچی طرح سے بڑھاتے ہیں۔ کھلتے ہیں۔ زندگی جینے کا ہنر کسی کسی کو آتا ہے۔ کم از کم مجھے اور میرے باپ کو تو بھی نہیں آیا۔ جنہوں نے یہ ہنر لایا، وہ دوسروں کے خوابوں کو پتھروں سے روند کر زندگی کی دوڑ میں بہت آگے نکل گئے اور پیچھے رہ گئے۔ میرے باپ جیسے لوگ جو ایک تیز رفتار معاشرے میں محنت اور مشقت کی چٹنی میں مینے کے بعد بھی کئی صدیاں پیچھے تھے۔ یہ ناخیرت کی بات۔"

"حمزہ! تم کیا ہو؟ میں کبھی بھی تمہیں سمجھ نہیں سکی اور لگتا ہے کبھی سمجھ نہیں پاؤں گی۔" وہ سچ سچ سخت حیران تھی۔

"میں ریشم کا ایسا دھکا ہوں جسے جتنا سلجھاؤ گی اتنا ہی اچھے گا۔" حمزہ حیرت سے مسکرایا۔

"اچھا یہ بتاؤ۔ تم نے ناک کیا جواب دیا ہے۔"  
"انکار۔ میں نے انکار کر دیا ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "مجھ پر انکشاف کیا گیا ہے کہ"

وفاقیوں سے میری بات کافی عرصے سے غلط ہے ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟"  
"وہی ایک لحاظ سے یہ پر پول تمہارے لیے بیسٹ ہے۔"

"حمزہ! خبردار جو فضول باتنے کی کوشش کی۔" اس نے وار ٹنک کی تھی۔

"تناغلاہ ہی کہتی ہیں۔" حمزہ نے تاسف سے کہا۔  
"تم ہلاکی جذباتی اور امپور ہو۔" وہ بخیرہ تھا۔

"اور تم خود کیا ہو؟" فریاد نے تنگ کر پوچھا۔  
"مجھے تم اتنی آسانی سے سمجھ نہیں پاؤ گی۔" وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ میں نے تم سے محبت کیوں کی؟"

"سوچنے کے لیے اچھا ناک و صوفی اے کافی بستر وقت گزر جاتا ہو گا۔" وہ پھولوں کی باڑ سے ایک پھول توڑ لیا تھا۔

"تنتے بارے پھول کو کیوں شلخ سے توڑا ہے۔"

فریاد نے تاسف سے کہا۔ "اپنے مقام سے جہت کہ تھا اور اوپر اٹھنے لگا ہے۔ پھول ہمیشہ شاخوں پر ہی اچھے لگتے ہیں۔" فریاد کو تو گلہ دل میں تازہ پھول سجانا بھی ناپسند تھا۔

"فلا سرف صاحبہ! آئی ایم سوری آسٹریڈ یہ سناؤ عظیم نہیں کروں گا۔" حمزہ نے اس کے دونوں کانوں کو پکڑ لیا۔

"شس اوکے ہم نے تمہیں معاف کیا۔" وہ شان سے بتاؤ کی سے بولی۔

"میں نے طرف کو ہمیشہ اسی طرح وسیع رکھیے گا۔"

قرائنش کی گئی تھی۔ فریاد نے آگئیں پھیلا کر استفسار سے نظروں سے دیکھا۔

"میری غلطیوں پر درگزر کرتی رہنا۔" اس نے وضاحت کی۔

"غلطی کرو گے تو معاف کروں گی۔ غلطیاں دہراؤ گے تو کبھی معاف نہیں کروں گی۔" اس نے وار ٹنک دی تھی۔

"تم بہت سناؤ اور معصوم ہو فریاد۔"  
"اور تم مجھے کافی چالاک لگتے ہو۔" فریاد نے تہمت لگایا۔ حمزہ بھی مسکرایا تھا۔

"کبھی کبھی میں حیرانی سے سوچتا ہوں۔ میں اس بیخبر پیشہ تھا جب تم نے پہلی دفعہ مجھے دکھا تھا اور پھر کئی عرصوں اور بھی بہت سے لوگوں کی طرح مجھے نظر انداز کر کے پاس سے گزر جاتیں تو ہم دونوں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آسکتے تھے۔" وہ دونوں اپنی کالوں کی روڈ پر آئے تھے۔

"مگر میں تمہیں کیوں نا! مجھے تو اسی سوڈ پر ٹھہرنا تھا۔" رکنا تھا۔ "وہ خود بھی شاید پہلی ملاقات کو سوچنے لگی تھی۔"

"فریاد میں معتریب ناسے فاضل بات کرنے والا ہوں۔" حمزہ کے چہرے پر ایک دم کئی تاثرات ابھر آئے تھے۔

"تم جلدی؟ نہیں حالت! ابھی نہیں۔" وہ گویا چیخ پڑی۔

"میرے پاس وقت کم ہے فریاد مجھے ان ہی دنوں میں ناسے بات کرنا ہوگی۔ آئندہ کالاکر عمل پیرا کرنا ہو گا۔" اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔ فریاد ہنسنے ہی سن پائی۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" وہ ٹنک کر پوچھ رہی تھی۔  
"ابنی اہمال تو تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ تم کافی بناؤ گی۔ میں بنگلہ جی اور نتا پینے کی سعادت حاصل کریں گے۔" وہ بات کو بدل گیا تھا۔ فریاد نے اس کا بازو پکڑ کر جھوڑا والا۔

"ابھی تم نے کیا کہا ہے حمزہ! تم کہاں جانے کی بات کر رہے ہو؟"

"میں بھلا کہاں جاؤں گا فریاد! یہ کیا بچپنا ہے۔" وہ فریاد سے اپنا بازو پھیر کر بولا۔

"بھگلوڑے! تم بھاگنا چاہتے ہو۔" وہ ایک دم چپ گئی۔

"تم سے بھاگ کر کہاں جاؤں گا بھلا۔" حمزہ ادا سی سے مسکرایا۔

"جانی! تم مجھے سنا نہیں سکتے۔" وہ ابھی تک شاکر تھی۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ حمزہ نے نہیں جانے کی بات کی ہے۔

"باپ! رستے ابنی اہمال تو میرا بازو چھوڑو مجھے پارک جانا ہے۔" ہائے میرے بیٹے! "مسززدانی کے گیٹ پر نگاہ کیا رہی تھی۔ وہ بازو چھوڑا کر سرٹ بھاگا۔

"تمہارے نہیں مسززدانی کے بیٹے! فریاد وضاحت کرنا نہیں بھولی تھی۔ "عاسے! تمہاری کافی۔" وہ چلا رہی تھی۔

"ادھار رہی۔" وہ بغیر پلٹے بولا تھا۔

"تم بھی ناچھو حمزہ! پتا نہیں کیا ہے۔" میں تمہیں شاید کبھی بھی نہیں سمجھوں گی۔" فریاد سر جھکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بنگلہ جی! فریاد کو ذرا باہر بھیجئے۔"

وہ گیٹ کا ذرا اسپاٹ کھولے جھانکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ بنگلہ جی درختوں پر سے تازہ فصل اتار رہے تھے۔

اتھ میں پکڑی تو گری تھاس پر رکھے سہلاتے ہوئے اندر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ جو کروز کے بیچتر ٹھرت پینے اندر سے آئی دکھائی دی تھی۔ وہ اشارہ کو گھسیتا ہوا سرگ پر چلے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی اس کے برابر چل رہی تھی۔

"کامیس جا رہی ہو۔؟"

"ہاں! مارکیٹ تک۔" وہ اپنا والٹ کھولے پیسے چیک کر رہی تھی۔

"اگر کچھ ننگو لانا تھا تو مجھے بتا دیتیں۔ میں ابھی مارکیٹ سے آیا ہوں۔"

"تم نے سودا ڈھونے کے علاوہ گورنس والے کام بھی شروع کر لیے ہیں۔ اس لیے میں کیا دیکھ رہی ہوں۔" وہ اشارہ کو دیکھ کر جوئی تھی۔ پھر جھک کر بیچے کو دیکھنے کے بعد کافی ناگاری سے بولی۔

"میں ایسا چپ کام نہیں کر سکتا اور کبھی تمہاری خاطر میں کیا کیا کر رہا ہوں۔" وہ پہلے سے ہی کافی جلا بھنا



تھا۔ فریاد کے جھانسنے پر اسے جب چہرہ دکھائی تھی۔  
"میرے خاطر چہرہ کسی کلبے، خد متیں کسی اور کی  
ہو رہی ہیں۔ اور احسانِ عظیم مجھ پر۔" وہ بھی بری طرح  
سے چرتکی۔ "اسے کیوں اٹھا کر لائے ہو۔"

"اس معصوم کی گورنرس چھٹی پر ہے۔ بے چارہ پارہ  
آنے کے لیے ہمک رہا تھا۔ مجھے خفا تھا وہ ترس آیا۔"  
وہ منہ کے زانے بگاڑے کمر رہا تھا۔ جب بچے نے  
ایک دم چہرہ گرونا شروع کر دیا۔  
"اٹھ مزہ! اسے چپا تو اردو۔" پچھو دھیرے دھیر  
والیوم بلند کر رہا تھا۔

"ارے چپ کر جا پارہ!" حمزہ گھوم کر بچے کے  
سائے آیا۔ "چپ کر جا، قلم زور افرقی نیکے۔"  
وہ سوکھے سڑے سے کالے چہرے والے بچے کو  
پکارتے ہوئے بولا۔ بچے نے اور بھی بھلا بھلا  
کر کے روٹا شروع کر دیا تھا۔  
"مائی گڈ فری! یہ تو چپ نہیں کر پارہ۔" حمزہ بچے کے  
مسلل روٹنے پر بری طرح سے بو کھلا آیا۔

"اس کے منہ میں فیڈر ڈالو۔" فری بھی گھنٹوں  
کے بل جھٹک کر بچے کے منہ کی وجہ دریافت کرنے  
کی کوشش میں لگ گئی۔  
"افرقی چانڈ! فیڈر تو پی لے پارہ۔" وہ زبردستی  
دودھ کی بوتل بچے کے منہ میں ٹھونس رہا تھا۔ "کھول  
منہ لگاؤں گا دو چھاپڑوں میں کہہ رہا ہوں۔ کھول منہ  
کو۔"

"حمزہ! ایڈٹ! بچے کو دودھ کی طلب نہیں۔  
زبردستی مت کرو۔" فری نے گویا اپنا ماتھا پیٹ لیا تھا۔  
"مائی لوگے یا چاکلیٹ؟" وہ اپنی جینز کی  
ٹیبلیں ٹٹو لگا تھا۔ "کھال ہے یا راتیرے لیے تو نہ  
چاکلیٹ لنگر ہے نہ ٹوٹی۔"  
"اسٹوڈیو! ٹالی اور چاکلیٹ نہیں کھا سکتا۔" فری  
کو بری طرح ہسی آگئی تھی۔ اسی بل ایک خاتون کے  
قریب سے گزری تھیں۔ بچے کے ساتھ انھیں پانگان  
ہو گیا کچھ کرک لکٹیں۔  
"آج کل کی لڑکیوں کے کمال نخرے ہیں۔ بچہ رو رہا

ہے اور ماں کو ہر دہائی نہیں ہے۔"  
"میرے بچے۔" فری حیران ہی تو رہ گئی۔ "میرے  
لے نہیں لائے پاپ کے لیے رو رہا ہے۔" فری کو  
بو کھلاتے ہوئے یہی ہوا تو سو بچا تھا۔ وہ شاید اسے بچے  
کی ماں سمجھ رہی تھیں۔

"اٹھ! یہ کیسا زانہ! آیا پاپ سات فٹ دور کھڑا  
ہے گویا اس نے بچے کو اٹھالیا تو وہ ساتھ ہی چپک  
جائے گا۔"  
"میں نہیں اسے اٹھا سکتا۔ ٹانگ بہہ رہی ہے اس  
کی۔ کہاں شخص گیا ہوں میں" اس جڑیا گھر میں۔ "حمزہ  
نے گویا اپنے بال تو بچ لے گئے۔" مجھے گورنرس سمجھ لیا  
ہے" اس میڈم کی بچی نے۔ بس آج سے میرے صبر کی  
انتہا ہوئی۔ کرنا ہوں اس پھول دیوی سے دو ٹوک بات۔  
عد ہوتی ہے ہر چیز کی۔"

"اس سے کیا ہوا" یہ تو چپ کر گیا ہے فری! پچھو  
خاموش ہو چکا تھا۔ حمزہ نے ماوے مسرت کے بچے کو  
سیدھا کر کے دیکھا۔

"ارے نہ تو بچ بچ گیا ہے۔"  
"اسے میڈم آ رہی تھی۔ جب اتنی بے چین تھا۔ چو  
گھر چلے ہیں۔" فری پلٹنے لگی تھی۔  
"تمہیں مارکٹ نہیں جانا؟" وہ تذبذب کا شکار  
تھا۔

"پھر سسی! پچھو آپ میٹ رہے گا۔ اسے بستری  
ضرورت ہے۔"

"وہ اسٹار گھسیٹ رہی تھی۔ حمزہ نے پینا اٹھا رکھا  
تھا۔ وہ دونوں اپنی ہی تھونک میں یا تیں کرتے آرہے  
تھے۔ مسز زوالی گیٹ پر کھڑی تھیں۔ فری انہیں دیکھ کر  
ٹھٹک گئی۔ وہ بھی معنی تیزی سے مسکراتے ہوئے فری  
کو دھور دیکھنے لگی تھیں۔

"پکڑیں اپنے افرقی شہزادے کو۔ بڑا ہو کر ایک  
عظیم ماڈل بنے گا۔ اس کے چہرے کی لگ ہی کچھ ایسی  
ہے۔ راہ چلے فقیر تک ٹھٹک جاتے ہیں۔" حمزہ بچے کو  
احساسات سے مسز زوالی کی گود میں منتقل کر چکا تھا۔  
"تم سے تو بعد میں غصی ہوں۔ ذرا فریاسے دودھ

ہاتھ کر لوں۔" وہ بڑی بے تکلفی سے حمزہ کے سر پر  
چپٹ لگا کر کہہ رہی تھیں۔ فری کو یہ بے تکلفی کچھ  
بھائی نہیں تھی۔

"تم بھی قسم تو دینی ڈالو۔ کبھی ہمارے گھر نہیں  
آئیں یہ حالات نرمانا ہے۔ اس نے بھی تمہیں جانے یا  
بچ پر نہیں بلایا۔ خود تو دن میں دس دس مرتبہ ہمارے  
گھر سے کھانی کر آتا ہے۔" وہ بری محبت سے اصرار  
کر رہی تھیں۔

"طلو! آئی! پھر سسی۔ ابھی مجھے کام ہے۔" وہ ٹال  
گئی تھی۔ ویسے بھی تنا کے علم میں لائے بغیر وہ کہیں  
آئی جاتی نہیں تھی۔

"میڈم! نہ اصرار کریں۔ اسے واقعی کچھ کام  
ہے۔" حمزہ کی آنکھیں شہزادے سے چپک رہی  
تھیں۔

"تم آوارہ گرد! کہاں بچے کو لے کر چلے گئے تھے  
اس کے سونے کا نام تھا۔" مسز زوالی نے حمزہ کو بری  
طرح جھڑوا ڈالا۔ ان کا یہ لٹا لٹا ہوا فری کو حیران کر گیا تھا۔  
اب وہ حمزہ کو دست خست لگنے میں سناے جا رہی تھیں۔  
فری کابل حمزہ کی جی حالت پر بھرا آیا۔

"میرا بگ ان کے مزاج سمجھنا بھی کہاں آسان  
ہے۔" گھر آ کر بھی وہ کئی گئے کلسپی رہی تھی۔  
"نجانے اور کتنی دیر اسے باتیں سنائی رہیں گی۔ کیا  
ضرورت تھی اسے بچے کو بغیر پتائے باہر لے کر جانے  
کی۔" وہ محض سوچ کر رہ گئی۔



پچھلے دو دن سے حمزہ صاحب تھا۔ اب تو بنگالی می اور  
ننا کو بھی تشویش ہو چکی تھی۔  
"حمزہ کی خبر تو لو بے چارہ پر ویسی تباہی پھرا خدا نخواست  
بیمار نہ بڑا گیا ہو۔" اس وقت وہ حمزہ کے لیے بریشان  
ہو رہی تھیں اور پینڈو دن پہلے ہی حمزہ انہیں سخت برا  
لگنے لگا تھا۔

"نجانے یہ خانساں کہاں سے اٹھ کر آیا ہے۔  
میری نواسی بھی سدا کی اتھی ہے۔ بھلا عمر بھر کے نیلے

جھٹ پٹ کیے جاتے ہیں۔ بغیر سوچ و پیمانہ کے میں  
ہرگز تمہاری شادی حمزہ سے نہیں کر سکتی۔" وہ سخت  
جھال میں تھیں۔

"اور میں بھی آپ کو تباہ چکی ہوں کہ شادی کر سکی  
تو صرف حمزہ سے۔ ورنہ تمام عمر بونہی بیٹھی رہوں گی۔"  
نجانے کس فلم کے ڈائلاگ تھے جو مارے جذبات  
کے فریاد کے لبوں سے برآمد ہوئے۔

"تمہاری ماں اور ماں نے بھی یہی کیا تھا۔ تم سے  
ابھی امید کیا رکھوں۔" فری جان لگی تھی۔ ننا  
ہر شام اند ہیں۔ صرف انہیں کچھ خدشات تھے۔ حمزہ  
کے فیوج کے بارے میں پریشان تھیں۔ وہ فری کو کیسے  
سمجھائیں کہ بے شک حمزہ میں بہت سی خوبیاں تھیں۔  
وہ سمجھ دار تھا، ہاشور تھا، بااخلاق تھا، مگر شادی جیسے  
حساس اور نازک معاملات میں اور بھی بہت سی چیزوں  
کو دیکھا جاتا ہے۔

نرم سے نرم الفاظ میں بھی ان کے لیے یہ بہت  
تکلیف دہ بات تھی کہ ان کی نواسی ایک خانساں سے  
بگڑ کر گئی ہے۔ اس سے شادی کی خواہش مند ہے۔  
وہ دو عمر میں بھی اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا تھا۔ کیا وہ  
شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل تھا؟  
وہ ان حقیقتوں سے فری کو بھی روشناس کروا چکی  
تھیں۔

"میں جاب کر لوں گی۔" گھوڑا اس نے سب کچھ  
طے کر رکھا تھا۔

"پھر بھی میں حمزہ کو چار پانچ سال کا وقت دوں گی۔ وہ  
اپنے قدم ہائے خود کو سنا کر ہمارے سامنے آئے۔ پھر  
میں بخوشی تمہیں حمزہ کے ساتھ رخصت کر دوں گی۔"  
وہ جان چکی تھیں کہ فری اپنے قدم چھپے کبھی نہیں  
پٹائے گی۔ وہ ضدی تھی اور اپنی ضد پیشہ سوا کر دم لیتی  
تھی۔

وہ ننا سے پوچھ کر مسز زوالی کی طرف آئی تھی۔  
اور گرد کے لوگوں سے ان کی جان پوچھان نہ ہونے کے  
برابر تھی۔ تاہم مسز زوالی کی ننا سے خاصی علیک ملیک  
ہوئی تھی۔



چوکیہ ارنے اسے دیکھتے ساتھ ہی گریٹ کھول دیا تھا۔

”نچلے تہڑے کہاں ہوگا۔ یقیناً ”پگن میں۔“ وہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تھی۔ سامنے ایک ملازمہ اسی بچے کو شاید یہ ہلک کھلا رہی تھی۔

”طولی باجی کہاں ہیں؟“ فریاضے اسی ملازمہ سے پوچھا۔

”جی آپ کون؟“ ملازمہ اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

”میں فریاضے ہوں۔ یہ سامنے ہمارا گھر ہے۔“ وہ ادھر گرد پھیلی بے ترتیبی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ بچوں نے ہر چیز لپٹ کر رکھی تھی۔ اتنے ملازم تھے اور پھر بھی نفاست کا نام و نشان نہیں تھا۔

”اچھا۔ اچھا۔ تو آپ فریاضی ہیں۔ تہڑے بھائی جان کی دوست۔“ ملازمہ نے بے ساختہ خوشی کا اظہار کیا۔

”تہڑے کہاں ہوگا؟“

”ان کی تو طبیعت رات سے خراب ہے۔ گلا دکھ رہا ہے۔ بخار ہے۔“ ادھر ادھاری میں پہلا کمرہ انہی کا ہے۔

”یکم صاحب بھی انہی کے کمرے میں ہیں۔“ ملازمہ نے ہاتھ کے اشارے سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

فریاضے سنبھل کر چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ چوہٹ کھلا تھا۔

”توبہ باجی! خدا را! یہ ظلمت کیجیے۔ میں یہ انڈے کی زردی والا دوپہ نہیں بی سکتا۔“

”تہڑے یہ درد تم کو پونہ ہی ہو گا۔ ٹھنڈ کا اثر ہے۔“ منٹوں میں بھلے چٹکے ہو جاؤ گے۔“

طولی بیوے نے لاڈ سے پچکار دی تھیں ایک خانساں کو اپنے گھر کی ملازمہ کو۔ فریاضے کو یاد بخورہ تھی۔

”ہائے کتنی بری اسمیل ہے۔ مجھے تو وہ سنسک ہوئے لگی ہے۔“ تہڑے ناک دینے کہہ رہا تھا۔ اس کا گلا واقعی خراب تھا۔ آواز بے حد بھاری تھی۔ باجی نے زبردستی گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔

”تہڑے کی طرح تہڑے صحت دکھاؤ۔ کیا تیسرا امینہ

لگا ہے۔“ تہڑے کو زور کا اچھو لگ گیا تھا۔ وہ کھائے کھائے دو ہرا ہو گیا۔

”یہ کام آپ کو مبارک ہو۔ توبہ توبہ۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ ”حاضر بھائی نے اور آپ نے جو فٹ بال کی ٹیم بنائی ہے نا! ریکارڈ بک میں آپ دونوں کا نام دے دیں گا۔“ ٹیٹ گراگاس رکھنے لگیں

دروازے میں کھڑی فریاضے کو بولے کر حیران رہ گئیں۔

”توبہ نصیب! آج تو فریاضے آئی ہے۔ آؤ تاڑک کھول لگیں۔“ وہ لبوں پر مسکان سجائے لپک چھپک اس تک آئی تھیں۔

”تہڑے کے لیے آئی ہوگی۔ ہم اتنے اہم کہاں؟ ان کے لب دلچسپی میں شوخی نمایاں تھی۔ جبکہ تہڑے بھی حق و قے سے دیکھے جا رہا تھا۔ گویا اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ فریاضے سب زبانی کہہ رہی آسکتی ہے۔

”فریاضے! تم؟ تہڑے کو کوچ بچ جھکا گا۔“

”کیا میں یہاں نہیں آسکتی۔ مسٹر شیفت کی عیادت کرنے۔“ وہ چہا چہا کر بول رہی تھی۔

”کون ہو تم تہڑے؟“ وہ تمہارے؟“ بھی سچ پر بیٹھے رو رہے ہوئے ہو۔ کئی خانساں بن کر سامنے آتے ہو۔ کئی ڈرائیو ر کاروب دھار لیتے ہو۔ کئی بیورٹے دکھائی دیتے ہو۔ اور کئی بچوں کی آیا گیری کرتے لگتے ہو۔ اتنے ڈھونگ رچا رچا کر سامنے کیوں آتے ہو؟ آخر تم کون ہو؟ کیا کرنے آتے ہو یہاں؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟ کون سا منصوبہ بنا رکھا ہے تم نے؟ کیوں بھوت بولا؟ کیوں غلط بیان جاری کرتے رہے کہ میں تمہا ہوں۔ معمولی سا مزدور ہوں۔ تم کون ہو تہڑے! بتاؤ! تم کون ہو؟“

وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔

”میں کون ہوں؟ ایک بیس سال کا گھگ مریہ۔ محمد تہڑے کون ہے؟ یہ تم اپنے مٹی اور ڈیڈی سے پوچھ لیتا۔ تیسرے سوال کا تیسرا اور آخری جواب۔“ وہ لہجہ بھر کو رکھا تھا۔ پھر اپنے کمرے سے اس کے دونوں ہاتھ چھڑوا کر بولا۔ ”کیا لینے آیا ہوں؟ میں سمندری اور سرحدوں کو پار کر کے کیوں آیا ہوں۔“ وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں

ہاتھوں میں لے کر سلگتے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تمہارا دل لینے کے لیے آیا ہوں۔ ورنہ میرے لیے یہاں آخر رہا ہی کیا ہے۔ ایک مری ہوئی داوی کی تربت کے سوا۔“ اس کے لبوں سے انگارے پھوٹ رہے تھے۔ آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”یہ دل میں نے لے لیا۔ اسے اپنی ذات کی قبر میں مقید کر لیا۔ ہوش کے لیے اس ”تہڑے“ سے رہائی فریاضے کے دل کو نہیں ملے گی۔ کبھی نہیں۔ میں آج رات کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ تمہاری آنکھوں کے لہجے سے خواب جائیں گے۔“

”تہڑے!“ فریاضے قدموں کے پیچھے سے گویا زمین سرگ گئی تھی۔ سامنے کھڑا یہ لڑکا وہ محمد تہڑے تو نہیں نظر آ رہا تھا جسے فریاضے جانتی تھی۔

”کوئی سوال مت کرنا۔ تمہیں مجھ سے ایک جواب بھی نہیں ملے گا۔ یہ سوال اپنے باپ سے کرنا۔ اپنی ماں سے کرنا۔ محمد تہڑے کون ہے؟“

وہ اسے جس وقت کھڑا پھوڑ کر باہر نکل گیا تھا جبکہ فریاضے ابھی تک دم بھوڑھتی تھی۔ سائیکل کے ٹیڑھے خاصا موٹے اور حیران۔ تہڑے جس خاصا موٹے سے آیا تھا اسے ہی چلا بھی گیا۔

کئی دن کے بعد اسے مسز زبانی سے بات کرنے کا خیال آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ ان کے گھر پہنچ گئی تھی۔

مسز زبانی کے کچن میں نیا خانساں کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں فریاضے کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”فریاضے! وہ اسے دیکھ کر ٹھنک گئیں۔“ ”توبہ! رک کیوں گئیں۔“ ان کے لمبے میں محسوس کی جانے والی تیزی تھی۔

”میں شیفت ہے کیا؟“ اس نے لب کھینچتے ہوئے کھینچنے کا آغاز کیا۔

”اور بے کاموں کے لیے رکھا ہے، مگر اسے کھانا پکانا بھی آتا ہے۔ میرا مسئلہ حل ہو گیا۔“ وہ سادگی سے بتانے لگیں۔

”تہڑے کے جانے کے بعد آپ کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔“ وہ جو کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی اس کے لیے ہمت بھی تو جمع کرنا تھی۔

”تو اور کیا بچے بھی کتنے دن ڈسٹرب رہے ہیں۔ تہڑے سے بہت الہجہ ہو گئے تھے۔ مجھے تو بالکل اپنے بڑے بیٹے اور مسلمان کی طرح عزیز ہو گیا تھا۔“ وہ تہڑے کو یاد کر کے آب دیدہ ہو گئیں۔ ”انتا ہنس کھ اور تنخویا تھا۔“

”طولی باجی! آپ جانتی تھیں کہ تہڑے کون ہے؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔

”بچ پوچھو تو میں اسے پہلی دفعہ دیکھ کر ٹھنک گئی۔ اتنا تو تم جانتی ہو کہ حاند ملک سے باہر ہوتے ہیں۔ نو بچوں کے ساتھ اتنے بڑے گھر کی دیکھ رکھ میری اکیلی جان سے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ میں سخت پریشان تھی۔

حاند سے مشورہ کیا تو انہوں نے اخبار میں اشتہار دینے کی تجویز دی۔ مجھے کسی پھر تیلے لڑکے کی ضرورت تھی، جو بچن کے ساتھ ساتھ سووا سلف بھی لے آیا کرنا۔ مجھے تہڑے ہر لحاظ سے پسند آ گیا۔ شائستہ مزاج، سلجھا ہوا، رکھ رکھاؤ والا لڑکا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ ملک میں بے روزگاری کی وجہ سے یہ اتنے خاصے گھرانے کا لڑکا

تیسرے درجے کی نوکری پر بھی رضامند ہے۔ مگر اس کی ڈیمانڈ سن کر میں حیران ہی تو رہ گئی تھی۔ اس نے کہا مجھے ماہانہ تنخواہ آپ جو بھی ویں منظور ہے، مگر مجھے آپ کے گھر میں رہنے کے لیے کمرے کی ضرورت ہوگی۔ بیشرکی سرزبوں میں خاص ضرورت نہیں۔ البتہ گریوں میں اسے کسی میں ضرور چلاؤں گا۔ خوراک میری سادہ سی ہے۔ البتہ کافی کامیں نشستی ہوں۔ دن میں کئی کئی دفعہ پیتا ہوں۔ کبھی کبھی رات کو بھی پیتا ہوں۔ میں ڈرائیو تک بھی کر لیتا ہوں۔ بچوں کو پک ایڈ ڈراب کی ذمہ داری میری ہوئی۔ مارکیٹ سے سووا سلف بھی لایا کروں گا۔ آپ کے ڈرائیو کی تنخواہ بھی بچ گئی۔ نیوٹر کو بھی چھٹی کرادیں۔ بچوں کو رات کے تین گھنٹے پڑھا دیا کروں گا۔“

میں اس کی ڈیمانڈ سن کر حیران رہ گئی تھی۔ حاند سے



مشورہ کیا تو وہ مان گئے۔ وہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں سنبھال چکا تھا۔ البتہ اسے شیفٹ دینا تے فریڈی کو بتانا؛ لہذا وہ اسے کھانا پکانا سکھا کر ہی گئی تھی۔ جبکہ پین کے کاموں سے وہ شدید الرجک تھا۔ اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی بڑی بڑی اور گری بائیں وہ کرتا تھا۔ بہر حال مجھے تو اپنے کھر کے ہر ملازم سے انسیت تھی اور حمزہ سے تو خاص انسیت ہو گئی تھی۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ اور وہ خوب کامیابیاں سنبھالے۔ ایک برس لڑکا دو سال تک میرے کھر شیفت کے علاوہ دیگر امور حسن طریقے سے سنبھالے رہا ہے جس لیے؟ کیوں؟ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ ہر فریڈی مشورہ بندہ سوچے گا تو ضرور۔ میں بھی سوچتی رہی تھی۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا۔ وجہ تو تم ہو فریڈی! تم اس لیے وہ خود کو بے کار کے ان مشغلوں میں ضائع کر رہا تھا۔ بہر حال میں اس کے بارے میں بس یہی کچھ جانتی ہوں۔

طولی بائی خاموش ہو گئی تھیں۔ فریڈی کی ابھی بہت ساری اپجینیں اور نہیں ہوتی تھیں۔ وہ کھرائی تو نانا کو اپنا کھنکھایا۔ وہ کافی ہوش نظر آ رہی تھیں۔

”تمہارے میڈی فریڈی آرہے ہیں فریڈی! وہی بھی آئے گی۔ ابھی وقاص کا فون آیا تھا۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ خاص مقصد کے لیے آرہے ہیں۔“ ان کے چہرے پر واضح خوشی تحریر تھی۔ حمزہ کے پلے جانے کی سب سے زیادہ خوشی نانا اور وقاص کو ہی تو ہوئی تھی۔

”کیسا مقصد؟“ اس نے تنک کر پوچھا۔

”تمہاری ماں نے وقاص کے ساتھ تمہاری بات کہی کر دی ہے۔“ نانا نے گویا حکم کیا۔

”مگر مجھے وقاص تو کیا کسی سے بھی شادی نہیں کرنی۔ بتا چکی ہوں آپ کو۔“ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔

نانا اور پھوپھو کے ساتھ میڈی فریڈی بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے۔ مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

گزرے وقت میں وقاص کی دھوم دھام سے شادی ہو گئی تھی۔

وقاص کی شادی مکے لیے میڈی فریڈی بھی آئے تھے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی۔ جب میڈی اور فریڈی دونوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ حمزہ نام کے کسی لڑکے کو جانتے تک نہیں۔ فریڈی اور بھی الجھتی گئی تھی۔

”تم فریڈی سے ہی پوچھ لو۔ پچھلے نام کا پتہ تھا۔ سعادت مند نیک اور شریف۔“ نانا اس سے زیادہ اچھی تعریف اور کیا کرتیں۔ کم از کم جینی کو تو کسی کی پسند کے متعلق تفصیلات بتانے کی ان میں جرأت نہیں تھی۔

”مگر آیا ہے؟“ میڈی کی توپوں کا رخ اب فریڈی کی طرف تھا۔

”ہو کے چلا گیا ہے۔“

”پچھلے کیا کرتا تھا؟ کیا ایجوکیشن ہے اس کی؟ کس فیملی سے ہے؟“ میڈی کی پینوں میں گئی تھیں۔

”بہتر نکالی بی کرتے ہیں یہی کام کرتا تھا۔ مسٹر جنرل تم کیا بتاؤ گی؟“ سب جان گئی ہوں میں اپنی بیٹی کے انتخاب اور پسند کے متعلق۔“ انہوں نے سخت تحفہ کے عالم میں مزہ لیا۔

”میں اپنی چاہتا ہے کہ طے چلے مارا کے اس کا منہ لال کر دوں۔“ فریڈی نے اس پر تامل اتنا پڑھ لکھ کر منہ دیا۔ شیم آن یو فریڈی! ایک خانہ سال سے محبت کر رہی تھیں۔ اپنا مقام دیکھو اور مقابل کے پروفیشن کو مگر تمہارا بھی کیا تصور ہے یہ سب کیا دھرا تو میڈی! آپ کا ہے۔“

میڈی اب ننانا سے دبدبو جھگڑنے لگی تھیں۔ ہمیشہ اسی طرز تو وہ کرتی تھیں۔ جب غصہ آتا تھا سمیت فریڈی کی انسلٹ کر کے رکھ دیتی تھیں۔ بیامان تھا انہیں اپنی ذہانت پر اور دولت۔ نانا بھی اسی بات کا احسان لادے رکھتی تھیں کہ آپ کو گھر لے کر دیا ہے۔ تو کر چاکر آپ کی چاکری کے لیے رکھے ہیں۔ تنخواہ جو تنگ تھی دیتی تھیں۔ گھریلو اخراجات کے لیے بھی میڈی نے بھجوائی تھی۔ سو نانا بے چاری کو وہیل میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیتی تھیں کہ قرآن (فریڈی کے ماموں) کا حق تھا مال کو سپورٹ کرنا۔

میں بیٹی ہو کر ماں کے اخراجات اٹھاتی ہوں۔

”تہمت کی ہے آپ نے میری بیٹی کی۔“ اب وہ جینو جینو کر رہی تھیں۔ تناکے چہرے پر سارے لہرانے لگے تھے۔

”پلیز میڈی! نانا سے اس لیے میں بات مت کریں۔“ فریڈی نے گویا التجائی۔

”تم تو مجھ سے بات ہی مت کرو۔ سخت دل دکھایا ہے تم نے میرا۔“ وہ مشتعل ہو کر اٹھ کھڑی۔ ”دیکھا نانا! آ رہی آپ کا لفظ نہیں کرتیں۔ تو بیٹن ان کی بھی تو آپ نے ہی کی ہے۔“ میڈی کے جانے کے بعد وہ رو تے ہوئے کہہ رہی تھی۔

جانے سے پہلے میڈی کا موڈ بہتر ہو گیا تھا۔

”آزاد رہ سنبھل جائے تو کسی اتھے پر پوزل گواو گے گرو تھیجے گا۔“ وہ ننانا سے بار بار کہہ رہی تھیں۔



پانچ سال گزر گئے تھے۔

وہ محبت کے اسی موڈ پر کھڑی تھی جس موڈ پر وہ اسے اتھے ختم کر کے آیا تھا۔ وہ اس کے دل کے خالی کنگول میں اپنی محبت کے دھنکے اور سالوں میں ڈال کر اسے نار سائیڈوں کے عذاب دے کر چلا گیا تھا۔ فریڈی کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس کی یادوں کے سوا وہ اپنے گھر کے بیرونی لان میں رکھے اس تنگ کو پھول کتنی رہتی تھی جہاں اس نے پہلی مرتبہ حمزہ کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اور وہ نہ جانے کہاں تھا؟ کس دہس میں جا بسا تھا۔ کس گھر کا اس نے رخ کر لیا تھا۔ کس بستی میں بسا کر لیا تھا۔ کس تہذیب پر جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں ڈیرے لگائے تھے۔ مجھ حمزہ نے اور فریڈی نے جہاں ہو کر سوچتی تھی کہ اس دور میں بھی کوئی پہلی نظر کے عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے؟ مگر کچھ اسے چہرے ہوتے ہیں جو متوجہ کر لیتے ہیں۔ تسخیر کر لیتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ خود سے عہد کر کے آیا تھا کہ فریڈی شجاع عشق کا دل چرائے گا۔ اور اس نے پہلی نظر میں اس کا دل چرایا۔

سڑک کے کنارے ہر جگہ گھاس سے بچے پھولنے سے قطعاً میں رکھے پتھر پتھر بیٹھے اس یارین نقوش رکھنے والے روکنے لڑکے نے فریڈی کو متوجہ کیا تھا۔ اور جب وہ اس کے بارے میں جان گئی تب بھی اس کے دل نے مجھ حمزہ کے لیے ہمیشہ محبت محسوس کی تھی۔ یہ جان کر بھی کہ وہ ایک معمولی سا گھریلو ملازم ہے۔ یہ لوگوں کے معاملے سوچ سمجھ کے کہاں ہوتے ہیں۔

مجھ سے بات تو یہ تھی فریڈی نے اس پر وہی کو ہر الزام سے بری کر دیا تھا۔ وہ مجھ کا درجہ رکھتی تھی۔ محبت کا ذائقہ اس کے دل نے پچھا تھا۔ پہل اسی نے کی تھی۔ حمزہ کے قریب وہ خود آئی تھی۔

وہ بد عمد نہیں تھا۔ حمزہ نے اس سے کوئی بیان تو نہیں یاد دہے تھے۔ مگر نہ جانے فریڈی کو کیا نہیں تھا کہ محبت کے مغز میں وہ دونوں ساتھ ساتھ مانتے ہیں۔

وہ جھوٹا بھی نہیں تھا۔ اس نے جتنا کچھ اپنے بارے میں بتایا تھا وہ بالکل سچ تھا۔

اس نے صرف ایک چیز فریڈی سے مخفی رکھی تھی۔ اس نے فریڈی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ پاکستان کسی سے انتقام لینے آیا ہے۔ فریڈی انیس سے انتقام؟ مگر کیوں؟ کس لیے؟

فریڈی نے ایک بہترین سا گھر رکھنے والے اسکول میں جا ب کر لی تھی۔ نانا سے مصروف دیکھ کر بہت خوش تھیں۔ وہ جانتی تھیں ایک دن فریڈی اپنے لیے بہترین فیصلہ کر لے گی۔

ایک اور اس شام میں وہ پیش کی طرح اسی سٹی بیچ پر بیٹھی تھی۔ جب بوسٹ مین گیٹ کے قریب آ کر رکھا۔ وہ اٹھ کر گیٹ پر گئی تو اس نے ایک رجسٹری اس کی طرف بڑھائی۔

فریڈی نے خاکی لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ فارن کی مہر لگی تھی۔ وہ حیران ہی تو رہ گئی۔

”یہ میڈی نے کیا بھیج دیا ہے۔“ وہیں بیچ پر بیٹھے



ہٹے اس نے لہانہ چاک کر کے اندر سے کچھ کاغذات نکالے۔

”جان فری!“ طرہ مخاطب نے ہی اسے چونکا دیا۔

”سبز کاغذ“ اس نے بے صبری سے تحریر پر نظر سرجھا دیا۔

”تمہیں انجنوں کے حوالے کر کے یہاں چلا آیا تھا۔ سچ پوچھو تو ایک دن بھی سکون سے نہیں گزارا۔ تمہاری یاد میں اتنی شدت ہے کہ بدلتے موسم بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

بات کا آغاز کہاں سے کروں، چلو، آج پھر تم میری داستان سنی رہو، میں نے پہلے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ نہ اب بولوں گا۔ سلسلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے لوٹا تھا۔

میں نے تمہیں بتایا تھا تاکہ لیڈی یعنی جس لینے کے لیے آئی تھی اور ہم اس کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں اور میرے ابو۔ یعنی صرف چند دن کی مسماں تھی، ہمارے آنے کے صرف ایک ہفتے بعد لیڈی یعنی اچھا نیک کے ایک سے جا مل گئی تھی۔ یعنی کامیاب شو پر اور بیٹا اس کی آخری رسومات کرنے پہنچ گیا۔ رسومات کا تو صرف برانا تھا۔ دراصل وہ بیٹی کی برابری کے چکر میں آئے تھے۔ ان دنوں نے مجھے اور ابو کو گھر سے بے دخل کر دیا۔ اس مرتبہ پھر ہم کھلے آسمان تلے آگئے تھے۔

ابو مجھے لے بھرے اپنے بھائی کے در پر آگئے تھے۔ ہم بھلا جاتے بھی کہاں۔ فی الحال کوئی بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔

چاچی نے ہمیں دیکھ کر طوفان کھڑا کر دیا۔

”نہو کے نیٹے، خور کے مارے پھر آگئے۔“ وہ بری طرح چلا رہی تھیں۔ ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین چھٹی اور وہ اس میں جا بٹے۔

”اس بابے کی وہ آئیوں کا خرچا کون اٹھائے گا؟“

اس بل حد سے زیادہ جاہل لگ رہی تھیں۔ اور ابو بتاتے تھے چاچی بہت تعظیم یافتہ تھیں۔ چاچا کی ان کے ساتھ لومین تھی۔

”اسے کسی اولیاد یا اس میں کچھ نہ ہو اور خود کسی ہونے میں برتن دھو لویا و آتش روم صاف کر دہاری بنا ہے۔“

چاچی مجھ سے مخاطب تھیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس نہیں تھا کہ ابو چاچا کے بڑے بھائی ہیں۔ ان کے باپ کی جگہ پر ہیں۔

اس وقت صرف ایک احساس باقی تھا، ذلت اور صرف ذلت۔

مگر یہ نہیں پتا تھا کہ اس سے آگے بھی بہت کچھ سنا ہے۔

سارا دن وہ مجھے کو اس کے قتل کی طرح جوتے رکھتی تھیں، پھر بھی فارغ رہنے کے طعنے ملتے تھے۔ نہ جانے کتنی نفرت بھری تھی ان کے دل میں ہمارے لیے۔ یہ نفرت اس وقت کھل کر سامنے آئی جب چاچا نے ابو کی محبت میں اعلان کر دیا کہ وہ میرا رشتہ اپنی بیٹی کے ساتھ بنا کر چکے ہیں۔

چاچی کو کوئی آگ لگ گئی تھی کیونکہ اس دفعہ چاچا نے کچھ جرات کا مظاہرہ کر دیا تھا۔ وہ اس رشتے کو باقاعدہ رسم کے بعد کوئی نام دینا چاہتے تھے۔ کتنی یا کتنی؟ ابو اور چاچا جرات بھرنے لیا کچھ وقت کس کرتے رہے تھے۔

اسی صبح کا قصہ ہے۔ قصہ ہی کہوں گا۔ اس شرمناک داستان کو اور کیا نام دوں۔

چاچی اس دن گھر میں تھیں اور وہ ایک پلاننگ کے تحت گھر میں نظر آ رہی تھیں۔ آٹھ بجے کے قریب گھر میں چاچی کی ایک دوست داخل ہوئی۔ عجیب بات یہ تھی چاچی کی وہ سہیلی سیدھی میرے اور ابو کے مشترکہ کمرے میں چلی گئی۔ میں اس وقت لاؤنج میں تھا۔ بیٹھ میں کچھ فائل تھا جسے ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صرف لمحوں کا کھیل تھا، منظر بدل گیا۔ چاچی کی سہیلی جیتی چلاتی ابو کے کمرے سے برآمد ہوئی۔

آگے کیا لکھوں جب وہ لحوات یاد آتے ہیں، رگوں میں دوڑنا خون اٹھنے لگتا ہے۔

چاچا بھی اتفاقاً گھر آگئے تھے۔ اف میرے خدا! جو

الزام چاچی اور ان کی سہیلی نے میرے باا باپ پر لگایا تھا وہ کس قدر شرمناک تھا، گھٹیا تھا۔

وہ مجھ پر ہستان باندھ دیتیں۔ مجھ پر قسمت نگاہیں مگر انہوں نے ابو کو استعمال کیا اور ابو تو چاچا کی یہ اعتباری کے بدلے کھاؤ سے ہی بڑھے گئے تھے۔

”بھیا تو میرا آپ نے ایسا کیا! انہیں بھیا تو میرا! آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ چاچا کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

”یہ لوگ قابل ہیں اس گھر میں رہنے کے؟ ہمارے مہمانوں کے ساتھ اب ایسی غلیظ حرکتیں کی جائیں گی۔ ارے مرنے کا مقام ہے اس بابے کے لیے اور یہ بے غیرت اس کا بیٹا، ہماری بیٹی کے قابل ہے، وہ تو خود اسے رو جھکٹ کر دے گی۔ پوچھ لو، ابھی اپنی بیٹی سے۔ وہ اس آن بڑھہ جاہل کے ساتھ رشتہ استوار کرنا چاہتی بھی ہے یا نہیں۔ لعنت بھیج دے گی اسے دیکھنے کے بعد۔ بڑے آئے ہماری بیٹی سے رشتہ بچانے والے۔“ چاچی کی زبان ابھی تک ڈھرا گل رہی تھی۔

”شہا ہے! جب کرا اس عورت کو۔ ایسی بد زبان عورت۔“ ابو نے آواز دینا دیتے ہوئے کہا تھا۔

”پلیز بھیا پوچھو! آپ یہاں سے چلے جائیے۔ ہمارے گھر کا محل گدا امت کریں۔“

چاچا نے ہاتھ باندھ کر ابو کو برا کرنا شروع کر دیا۔ اب مزید بچھ اور سننے کی مہو لوں میں سکت کہاں تھی۔ ہم دونوں لٹے لٹے سے گھر سے باہر نکل آئے۔ اس وقت میں نے دو واڑے سے باہر کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ میں چاچی کی بیٹی کا دل جیت کے دکھاؤں گا۔ اس کا دل جیت کر اپنے پاس رکھ لوں گا۔ وہ پھر کسی سے شادی نہیں کرے گی، اس رات میں ابو ابو بے حاشا دوستے رہے۔

”یہ شاہا سے میرا بھائی۔ جب یہ پوکے آیا تو خالی ہاتھ تھا۔ کچھ نہیں تھا اس کے پاس۔ میں نے تین سال تک اپنا قلبیت اسے دیے رکھا۔ خود ایک ہوٹل میں سا تھی دو گھر سے کمرہ شیئر کرنا تھا۔

یہ شاہا ہے، جسے ڈوبار کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میں نے تمام عمر کی پونجی نکال کر اس کے سامنے

رکھ دی، سوچا تھا ایک جیتا اسٹور خرید لوں گا۔ تمہارے لیے کچھ تو سیونگ ہو، مگر وہ کچھ شہا ہے۔ میرا اعتبار نہیں کیا۔ مجھے دو کوڑی کا کر دیا۔“

ابو رو رہے تھے اور وہ اس رات آخری مرتبہ روئے تھے۔

نہ جانے کیا سوچ کر ابو پھوپھی کے گھر چلے آئے تھے۔ پھوپھی نے حتی المقدور ہماری بدارت کی۔ ہمیں رہنے کے لیے اچھا سا کر دیا۔ ابو کے لیے پھوپھی کے دل میں کافی نرمی تھی مگر میرے لیے نہیں۔

ابو اسی رات چپکے سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ پھوپھی کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا۔ میں نے پھوپھی کو بے تماشائے دیکھا تھا۔

ابو کے جانے کے بعد میں کتنا تھکا ہوا گیا تھا۔ اور مجھے میرے اپنوں نے مزید تھکا کر دیا۔ ایک دن پھوپھی کی ایک دوست جو بلندہ آواز میں شاید مجھے مٹانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

”نہ جانے یہ جو میرا بھائی کی اولاد سے یا پھر کسی اور کا خون، ان انگریزوں جو توں کا بھلا کیا پھر سو۔“

یہ ہی الفاظ جو کاشفہ چاچی نے بھی ایک مرتبہ میرے لیے کہے تھے اور شاید چاچا بھی اسی لیے مجھ سے متنفر ہو چکے تھے۔ میرے بارے میں شاید سب ہی مٹھوک ہو گئے تھے۔ یہی حالات تھے جب میں نے پاکستان کا رخ کیا تھا۔ تب میرے دل میں صرف انتقام کا جذبہ تھا۔

میں چاہتا تو تمہیں انہو ابھی کر سکتا تھا۔ تم سے مگن پوائنٹ پر نکال کر لیتا۔ تمہاری ماں کو بچا دکھانے کے لیے کوئی سی بھی گھٹیا ترین حرکت کر سکتا تھا۔ بغیر نکاح کے بھی تمہیں لے کر فرار ہو سکتا تھا۔ تمہیں خود تمہاری نظر سے گرا دیتا۔ تمہیں کریکٹر لیس ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مفید تو صرف یہ تھا کہ سب لوگ، یہ معاشرہ سب چاچی کی طرف انگلی اٹھائیں۔ ان سے نفرت کا اظہار کریں، چاچی بھی ذلت اور رسوائی کا مزہ چکھیں۔

مگر جانتی ہو فری! کس چیز نے میرے شیطانی



ارادوں کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ تمہاری محسوسیت تھی۔ اس محبت نے جو تم مجھ سے کرتی ہو۔ زندگی میں مجھے صرف ایک محبت تو میرا کئی ہے۔ اسے میں خود کیسے اپنے ہاتھ سے دفن کر ڈالتا۔ اگر میں ایسا کر لیتا تو جو میرے اندر ایک اور انسان رہتا ہے وہ مجھے چین سے کبھی نہیں جیتے رہتا۔

میں نے تین عورتوں کو خود پر مہربان دیکھا ہے۔ ایک غلام سہری تم اور تیسری طولی بائی۔

رات بھر میں سوچتا رہا تھا۔ میری طبیعت سخت خراب تھی اور طولی بائی کی گویا جان پر تھی۔ پہلے پہل میں بائی کی فکر سہری پر حیران ہوا تھا۔ اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے سارے ملازمین کے لیے بہت نرم رویہ رکھتی تھیں۔ میرے علاوہ کوئی اور ملازم بیمار ہونا تھا۔ کبھی وہ اس کا خیال رکھتیں۔ اسے آرام کرنے کا موقع دیتیں۔ کئی کئی لوگ مالا مالا چیک اپ کروا تیں۔ پر ہیری خوراک مہیا کرتیں۔

اگر رب نے طولی بائی کو یہ تماشا نواز رکھا تھا۔ لیکن اس نوازش اور رزق کی فراوانی نے ان میں غرور اور تکبر نہیں بکھرا تھا۔ یہ ہماری وہی پرانی سادہ مزاج اور سادہ لوح طولی بائی تھیں۔ میں انہیں جان بوجھ کر توبہ پائی کہہ کر چھیڑتا تھا۔

تم حیران ہو گئی۔ یہ میں نے کیا ذکر چھیڑ دیا ہے۔ چلو تمہیں کئی کچھ تفصیل بتا دیتا ہوں۔

اخبار میں ایڈیٹر نے مجھ کے بعد میں سیدھا اسی پتے پر پہنچا تھا۔ پورے تین مہینے ہو گئے تھے مجھے دلنشیا میں گھر لو ملازم کی نوکری ڈھونڈتے ہوئے۔ میرے پاس رہنے کے لیے ٹھکانہ تک نہیں تھا۔ جب میں جو کچھ تھا وہ ان تین مہینوں میں رہائش اور کھانے پینے کی وجہ سے ختم ہو چکا تھا۔ مجھے دلنشیا کے علاوہ تمہیں اور ملازمت نہیں کرنی تھی۔ یہ تو طے تھا میں نے کس مشکل اور مصیبتوں کے بعد تم لوگوں کا موجود ہونا حاصل کیا تھا۔ یہ صرف میں ہی جانتا ہوں تمہاری می نے آقاؐ کا "ڈیٹس والا گھر" کھرا دیا تھا۔ یہ نیا گھر اس لیے تم لوگوں کو لے کر دیا تھا کہ انہیں شاید میری طرف

بے خطرہ تھا۔ تمہیں ایک جھوٹی کہانی سنا دی کہ تمہارے ماسوں کو رقم کی ضرورت تھی۔ تب ہی یہ شہنشاہی عمل میں لائی گئی ہے۔

لوگ اب صرف قابل بھروسہ لوگوں کو گھر پلو ملازم رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ کسی پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ میری توسعاش کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

میں ہر روز تمہیں آتے جاتے دیکھا کرتا تھا۔ اکثر تم تنہا گھر لے کر پارک آتی تھیں۔ پچھلے تین مہینوں سے سوائے تمہیں دیکھنے کے اور کوئی تیسرا کام نہیں کیا تھا۔ اور اس دیکھنے کو کھانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بل کم چباتی، لا ابالی سی لڑکی کے لیے میرے دل میں کچھ نئے جذبات ابھر آئے۔ میں اس صورت حال پر حیران رہ گیا تھا۔ پچیس سال کے گراب تک تم کھانے اس دل پر نہ جانے کیسے دن و باڑے واردات ہو گئی تھی۔ اس سزا یافتہ مجھے موم بخود کر دیا۔

بہر حال میں اخباریے بریالی ہاؤس پہنچ گیا۔ سید وارچ منڈلنگ نے باہر آئے تو مجھے اندر بلوایا۔ صبح تو یہ تھا کہ بائی نے مجھے ہرگز نہیں پہچانا۔ ہاں میں اس میں پہلی نظر میں پہچان چکا تھا۔

"یہ تو طولی بائی ہیں۔ ہماری والدی، میرے کرتے سیا کرتی تھیں۔ وہ وہاں آج بھی نواز نے پر آئے تو خزانوں کے مت کھول دیتا ہے۔"

میں بائی کی موجودہ رہائش کو دیکھ کر موم بخود تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری ڈیمانڈ من کر سسرز کوئی مجھے باہر کا راستہ دکھا دیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اناٹھ کر لیا گیا۔ میری ڈیمانڈ بھی پوری کر دی گئی۔ طولی بائی کے نرم مزاج کی وجہ سے میں بہت جلد ان سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اور وہ مجھے باقی ملازمین کی نسبت کچھ زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ شاید میرے انگریزی بولنے کی وجہ سے۔ اس میں میرا انگلش کیسے میں بولنا بھی بہت پسند تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے بچوں کو انگریزی بولنا سکھا دوں۔

ایک دن میں نے بائی سے کہا۔ "میریڈم! اگر آپ

باہر نکلیں تو ایک بات پوچھ لوں۔" میں نے ڈرتے ڈرتے اجازت طلب کی تھی۔

"تو پوچھو نا مجھے اجازت کیوں لیتے ہو۔"

"آپ بھائی والی طولی بائی تو نہیں۔" میں نے اپنی الجھن رفع کرنا چاہتی۔

"اور تم کون ہو؟" وہ ٹھنک گئی تھیں۔ مجھے بغور دیکھنے لگی تھیں۔

"میں تمہاری بھائی والا۔"

"اے اے تو جانا ہے۔ مائی رحیمہاں کا واکہ ماشاء اللہ اتنا بڑا ہو گیا۔ میں نے پہچانا ہی نہیں۔" میری توجیح کے پر خلاف وہ بے استعاوض ہوئی تھیں۔ میرا تو خیال تھا وہ مجھے پہچانتی تھیں۔ انکار کر دیں گی۔

"تو کئی کر رہا ہے۔ اپنے ابو کے ساتھ باہر نہیں چلا گیا تھا تو؟" وہ حیران تھیں اور اپنی حریت دور کرنا چاہتی تھیں۔ میری رام کہانی سننے کے بعد انہوں نے اپنے بارے میں بتایا۔

"تو جانتا ہے نا، میری ماں ورنہ تھی۔ یہ وہ عورت تھی۔ ہمارے تمہارے حالات ایک جیسے تھے۔ حالانکہ تمہارے چچا اور ابو دونوں یورپ میں تھے اس کے باوجود مجھے بیرونی ہاؤس والوں کے کپڑے میری ماں ہی سیا کرتی تھی۔ ماں کے بعد یہ کام میں نے سنبھال لیا۔ بڑی بیگم (حادی کی والدہ) بڑی نیک خاتون تھیں۔ میں ان کے کپڑے ہی کر کو کئی پہنچا آیا کرتی تھی۔ حاد صاحب نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ شاید اس لیے کہ اللہ نے مغربت کے باوجود حسن سے نواز رکھا تھا مجھے۔"

شادی کے بعد مجھے پتا چلا تھا کہ بڑی بیگم کے متوجہ کرنے پر حاد صاحب میری طرف مانتت ہوئے تھے۔ حاد صاحب بہت ہی کم رو انسان ہیں۔ اپنے حلقہ احباب میں اسی وجہ سے وہ جھکے ہوتے رہے تھے۔ کالی رنگت، پت پت۔ بے حد معصوم سے مین نقش اور اب تو دولت بھی تمہیں رہی تھی۔ صرف بھرم ہی بائی تھا۔ ان کا کاروبار تو بچ چکا تھا۔ شادی کے بعد میں نے بہت کڑواؤت دیکھا ہے۔ کو بھی بل گئی تھی۔ گھر

کا قیمتی سامان جگا تک گیا۔ حاد کی ایسی صدر سے انتقال کر گئیں۔ پھر حاد باہر چلے گئے۔ ہمارے حالات پہلے جیسے ہو گئے۔ اللہ سوہنا بڑا مہربان ہے۔ ہمارے رنگ دکھانا ہے۔ بہت ہی بزرگی والا ہے۔ اسی کی شان ہے کہ وہ ہم جیسا دل پر اپنا رحم کیے ہوئے ہے۔

تم غم نہ کھانا حادے! محنت میں عظمت ہے۔ شان ہے تم یقین جانو، حاد نے یورپ میں اس سے بھی سچ کام کیے ہیں۔ برتن دھوئے ہیں، ٹھکانا لگا گئی ہے۔ آج ان کا اپنا اتنا بڑا ہوش ہے۔ کئی ملازم کام کر رہے ہیں۔ رب کی رحمت سے اور اس کے فضل سے بگڑے کام سیدھے ہو جاتے ہیں۔ بس ثابت قدم رہنا اور محنت اور لگن سے خدا کو منوالینا۔

"آپ کیوں نہیں گئیں حاد صاحب کے پاس؟"

"کو مجھے کیا ضرورت ہے انگریزوں کے ملک میں بیچ بگاڑنے کے لیے جانے کی۔ حاد نے بہت کہا ہے۔" گھر میں نہیں ہانی۔ میرے بچے میرا ابا ہیں۔ میں اس آواز ملک کا شہری رہا کر خود سے اور زندگی سے دور نہیں کھینچا جاتی۔"

وہ صاف کو تھیں۔ اور جب میں انہیں میریڈم کہتا تھا تو انہیں بہت غصہ آتا۔ "تو مجھے طولی بائی بولا کر حادے! مجھے میریڈم شڈیم نہیں اچھا لگتا۔"

میں نے بائی کو اپنا راز دار بنایا تھا اور انہوں نے پوری بات سن کر مجھے نرمی سے سمجھایا۔

"دیکھ حادے! میں خود بیٹیوں والی ہوں اس بچی کے ساتھ کچھ غلط کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

بائی نے میرے اندر سے غصہ اور نفرت جتی کہ اشتیاق کے جذبات کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ انہوں نے کہا تو صرف اتنا "اگر قریا کو پسند کرنے لگے ہو اس کے لیے اپنے جذبات کو خالص سمجھتے ہو تو کبھی کبھی کسی بھی قسم کا انتہائی قدم مت اٹھانا جو تمہارے لیے عمر بھر کا پیچھے تارا بن جائے۔"

"آپ کیا سمجھتی ہیں یہ لوگ کبھی اسے میرا نہیں ہونے دیں گے؟ میرا دل کرتا ہے، ہم سول میجر









75 روپے والا نہیں

صرف 35 روپے میں

مہینے بھر کا شیمپو

میڈی کیم شیمپو



میڈی کیم شیمپو کرے بالوں کو گھنا۔ چمکدار اور سیاہ۔

”فری! اٹھنے مجھے معاف کر دیا؟“ وہ اس کے سامنے کان پکڑے کھڑا تھا۔ ”مجھے تاجن ستایا ہے“ معاف کرے نا“

”کرویا معاف کیا یاد کرو گے۔“ فری نے شان بے نیازی سے کہا۔ ”یہی مجھ حمزہ! اپنی داستان امیر حمزہ تو سنا چکے ہو ہماری نہیں سنو گے۔“

”پوری زندگی آپ کی ہی سنوں گا۔ اب صرف مجھے سننے دیجیے۔“ بڑی عاجزی سے درخواست پیش کی گئی تھی۔

”سنائیے“ فری نے ارشاد کیجیے۔“ فری نے شہانہ انداز میں کہا۔

”آب کو یہ معمولی سا مزدور کیسا لگتا ہے؟ اپنی ہمرانی کا شرف اسے بخش دیں گی؟ اگرچہ پورب میں بھی میں مزدوری کرتا ہوں۔ میں اب بھی مزدور ہی ہوں۔“ فری نے فری سے اتنا سا باشت بھر کا فلیٹ ہے میرا اور

آوی چلیں تو ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں ویسے تو یہ میرے اور تمہارے لیے ٹیک ٹکٹوں ہے یعنی ٹکرانا اور بار بار ٹکرانا چھوڑنا اسٹوڈنٹ ہے اس لئے گا بکسا

بھی بہت کم آتے ہیں۔ یعنی ٹکڈن نے فری سے اشارت لیا ہے۔ شہانہ چاہتا تھا امیر نہیں ہوں۔ ان کے گھر جتنا بڑا گھر نہیں ہے میرا گھر کبھی ان میں ان سے بھی چار ہاتھ آگے رہوں گا۔ فری ہر وار شوہر کا ہر سال کا ایئر ڈیوٹ مجھے ہی ملے گا۔ اب تم بھریا دل دونا! وہ

دونوں ہاتھ پھیلائے کہہ رہا تھا۔ ”کیا!؟“ فری نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں اپنے دونوں ہاتھ دسے دیے تھے۔

”ہاں“ قبول ہے۔“ وہ اس کے کان کے قریب گنگٹایا تھا۔ فری کو لگا پنج سال سے روشنی ہمارے چلنے سے اس کے در پیچھے میں جھانک کر پہلی شرارت کی تھی۔



کر کے ہوا میں اچھال اسیلے۔ ”تاجن سے اس بوسیدہ زندگی کا اختتام ہوا۔ اب نئی کتاب زندگی کے ہر صفحے پر اپنی پسند کی عبارت لکھوں گا۔“

”کیا لکھو گے؟“ فری نے ایک بے تک سوال کیا۔ ”صرف محبت۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ”تمہارے لیے۔“

”میں تمہارے ٹوٹے کڑوں کی۔“ وہ مسکراہٹ تو پھیلا کر دھاڑی۔ ”میرے ساتھ پھر سے انیر چلاؤ گے؟“

”فری! ایک بک نہ کر۔ یہ حیرا ہونے والا والا عجزی خدا ہے۔“ تنک کے چہرے پر خوشی کھلی پڑ رہی تھی۔ ”مجھے اس فیضیت سے شادی نہیں کرنی نہیں“ نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔

”نیریزن اپنے ہاں کو بنا۔ شام کی فلائٹ سے آ رہے ہیں دونوں۔ تمہارے ہی ڈیوٹی نے تڑھ سے تمہاری بات بٹے کر دی ہے۔ آج سے تم بالوں بیٹھ رہی ہو۔ چلو اندر“ منہ کھولے پھر رہی ہو۔ روپ کھا خاک آئے گا۔“ نانا مسکراتے ہوئے اندر پرہہ لگی تھیں۔

”جی مان گئیں؟ مگر کسے؟“ فری سارا غصہ بھلائے حیرت سے حمزہ سے پوچھنے لگی۔

”نہیں نہیں ساری عمر کنواری بٹھانے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میرے بچہ میں سوکھ سوکھ کر کاٹا بن رہی تھیں تمہے کھانا پنا چھوڑ کر کھا تھا تم نے“ اس لیے

سا سوال کو مانتا ہی پڑا۔“ وہ آنکھوں میں ڈھیر ہل چمک لیے کہہ رہا تھا۔

”اس خوشی میں ہم ویسی گڑگی بریائی بناتے ہیں۔“ بنگالی جی چمک کر لٹ رہے تھے۔

”بنگالی جی! آگڑ والے بیٹھے چاول اور اوبیل پائی بھی بنائے گا۔“ فری نے چونک کر ایک لگائی تھی۔ اسے اچانک زوروں کی بھوک لگنے لگی تھی۔ اور اسے

بے تحاشا ہنسی آر رہی تھی۔



کافولٹ



جام جم سے میرا بام سفل اچھا ہے

انسان شخصی ارتقا کے ابتدائی اوار میں 'مٹی' کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا 'گھماؤ' تربیت کے 'چاک' پر دھرا ہے اور ہزارہ جات کی 'مانگ' کو مد نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ماتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی 'تنگیاں' پر 'پرتن' کے بدن پر رتوں 'روایوں' مذہب سیاست جذلوں 'خوبوں اور سراہوں کی ان گنت 'وجیدہ' تحریریں رقم کرتی ہیں۔

مٹی کی حالت کے 'سانچے' میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر پرتن کا 'ظرف' اور 'تھیب' اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ 'سفال' کر کے بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے ان اثری بن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ 'توڑے' کی 'دنگ' برداشت نہیں کر سکتے اور تخریب جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی 'خریدار' نہیں آتا۔ ان کا تھیب اور بازار کا اسلوب، ہر 'ظرف' کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور یک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو، مگر تھیب کا فرق ضرور ہونا ہے۔

یہ ہی میرے ناول کی تھیب ہے۔

تھیب چند واقعات کو اپنے اندر ڈھکیں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ گرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی رحمت میں نے نہیں اٹھائی۔ کیونکہ میرا جسم وادراک ناقص اور ناقص ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں، میں آپ کو خود سے بہتر منصف بنانی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔ آپ اس ناول کو جس بھی نظر میں دیکھیں، مگر اسے مٹی کے لیے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیں گا۔ یہ جیتے جاتے وجود رکھنے والے اور چند کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشیرتی مستعد

بشیرتی مستعد

قالیگر





صوفیہ پیرن سے نامعلوم حالات سے گھبر رہی ہے۔ اسے انہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے، بلکہ اس کی ماں الیا گرانٹ کے عشق میں یا کل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد گرانٹ نے اس کی پرورش کی ہے۔ صوفیہ کو اسے والدین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مذہب سے۔ وہ یا بندوں سے آزاد و فدا کی گزارنا چاہتی ہے۔ کلاس میں جیسے سکھا اور کبھی کو مستقل کے حوالے سے دو بتاتی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میل صوفیہ کے پردوں میں رہتا ہے۔ وہ صوفیہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو پوسٹ آفس خط ڈالنے کو کہتا ہے۔ جسے وہ ہر مرتبہ کی طرح لاپرواہی سے ہوا پروردگی ہے۔ کارل میکار تھی کا بیج کاسب سے ہینڈ سم اور فلورٹ لڑکا ہے۔ لیکن صوفیہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ کارل کے لیے بے خبری کثیر ثابت ہو رہی ہے۔

عمر کی پرورش حکیم بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے جن کا خیر محبت اور بخاشی سے اٹھا ہے۔ انہوں نے عمر کی گھنٹی میں "اللہ" سے محبت بھری ہے۔ حکیم بیگم کو اللہ سے عشق ہے۔ عمر کی خواہش ہے کہ بے بی (حکیم بیگم) کو اس کی ذات سے دکھ نہ پیئے لیکن ہر مرتبہ دیکھنے کے بعد غلط ہو جی جاتا ہے۔ عمر کو حکیم بیگم نے ایک عیسائی عورت سے گور لیا تھا۔ عمر کو اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا شہس ہے۔ ماسٹر صاحب کا قلم اٹھانے پر حکیم بیگم عمر و سورۃ الناس اور سورۃ الفطیہ پڑھ کر بچو چکی ہیں تاکہ وہ آئندہ کوئی غلط حرکت نہ کرے۔ ان کی ایک مٹی آٹھ امریکہ میں رہتی ہے۔ شادی کے بارہ برس گزرنے کے باوجود وہ اولاد ہے۔ حکیم بیگم ہر وقت اس کے لیے اولاد کی دعا مانگتی ہیں۔ عمر کو بے بی کی گھنٹی حیران رکھتی ہے۔

پر نیوں آنرگ کو پارک میں ایک اجنبی گلکسیا گل پھولوں سے گر پڑ کر مر گیا ہے۔ وہ شش و روزہ رہ جاتی ہے۔ بعد میں وہ صرف اسی شمارا اجنبی سے ملنے پارک جاتی ہے۔ اس ملاقات میں پر نیوں پر لکھتا ہے اجنبی گلکسیا کو اداکاری کا جنون ہے۔ وہ اپنے آپ کو مستقل کا عقیم اداکار سمجھتا ہے۔ وہ اپنے اداکاری کی سہرا لے کے لیے پارک میں موجود لڑکیوں کو پر پوز کرنے کی اداکاری کرتا ہے۔ جسے جان کر پر نیوں کو دلچسپ لگتا ہے۔

گر گرانٹ اس سے ملاقات کا وعدہ کر کے اپنی دوست الیا مار سیلو کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

ابراہیم جالیس کی باہنی میں اپنے تایا کے پاس امریکہ چلا آیا۔ جو وہاں فریجی کا کامیاب کر کے تھے۔ تایا کی بیوی مار سے شادی کر کے اس کی لائبریری میں آئی ہے۔ وہ ان کی جائیداد و وارث میں ہیں جاتا ہے۔ مار کی وفات پر اسے اپنی خوشحالی بخشی کا احساس ملا ہے۔ بد قسمتی اس وقت ابراہیم کے دروازے پر دستک پڑتی ہے۔ مار سے ایک بے گناہ و بے گناہی سے رست سے جاتی ہے۔ اپنی چل دی جینٹ کے لیے وہ اسٹون کی پیش قیمت کارا دعا لیتا ہے۔ جو اس کی بد قسمتی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی وہ یوشین کی رقم بھی آٹک کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کی قیمت اسے اپنی تمام جائیداد اور زمین ادھاریاں اسٹون کے ہاتھوں لیا کر دکھائی پڑتی ہے۔ وہ اگلوتے بیٹے احمد سمیت سڑک پر آجاتا ہے۔

احمد کی وجہ سے اسے کئی جگہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس کا دل احمد کو شرم کرنے کا چاہتا ہے۔ آخر کار وہ کتابوں کی اپنی دکان کھول کر زندگی کی گاڑی چھیننے لگتا ہے۔ اس کا رومان مذہب کی جانب مڑنے چاہتا ہے۔ بلکہ احمد کا دل تمام نر کو ششوں کے باوجود اللہ کی جانب مائل ہونے سے انکار ہی ہے۔

احمد رضا اللہ سے بھاگتا ہے۔ ابراہیم زیدتی اسے دین کی جانب اسے کی کوشش کرتا ہے۔ ہالی وڈ انٹرنیٹ کے خواب احمد کو بے چین رکھتا ہے۔ باپ کی سختی اور بار بار بیٹ سے اور شدت سے شوق کی تکمیل کے لیے آسانی ہیں۔ اسٹون میں وہ لڑکیوں کی "پسنیدہ" جیسی ہے۔ ایک بیٹھی شو کے عوض وہ کسی بھی لڑکی کو اپنا بیٹھی وقت دے سکتا ہے۔ وہ لڑکوں کا زہر و مت نقل ہے۔ کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے کھر سے بھانگے کا فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن اس وقت جب وہ اہیرے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ ابراہیم کو فاج ہو جاتا ہے اور اس کا جسم نامکارہ و دکورہ جاتا ہے۔ دن رات کی خدمت سے نکل آکر وہ ابراہیم کو مار ڈالتا ہے۔ احمد کو یقین ہے کہ اب قسمت اس پر اپنی مہربانی ضرور کرے گی۔ اس کے خواب اس وقت چکنا چور ہو جاتے ہیں جب وہ پولیس بلکار گرفتار کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پر نیوں گرانٹ کو فون کرتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ دنوں کے درمیان روٹی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ گرانٹ کی ساری ہمت لنگھو اداکاری کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس کا پہلا عشق بھی ہے۔ پر نیوں گرانٹ کو متاثر کرنے کے لیے کیری گرانٹ کے متعلق معلومات انہیں کرنی ہے۔ واقف اسے ان مشکوک سرگرمیوں پر فوجا ہے۔ کچھ ہی

زوں میں گرانٹ کے سامنے تمام اہلیت آجاتی ہے۔ وہ پر نیوں کے جذبے کی پذیرائی کرتا ہے۔ ہول میں حکومت پر گرانٹ اپنی دوست الیا کو لانا ہے تو الیا پانوی زبان میں اسے "کلیتا" کہتی ہے۔ پر نیوں کو الیا کی حرا کا تین ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

صوفیہ بیروم ہائٹ پر کارل میکار تھی کی ساتھی بننے کی پیش کش قبول کر لیتی ہے۔ شو کے لیے ڈولیس ٹیکہ و کارل کے پیروں سے خریدتی ہے۔ کارل اس پر عمل کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔ کارل صوفیہ کے ساتھ چند لمحات قربت میں جانا چاہتا ہے۔ جس کے لیے وہ صوفیہ کو اضافی رقم دیتا ہے۔ صوفیہ اس پیش کش کا جواب بھی مثبت دیتی ہے۔ کارل اپنے دوست کے ساتھ مل کر صوفیہ کی ناز بنا دینا چاہتا ہے تاکہ صوفیہ کو بلیک سیل کر سکے۔

عمر کو اس کی ماں حکیم بیگم سے واپس مانگنے انھارہ سال بعد آجاتی ہے۔ لاجالاً حکیم بیگم کو عمر کو لوٹا نہ ہی پڑتا ہے۔ عمر کی ماں دنیا احمدی ہے اور ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ شو سے عمر کو عیسائی بنانے کی کوشش کرتی ہے لیکن عمر دین اسلام سے اپنا لہجہ مطلقاً ختم نہیں کرتا۔ وہ بیروم حکیم بیگم کو یاد کرتا رہتا ہے۔ کیا عمر کو اس کے حال پر پتہ چلے گا۔ کیا اس کے شوکت صاحب کا انتہائی عمر کو یاد گوار گزارتا ہے جو ان کے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بھی ہے۔ کیا اسے خیر ضروری حاصل دینی ہیں جو عمر کو اس گزرتی ہے۔ لیکن وہ ماں سے اس کا اظہار نہیں کرتا۔

ایسا زمانہ ماضی خریدنے عمر کے ساتھ مارکیٹ جاتی ہے تو عمر شرم سے گھبر کر رہ جاتا ہے۔ اس کی رائے ماں کے کردار کے متعلق اور بھی خراب ہو جاتی ہے۔

بیروم ہائٹ پر رقص کے دوران ایک گرانٹ بیچ کر کارل کا منصوبہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو مارتے بیٹے ہونے کو کھلے جاتا ہے۔ اس کے عزتی پر وہ کسی سے نظروں ملا نہیں دیتی۔

نہی کر کے عرف میل کو لاش کی بے رحمی پر گرفتار کر لیا جاتا ہے تو وہ خوف کے مارے بچ اگلنے کو تیار ہو جاتا ہے جسے سن کر انہیں کے رنگے کھلے ہو جاتے ہیں۔

مہاراجہ کے قتل کے وقت سے پولیس کے پتے پتے کے ساتھ ابراہیم کے قتل پر پولیس نے پکڑا ہے۔ کچھ ایسے کچھ ایسے سسٹر موہانی شگیت پر پڑا لیا ہے۔ پکڑے جاتے پر احمد بھاگنے کی کوشش میں کھیل کھیل کودتا ہے۔ خدا اللہ اس نکل پر اسے سات سال قید سنائی ہے! اس دوران اسے خدا اللہ کو یاد آتا ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم کے ساتھ کیسے سلوک پر پتہ چلتا ہونے لگتا ہے۔

پر نیوں گرانٹ کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔ اسی اثنا میں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گرانٹ بیوہ ہانگ کرتا ہے۔ یہ بات اسے یاد رکھ دیتی ہے۔ تب بھی وہ گرانٹ سے بے اعتنائی نہیں رہتی۔ گرانٹ اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے پرواز گزرتا ہے۔ ساتھ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ احمد گرانٹ اس کا اسکرین ٹیم ہے اس کا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ وہ سکھان سے بیچ پر نیوں کو سادگت کو یقین ہے۔ وہ احمد کو بتا دیتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گی اس لیے احمد اس سے شادی کا ارادہوں سے نکال دے۔

ہالی وڈ میں حالات احمد کو بری طرح پراسا کرتے ہیں۔ اسے تھرا کلاس جگہ پر رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تمام بڑی ایجنٹ کمپنیاں اسے بری طرح ریجیکٹ کرتے ہوئے mocking bird (نقل پرندہ) قرار دیتی ہیں۔ وہ اپنے مالک مکان سے کسی جانب کی بات کرتا ہے۔ سب ادارے احمد کو ایک شرا کا کردار قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اسے قبول نہیں ہے۔ ایک ادارے کا شمار پڑھ کر احمد آؤٹیشن دینے جاتا ہے۔ (اب آگے پڑے)

### چوتھی قسط



وکنڈے تھیں گے Foyer میں داخل ہوا تو اس کے قدم زین سے چپک کر رہ گئے۔ وہاں اتنے نوجوان موجود تھے کہ کھڑے ہونے کے لیے بھی مشکل کیجھ جگہ نہ تھی۔ اس کی باری دو سرے رونق کے بعد آئی تھی اور ایک پارک میں بیٹھ کر بے خواب رات گزارنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سوچن زدہ اور لمباں ٹخنوں آلود تھیں۔

ان پانچ لوگوں میں سے وہ دو کو پہچانتا تھا۔ ان میں سے ایک کامیاب اسکریٹ رائٹر تھا اور دوسرا اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ڈائریکٹر اتنے مشہور لوگوں کو پہلی بار اپنے دور میں گراہی پر حقیقت سے گھبراہٹ طاری ہوئی لیکن اسے ان پر شہرت کرنا تھا کہ وہی ان کا بیچا انتخاب تھا۔ وہ گردن مکن کران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اعتماد سے مسکرایا۔

”تم ڈالیں جاؤ۔“

اسے اندر داخل ہونے میں سکیڑ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اسے باہر نکلنے کے لیے کہا گیا۔ ”دیکھیں کیوں؟ آپ لوگوں نے میرا آؤیشن کیا ہے۔“

”تم مفید کام نہیں ہوتے۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

چند اقرار نے آپس میں معنی خیز نظروں کا تبادلہ کیا۔ ”صرف مفید کام یہ ایک اصول ہے۔“ وہ غصے سے جھجکا اٹھا تھا۔

”ایڈورڈ انرمنٹ میں ایسا کچھ نہیں لکھا تھا“ میرے پاس نیوز پیپر کلپنگ ہے۔“ وہ اپنی جیب میں ٹٹولتے لگا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسی باتیں لکھی نہیں جاتیں۔ سمجھ لی جاتی ہیں۔ تم جانتے ہو۔“

اس کے رنگ کی وجہ سے اسے پہلی بار مستز کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا آخری بار نہیں ہوا تھا۔ اس دن کے بعد بھی متعدد دفعہ اسے سفید فام نہ ہونے کی بنا پر ٹھکرایا گیا۔

لڑکپن میں بس میں سفر کرتے ہوئے کبھی گھبراہٹا ایسا

ہوا تھا کہ اسے سفید فام مسافروں کے لیے نشست چھوڑنا پڑی اور تب وہ بس اٹھائی سوچتا تھا کہ شاید سفید لوگ رنگ دار لوگوں سے زیادہ معزز ہوتے ہیں۔ ایک عرصے سے افریقین امریکن لوگ نسلی تعصب کے خلاف سول رائٹس کی تحریک لڑ رہے تھے۔ آئے روز نسل و عمارت گرنی کے واقعات ہوتے تھے لیکن اس نے کبھی ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ تو ”بازر کی دنیا“ کے مسائل تھے۔ ہالی ووڈ میں یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اسے کسی طور یقین ہی نہ آتا تھا۔

ہالی ووڈ حقیقت میں ہرگز ویسا نہیں تھا جیسا اس کے تخیل میں تھا۔ یہاں بھروسے لڑو سیاہ ڈاکروں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔



وہ پوچھنے قدموں سے پام کے درختوں کی دو روپہ نظاروں میں سے گزر رہا تھا۔ ٹھنکن کسی اٹیوے کی مانند اس کے دل کو کھینچنے میں لگنے لگی تھی۔ کمر میں دھواں لگا کر اس کی آنکھوں کو اٹھاتا تھا۔

اس نے بھاری سر اٹھا کر اسے لگا کر دھڑکی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس انجلیس کی معروف دھند آسمان سے اتر کر Griffith Park پر چھا رہی تھی۔ ہالی ووڈ سائن مٹ گیا اور نمائندہ بدو شرح دکھائی دیتا تھا۔ لکڑی اور دھاتی پر توں سے بنے وہ درجہ اول حروف بے معنی تھے ہالی ووڈ کے کیلے ”او“ کا اور بی نصف باید تھا۔

مور تھیرا ”او“ مکمل میٹ ہو چکا تھا۔ ہالی وڈ ہائپر حروف کی حیثیت کھٹھن ایک مکمل لفظ کی تھی۔ جس کا کوئی مضربوم نہ تھا۔

اس مایہ روپی ٹگرنے اس کے ساتھ چھل گیا تھا۔ فلموں میں اس نے جو دیکھا تھا وہ سب قریب نظر تھا۔ وہ یہاں مشاہیر میں شامل ہونے آیا تھا اور ہالی ووڈ نے اسے ایک گھنیا پار میں رات بھر گندے گاؤں دھونے اور فرش صاف کرنے کا فریضہ سونپا تھا۔

اصطلاح اس کے بند بند میں گاڑھا سال بن کر رہ سکتا تھا۔ وہ ایک گاتھک طرز کی الگ تھلک عمارت

کے گرد بے مقصد یا لگوں کی طرح پھکرانے لگا۔ عمارت ویران تھی اور لان کے ایک گوشے میں بڑا سا پتھریلا سرکھی۔ پیالہ و سیرا تھا جس میں تین سفید گل بریاں بچھ رہیں۔ وہ نالی دیوار پھلانا تک کر اندر اتر اور جن بریوں والے پیالے کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

بہت عرصہ پہلے کئی ہوئی برونڈک اؤس کے مالک کی باتیں اسے یاد آئیں۔ وہ سوچ کر رہا تھا۔ اس اعتماد سے دو چار ہونے والا وہ تھا نہیں تھا۔ اس جیسے بے شمار لوگ یہاں عظیم آتے تھے۔ بلیوں پر ستارے سجائے ہوتے اور ان ستاروں کو رست ہوتے اور نہیں لگتی تھی۔ بلیوں کی ایک جنمش سے وہ سارے پھیلے خواب خاک ہو جاتے تھے۔

مخشر خرام وقت اس کے وجود کو روند کر گزر رہا تھا۔ اتنی مدت بیت جانے کے بعد بھی وہ ایک لاسٹ سما پارٹ تک حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ وہ گاں جس کا انتظار کرتے کرتے اس کے اہمصاب غم ہو سکتے تھے کبھی ہلار آتے نہ جاتی تھی۔

وہ ترقی کی زبان کا اٹھل ٹھیل آئینہ کی چڑھ بندہ کا تھا۔ اسے اپنا خواب یاد آیا جو اب ایک ماہہ انگرس تھا اور اس کا بچی رونے کو چاہا۔

اسے سرخ قالین آسکرز اور ایشیاوں کی شہ سرخیاں یاد آئیں اور اپنی گمانی پر رونا آیا۔

ڈیپیکس اپارٹمنٹ پیٹ ہاؤس یاد آئے۔ Gucci

اور Christian Dior کی مصنوعات یاد آئیں۔ لموزین اور قراری یاد آئیں اور اپنی مفلسی پر رونا آیا۔ وہ خوبصورت تھا۔ کسی کو اس وصف سے غرض نہ تھی۔

باصلاحیت تھا۔ کوئی اسے آزانا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں آسمان کو چھونے کی جتو تھی۔ وہ لوگ اس کے قدموں تلے سے زمین بھی چھین لیتا جاتے تھے۔ وہ مال کا سد تھا۔ اس کی بازار میں کوئی ناگ نہ تھی۔



محبت نے گیت کھالی ساگر بھول کی مانند اسے بے بس کیا تھا۔ ”ساگر بھول۔ جو اب ظاہر خوشنما بھول اور در حقیقت لہریلا جانور ہوتا ہے۔ وہ کھات لگاتے بیٹھتا ہے اور جب کوئی بے خبر جاندار اس کے پرکشش رنگوں سے کھینچ کر قریب جاتا ہے اسے اپنے زہریلے بازوؤں میں جکڑ لیتا ہے۔“

وہ محبت کی مسموم گرفت سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے اور موٹی ہوئی جاتی تھی۔ اس نے مائع مسمومیہ کے پیالے میں انگلیوں کی پورس ڈبو کر اپنے سامنے صلیب کا نشان بنایا۔ ”میں اسے بھول جاؤں گی۔ بھولنا مشکل نہیں ہو گا۔ میرے بچی خدا صرف اتنا کر دے کہ میرا حافظہ چھین لے مجھے کچھ بھی یاد نہ رہے۔“

Tabernacle کے سامنے جھک کر اس نے دایاں گھٹنا فرش پر ٹیک دیا اور جھپٹی ہوئی سرخ کے مشدس شعلے پر نظروں جمایا۔

”میں اسے دل سے نکال دوں گی۔ بالکل آسمان ہے۔ بس دل کو شہرے چھڑانی توڑنے لگا۔“

بین الصفوف راستے میں سے گزر کر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ چھٹی نشستوں کی طرف بڑھ گئی۔ اپنے دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے بہت سے چہروں میں وہ ایک چہرہ تلاش کر رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔

”میں اسے کبھی نہیں دیکھوں گی۔ میں کسی اور کو بھی نہیں دیکھوں گی۔“

Priest اور Ministers کی جماعت گرتے میں داخل ہوئی اور مدح کے چوتے کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ مطربوں کا گیت منبر کے قومی ساہبان سے نکلا کر چار اطراف بکھر رہا تھا۔ قربان گاہ کی تعظیم کرنے کے بعد وہ اپنی مسندوں پر بیٹھ گئے۔ اگر وہ میں سے انتہی خوشبو کی لپٹیں اس کے منتوں سے نکلا میں تو وہ سوچنے لگی کہ گرانٹ کون سا کون لگاتا تھا۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ پر شاید وہ کوئی بھی



خوشبو نہیں لگاتا تھا۔ وہ اس کے بدن کی اپنی منگ  
تھی۔ Priest کی گھیسر آواز گونجی۔

”یاب! بیٹے اور دل اللہ کے نام میں۔“  
اس نے صلیب کا نشان بنایا اور بولی

”آئیں یسوع کا پیر میرے لمبو میں ہے۔ میرے اور  
یسوع کے درمیان میں دنیا نہیں آسکتی۔ لیکن میری  
دنیا چھ دن قامت کے ساتچے میں کیسے سمٹ گئی۔ کسی  
کی دنیا اتنی مختصر بھی ہوتی ہے۔“ اس کا دھیان بار بار  
بھنگ رہا تھا۔

Priest مومنین کی جماعت کو توبہ کے عمل کی  
دعوت دے رہا تھا۔

”آکھٹے خدا کے کئے کے طور پر امید کے ساتھ  
باپ سے معافی کے خدا ستار گھوں۔“

اسے اپنا گناہ یاد کرنا تھا اور اسے وہ یاد آیا۔ اس کے  
پہلوں کی آکھٹیں اندھیری رات سے زیادہ کافی تھیں  
اس نے بیٹے پر ہاتھ رکھا۔

”میں عظمت والے خدا سے اعتراف کرتی ہوں  
اور تم سے۔ میرے بھائی اور بہنو کے میں نے اپنی  
خلطی سے گناہ کیا ہے۔ اپنی سوچوں میں اور اپنے

لفظوں میں اس میں جو میں نے کیا اور اس میں جو میں  
نے کر سکی۔ اور میں مقدس گناہوں سے فریاد کرتی ہوں  
اور تمام فرشتوں اور بزرگنیدہ لوگوں سے کہ میرے لیے  
خداوند خدا سے دعا کریں۔ میرا گناہ یہ ہے کہ میں ایک  
مرد سے محبت کرتی ہوں۔ صرف اتنی محبت کہ اسے نہ

دیکھوں تو مجھے بیانی کی ضرورت نہیں۔ اس کی آواز نہ  
سنوں تو مجھے سماعت سے غرض نہیں۔ وہ مہم سا مسکرا  
وے تو میری روح سینے سے پھینچ لیتا ہے۔ وہ جہاں  
چھوٹے بدن کا وہی جزو دل بن جاتا ہے۔ آنکھ کے  
ایک اشارے سے وہ میری بخش روکنے پر قادر ہے۔  
اتنی ہی محبت تو خدا مجھے معاف کر دے گا۔“

بھل گئی ہوئی تھی اس کے گالوں کو بھگونے لگی۔  
سب مل کر گارے تھے۔ ”خداوند رحم کر۔“  
اس نے بھی اپنی آواز ملا دی۔ ”خداوند رحم کر۔“

”یسوع رحم کر۔“  
”یسوع رحم کر۔“

پھر اسے پتہ بھی نہ چلا، کسے عبادت کے تمام  
مراحل اس کے ہاتھ سے پھسل گئے۔

وہ اس وقت چونکی جب بڑیلے چرنے والی دہلی  
بروہیا نے جس نے سر کے بالوں کو نیلے ارکارف سے  
ڈھلایا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے اس کے  
کنڈھے پر استخوانی ہاتھ رکھا۔ اس کی کپڑوں کی لٹکیوں  
کا کرخت لمس پر نیاں کو گربے میں واپس کھینچ لایا۔ سپ  
دیکھ کر اس کا دل غ بھنگ سے اڑ گیا کہ سب لوگ  
قطار میں بنا کر مقدس Communion لینے کو تیار  
کھڑے تھے اس تمام وقت میں وہ کہاں رہی تھی؟  
وہ قدم کھینچے ہوئے تیلے ارکارف والی عورت کے پیچھے  
پہل دی۔

”یسوع! میرے منظر دل پر اپنا سما ہاتھ رکھ  
وے تیرے بچوں نے کوڑھیوں کو بھلا کیا ہے۔  
میری یاد رہے کہ ہر اکاش سے پاک کوڑھیوں اور  
گنہگار نے لگے۔“

Priest کہہ رہا تھا۔ ”یسوع کا دل۔“  
پائے والے غوش نصیب لے کہا۔ ”Amen۔“

”یسوع کا دل۔“  
”Amen۔“

دلی برہیا کچھ اور آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ  
جا رہی تھی وہ سب سے آخر میں کھڑی تھی اور کچھ گھول  
میں اس کی بادی آتے والی تھی۔

”یسوع کا دل۔“  
”Amen۔“

”یسوع کا دل۔“  
”Amen۔“

کسی عجیب سے احساس سے اس کی ٹانگیں  
کیا پائے لگیں۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔  
”میں یسوع کے بدن اور خون میں شامل ہونے کے  
لائق نہیں ہوں۔“ منظر لوں کے سرازوں کی کسی انگلیاں  
تھیں اور وہ اسی کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

”میں اس قابل ہر گز نہیں ہوں۔ میں بھولی ہوں  
قریب کار ہوں۔“ اس نے ایک اور قدم پیچھی سمت  
میں اٹھایا۔

خراب وار چست برکتیں فرشتوں کے پروں کی چمڑ  
پھڑپھڑاہٹ اس کانوں میں گونج گئی۔

”میں کب سوچا تھا کہ ایک عام انسان میرے اور  
یسوع کے بیچ آجائے گا۔“

وہ آنکھ کی پٹی پر یوں جم گیا تھا کہ اسے دوسری  
طرف کا منظر نظر بند ہو گیا تھا۔

وہ قدم بہ قدم پیچھے سر تری رہی۔  
مقدس شبہیں خاموش نظروں سے اسے گھور  
رہی تھیں۔

اس کے دل کا کھوٹ جانتے تھے۔



وہ کیمپس سے لوٹی تو ماحول میں عجیب نوع کی بے  
چینی تھی۔ گھر کے تینوں افراد لوگ روم میں بیٹھ تھے  
اور لڑائی مچ گئی تھی۔ بات نہ کرنا تھا۔ اور وہیں وہیں  
کے ساتھ بیٹھنا یا بیٹھنا سٹ کا کھوٹا کھوٹا ہاتھ  
نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظرس تو اسکرین پر تھیں گھور  
جیسے خلا کے پار گھور رہا تھا۔ والیوم بھی جھینسا ہٹ سے

فری اسی زیادہ تھا۔ چاہی کھیرے ہوئے فلور کیشن سینے  
ہوئے اس کی طرف دیکھنے سے گریزاں تھی اور بچھا  
اجبار کو گول کر کے میز کی سطح سے ٹکراتے ہوئے کسی  
کمری سوچ میں گم تھے۔ ان کی خاموشی غیر معمولی  
نہیں تھی مگر اس خاموشی کے پیچھے کوئی غیر معمولی بات  
ضرور تھا۔ کسی۔ جانے کیوں پر نیاں کو کسی سے کچھ  
پوچھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ وہ صوبے پر بیٹھ کر انتظار  
گرتے تھی تھی۔ پھر پچھانے ہونے میں پہل کی۔

”تم پاکستان بات کر لو۔ میں ابھی حال تک گروا دیتا  
ہوں۔“ اس کے اندر خدشات سنیلوں کی طرح سر  
اٹھانے لگے۔

”کیا ہوا ہے؟“  
”ہلکے تمہو جس بھابھی سے بات کر لو۔“ وہ اٹھ کر

ماحول کمرے میں ٹیلی فون کرنے چلے گئے تھے۔  
”ہی کا فون آیا تھا؟ کیا بات ہوئی ہے۔“ اس نے  
انتہا سے پوچھا۔

”تمہارے ابو کی طبیعت خراب ہے۔“ اسے  
چاہی کی آواز پھر اپنی ہوئی تھی۔

”ہم سب کو پاکستان جانا ہو گا۔ تم دل کو مضبوط  
رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

یکبارگی اس کا دل بیٹھ گیا۔  
”واقعی خراب ہے۔ ان کی طبیعت؟“

”تم دعا کرو۔ خداوند معافی کرے گا۔ اگر آئزک  
بھائی یہاں آنے پر رضامند ہو جاتے تو یہ نوٹ ہی نہ  
آتی۔ ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ ان کی ٹانگ کا ٹائٹ پڑے  
گی۔“

اس کے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔  
اس کا باپ پچھلے کئی برسوں سے ذیابیطس کے مرض  
میں مبتلا تھا۔ اس کے گروے اور بیانی بری طرح متاثر  
ہو چکی تھی۔ پچھلی مرتبہ وہیں سے بات ہوئی تو وہ کچھ  
پریشان لگ رہی تھی۔ پر نیاں کے اشتہار پر اس نے  
آئزک کے لان میں بے ہوش ہو کر گرنے کا ذکر  
سر بری انداز میں کیا تھا۔

”پیکر لگیا تھا۔ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔“  
ڈاکٹر نے اگر چیک کیا تو پتہ چلا ان کا ہڈ پر شر برصا ہوا  
تھا۔

وہ سمجھتی تھی کہ اس کی ماں اسے پورٹس میں دکھی  
تھیں کرنا چاہتی تھی وہ جان بوجھ کر آئزک کی بیماری  
کے ذکر سے لٹی گزرا جاتی تھی۔

پر نیاں ٹیلی فون پر کبھی بھی مذاق میں آئزک سے  
کوتی۔ ”مجھے ڈاکٹر بن کے آ لینے دیں۔ میں آپ کو  
ٹھیک کر دوں گی۔“ اور اس کا کچھ دھمکی آمیز ہوتا۔

آئزک کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ کسی  
کے کچھ بتاتے بنا بھی اسے معلوم تھا لیکن صورت حال  
اس درجہ خراب ہو چکی تھی۔ اسے انداز نہیں تھا۔  
وہیں اس کی آواز سنتے ہی روڑی تھی۔ وہ بڑی



ہست والی عورت تھی۔ پر نیوں کے شکل سے مشکل وقت میں بھی اسے آسودہ ہاتھ نہیں دیکھا تھا۔

”خیر تیاں! آنے میں ہرگز نہ کرنا۔ تمہارے بونے پوری رات تمہارا نام لیتے ہوئے گزارا ہے۔“

”اب نے مجھ سے چھپایا کیوں؟ میں ہمیشہ پوچھتی تھی اور اب مجھ کو تسلیم دیتی تھیں۔“ وہ خود بخود روئے لگی تھی۔

”تم اتنی دور بیٹھ کر کیا کر سکتی تھیں۔ بیماری انہیں گھر کی طرح اندر سے کھا گئی ہے۔“

”تمہیں امریکہ لے آئیں۔ یہاں بہت جلدی سہولتیں ہیں۔ وہ بالکل ٹھیک۔“

”وہ کہتے ہیں میری مٹی خراب نہ کرو۔ مجھے سکون سے مرے دو۔ ان کی ضد سے کون جیت سکتا ہے اور لب تو اتنا وقت بھی نہیں بچا۔“

”اب ایسے نہ کہیں میرے دل کو کچھ جو رہا ہے۔“

اس کے آنسوؤں میں شدت آگئی۔

”تم نے جو بھی شایگ کرنا ہو۔ ایک دو دن میں کر لیا۔ میں کوئی تیار نہیں کر سکوں گی۔ وہیں کی بے گل بات اسے بہت عجیب لگی تھی۔

”میں منگوا لیا شایگ کس لیے۔“

”تمہاری شادی کے لیے میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب تو میں بہت تھک چکی ہوں پر تیاں! مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے۔ کوئی روئے لگتا ہے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔ تمہیں برا یاد کرتا ہے۔“

اسے لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ اس کے آنسو ختم گئے تھے۔

”میری شادی کا یہاں کیا ذکر ہے۔“

”تمہارے ابو کی بس یہی خواہش ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ہی تمہیں دلن بے ہوئے دیکھ لیں۔“

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت لمبا عرصہ جنس گئے لیکن میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ ابھی تو میں نے اپنی پرچائی شروع کی ہے۔“

”پرچائی تم شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو۔“

”ابھی میں نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا۔ اتنی جلدی کی ہے۔“

وہیں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

”میں نے تمہیں بتایا ہے پر تیاں! تم سے پوچھا نہیں۔“ اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”پاکستان آئے ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔ جو تمہارا بہت انتظام کرنا ہے وہ تمہارے ماموں سنبھال لیں گے۔ تمہیں جو بھی ضروری سامان خریدنا ہے خرید لو۔ میں ہسپتال جا رہی ہوں۔ ابھی فون بند کر دیتی ہوں۔“

پر تیاں کو ان الفاظ پر یقین کرنے میں بڑی دشواری ہوئی تھی۔

”اب لوگ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔“

”مہلخ کو حاضر کر کے سنو۔ تمہارا باپ مریا بے مرستے ہوئے لوگوں کی خواہش تو کبھی بھی دشمن بھی پوری کر دیا کرتے ہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ تمہارے ماموں یا ہر گاڑی میں میرا انتظار کر رہے ہیں۔“

”یہ ایسا مت کر میں مجھے یوں مجبور نہ کریں۔“

”پر تیاں! کبھی ہے میں جنس میں میری جان بچانی ہے اور تم اپنا روٹا لے کر چھینے کی بات کیونکر کرنا وقت پسند نا پسند یہ سب باتیں خوش باش فارغ لوگوں کو بچتی ہیں اور ہمارا سامنا موت سے ہے۔ میں تمہارا مسئلہ ضرور سٹی لیکن میں مجبور ہوں میں نے انہیں بچوں کی طرح بلک بلک کر روئے دیکھا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔“

”میں ابو سے خود بات کروں گی۔ وہ میرا کہا مان جائیں گے۔“

”وہ سنے ہی بہت اذیت میں ہیں۔ میں کسی کو بھی ان کی تکلیف میں اضافہ نہیں کرنے دوں گی۔ تم اتنا شور کیوں مچا رہی ہو۔ پہلے یہ تو پوچھ لو۔ تمہاری شادی کس سے ہو رہی ہے۔ خود ہی خاموش ہو جاؤ گی۔“

اسے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ صرف طریقہ و صبح کرنا باقی تھا۔ دار سمورٹ کبھی پیکر ہتی کر ہی یا پھر صلیب۔“

”داؤد اور اس کے ماں باپ نے دو سری بات نہیں کی تم سے زیادہ تو وہ میرا درد سمجھ رہے ہیں حالانکہ ان سے کوئی قریبی رشتہ داری بھی نہیں ہے۔ دو سری یا تیسری سسل میں داؤد سے کوئی رشتہ داری بنتی ہے۔ خود غرضی دکھانے کے لیے زندگی تمہیں اور مواقع دے گی لیکن کرو یہ وہ موقع ہرگز نہیں ہے۔ رابطہ مت قطع ہو گیا تھا۔ وہ ریپورر ہاتھ میں لیے پھر کابرت بنی کھڑی تھی۔“



”داؤد! تم میری بات سمجھ نہیں پاسے۔ جس تم سے شادی نہیں کروں گی۔ تم ابھی فون پر یا پاکستان جانے کے بعد انکار کرنا۔ تم کوئی بھی بہانہ بنا سکتے ہو۔ کہہ دینا کہ تم کہیں اور کھٹلے ہو۔ کچھ بھی۔ اہم چیزیں سے دوست ہیں۔ تم میرے لیے اتنا کر سکتے ہو۔“

داؤد اس کی متورم آنکھوں اور زور و زحمت کو بے اثر چہرے کے ساتھ دیکھتے ہوئے ٹائی کی کمرہ ڈھکی کر کے نکلا۔

”اس کی وجہ۔“

”وجہ کچھ بھی ہو لیکن تم میری مدد کرو۔“ اس کی جانب سے سوخ پھیر کر آگے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”مجھے وجہ میں کہنی دیجیے ہے کیونکہ یہ گفتگو میری شادی کے بارے میں ہو رہی ہے۔ شاید یہ پہلو تمہارے ذہن سے گزر رہا ہے۔“

”مجھ پر طنز نہ کرو۔“ وہ کجاہت سے بولی تھی۔ ”کوئی نہیں ہے جس سے میں مدد مانگ سکوں۔ صرف تم مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہو۔“

”کبھی کبھی آخری ایسا ملاں بھی ہا یوس کن جاہت ہوتی ہے۔“ پر تیاں اٹھ کر اس کے قریب چلی گئی۔ وہ جنوز آگے میں دیکھ رہا تھا۔

”تم نے بے حسی سے بات مت کرو۔ تم مجھے بہت دکھ دے رہے ہو۔“ وہ خاموش رہا اور بائوں میں انگلیاں چلائے لگا۔

پر تیاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”پلیز مجھے ہا یوس نہ کرو۔ میں بہت مجبور ہوں۔“

”تمہیں مجھ سے شادی پر کیا اعتراض ہے؟“ وہ تیزی سے کھڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”تم بہت اچھے ہو داؤد! تم میں کوئی برائی نہیں۔ خرابی مجھ میں ہے۔“

”تم مجھے ہر خرابی کے ساتھ قبول ہو۔“

”میں۔ محبت کرتی ہوں۔ کسی اور سے۔“

اسے اس محبت کا اعتراف مہرچہ کا کرنا پڑا تھا۔

”کس سے؟“

”ہام جان لینے سے کیا ہوگا۔ میں تم اتنا سمجھ لو کہ میں اور تم ایک دوسرے کے لیے موزوں نہیں ہیں۔“

”مجھے سب کچھ جاننے کا حق ہے کیونکہ یہ میری زندگی ہے جس کے ساتھ تم یہ سب کر رہی ہو۔ تمہیں یاد نہیں ہے کہ میں گوشت پوست سے بنا جیتا جاگتا انسان ہوں اور مجھے درد بھی ہو سکتا ہے۔“

داؤد نے اس کے سامنے سے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا لیا۔ اس کی کپڑی پر اجمری ہوئی رنگ تیزی سے دھوکا رہی تھی۔

”وہ میری زندگی ہے داؤد! میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔“

”کوئی کسی کے بغیر نہیں مرنے سب کو زندہ رہنا پڑتا ہے۔“

”میں سب کو نہیں جانتی۔ میں تو اپنی بات کر رہی ہوں۔“

”یہ شادی تمہاں جان کی خواہش ہے۔“

”اور تمہاری خواہش کیا ہے؟“

”تمہیں میری خواہش سے غرض ہی کیا ہے۔“

داؤد کی آواز پست ہی گئی تھی۔ ”مجھے معلوم ہے تم کس کے لیے ٹھہر کر رہی ہو۔ اس معمولی شخص کے لیے جسے تم صحیح طرح سے جانتی تھیں۔“

”اسے مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔“

”تمہیں امریکہ آئے ہوئے پانچ مہینے اور نو دن ہوئے ہیں۔ اگر ایئر پورٹ پر جنازے سے اترتے ہی تمہاری اس سے ملاقات ہوگی تھی تو تمہیں اتنا عرصہ کسی



انسان کو چلانے کے لیے بہت قلیل ہے۔ جو شخص  
بیموں جیسے کپڑے پہنتا ہو۔ یا تجھیں چیز کرتے لگا آ  
ہو اور بات کرتے ہوئے بالکل کی طرح ہاتھ ہلاتا ہو۔  
وہ تمہاری محبت کیسے ہو سکتا ہے؟  
”بب پانچ مہینے تو دن کسی کو جاننے کے لیے ناکافی  
ہیں تو تم ایک ملاقات میں کیسے اسے پرکھ سکتے ہو۔“  
”میں اس سے شادی کر کے کبھی خوش نہیں رہ  
سکتیں۔ وہ تمہاری infatuation ہے۔ وقتی ایال  
ہے۔“

”میں اس کے ساتھ شادی نہیں کر رہی واؤ۔۔۔“  
”تو پھر مسئلہ کیا ہے؟“  
”اس کے ساتھ نہیں تو کسی اور کے ساتھ بھی  
نہیں۔“

”تم مجھے ابھاری ہو۔“  
”میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی پرنچھے رہنا ہوگا۔“  
”تو پھر ہم شادی کر لیتے ہیں اور میں تمہیں گاہک  
ہمارے درمیان بیٹھتا۔ سچی میں ہوتی۔“  
”میں اس سے جدا ہو کر اس جسم رہ گئی۔ ہوں۔۔۔  
رہن تو اس کے پاس ہے۔ روح کے ناہم کھینچ رہا ہوتا  
ہے۔ کھینچ رہے کر ہم کیا کر سکتے۔“ وہ دیوار پر تکی بیٹھ  
اٹلی تکی کو یک تک گھور رہی تھی۔

”تمہیں اگر اس سے اتنی ہی محبت ہے تو اس کے  
ساتھ بھاگ کر کوٹ میں چ کر لو۔ کیا جان تو آج ہی مر  
جانے دو۔ مجھ پر لعنت بھیجو۔ تمہیں رو کا کس نے ہے  
Go to hell۔“ وہ دیواروں کی طرح چیخنے لگا تھا۔  
پر نیوں کی نگاہوں کا زور یہ نہیں بدلا۔ ”میں نے کہنا  
میں اس سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔ وہ مسلمان  
ہے۔“

داؤد کو ایک جھکا لگا تھا۔ وہ تیز قدموں سے اس کے  
پاس آیا اور اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ  
اپنی جانب گھمایا۔

”تم نے جو اسوں میں ہو۔“  
”پتہ نہیں۔“ وہ اس کی قمیص کا کالر دیکھنے لگی  
تھی۔

”تمہیں یا نکل اندازہ نہیں ہے تم خود کو کس چیز میں  
لوٹ کر رہی ہو۔“  
داؤد کی انگلیاں اس کی ٹھوڑی میں گڑھی جا رہی  
تھیں۔ ”میری بات سنو۔ تمہاری شادی مجھ سے ہوگی  
اور میں یہ ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔ اب اگر وہ بلڈی  
باشٹہ تمہارے آس پاس مجھے نظر آ گیا تو میں اسے قتل  
کر دوں گا اور ضرور کر دوں گا۔“ کچے کی بددلت اسے  
اپنی بڑوں میں اتنی محسوس ہوئی تھی اس کے بدن  
میں پھر جھری سی رنگ لگی۔

اس نے برہ مڑا کر کھڑکی کے بیٹہ ایک  
سروانی ہوا میں خوشگوار خوشکلی تھی۔ آستان اعلیٰ سپید  
پھولوں والا شائع تھا جو کوئی دھو کر اس کے گھسوں کے  
میں سوکنے کے لیے پھیلا گیا تھا۔ بانگاز گمباز سورج نسر  
کھلے سفید رنگ کے پائیڈ بھر بھر کے دریا پر انڈولتا  
تھا۔

اس نے سڑک کے پار قمری تھیں وہ لے اور شہر  
کے کوچ سے ایک رات قات گھس کر کھٹے لگا تھا۔ اس  
شخص کے ہاتھ بڑے بڑے تھے اور چلنے ہوئے وہ  
اسیں تیزی سے حرکت دے رہا تھا۔ اس کے دائیں  
ہاتھ میں ایک لمبی سرخ جھول رہی تھی۔ بر نیوں کھڑکی  
کا پتہ تھامے اسے قریب آتے ہوئے دیکھتی رہی۔  
جب آگے والے کا چہرہ وضاحت سے نظر آنے لگا تو  
اس نے حلق کی پوری طاقت صرف کر کے اسے پکارا  
اور ہاتھ کے اشارے سے وہیں رکنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد گھر کے مرکزی دروازے سے باہر آئی  
اور دست روی سے چلنے لگی۔ تڑن پر پاؤں رکھنے سے  
اس کے سر میں دھک سی اٹھتی تھی۔ تین دن سے  
اس نے ایک نوالہ بھی حلق سے نہیں اتارا تھا اور وہ  
مرجانے کی حد تک نقاہت محسوس کر رہی تھی۔  
گرائٹ کے نزدیک پہنچ کر وہ چھنوں کے بل فٹ ہاتھ  
پر بیٹھ گئی اور اس کا ہاتھ جس میں سرخ شکو فوں سے  
گندھی مالا تھی۔ سروبا تھوں میں تمام کرایے سامنے

پھیلا لیا۔ ایک گرم برقعہ اس کی پلکوں سے پھسل کر  
گرائٹ کی پھٹلی پر گر گئی۔ پھر سیں ٹوا کر پر نیوں نے  
اس کی پھٹلی پر برب رکھ دیئے تھے۔  
”مجھ سے شادی کر لو۔“ اس کی آواز مستکن گمباز  
تھی۔

سارے میں دھان کی رس بھری پتیوں کی مٹھی  
مہک پھیلا تھی۔ گاؤں کی چکن کی لگانا گھگھک بک۔  
کیک بک بک۔ ٹریکٹر کے انجن کے شور سے کبھی دپ  
جالی اور کبھی اوپر اٹھ کر بوڑھے ہاتھیوں کی چونچوں پر  
لہرائے نکلتی۔

وہ بچی ہاتھ پر قدم دھرنا تمہارے پیلو میں پتھیا پتھر  
داروں کی خوئی سے سوروں کی کھک۔ کانوں میں  
پڑنے لگی۔

اس نے دور سے ہی حکیم بیگم کو دروازے کا گواڑ  
تھام کر کھڑے دیکھ لیا تھا اور نظر اٹھاتی وہ بے قرار ہو کر  
باہر آئی تھی۔ قریب پہنچ کر حکیم بیگم نے اٹھ کھینچا  
اور اس کی پھیلائی تے لگا تھی اس کے چہرے پر ایک  
عاقبتی بیان ناٹھ تھا۔ وہ یوں ہانپتی تھی جیسے ٹیلوں  
بھاگ کر آئی ہو۔  
”السلام حکیم بیگم!“

بچہ نے سلام کا تبول نہیں دیا اور اس کا سر پکڑ  
کر اپنے چہرے کی جانب جھکایا۔ پھر ہنسل پھولی  
سائیل پر قابو پانے ہوئے اس کے کان میں دھیرے  
سے کچھ کہا تو آواز اتنی مدہم تھی کہ وہ سن ہی نہیں پایا۔  
”مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تو نے کیا کہا ہے جی!“  
حکیم بیگم نے دوبارہ سرگوشی کی تھی۔ اس بار الفاظ  
واضح تھے لیکن وہ جو بیان کر رہی تھی عمر کے لیے  
ناقابل یقین تھا۔ وہ حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔

آمنہ اور یوسف کل بیچ کی فلائٹ سے آستان منچے  
تھے اور گزشتہ رات حکیم بیگم سے ملنے آگئے تھے  
انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع بیگم کی نہیں دی تھی  
اور جب حکیم بیگم نے فون پر عمر کو ان کی آمد کے بارے

میں بتا رہی تھی تو اس کی خوشی اور خوشی کی وجہ سمجھ  
سکتا تھا۔ وہ خود بھی بہت خوش ہوا تھا مگر حکیم بیگم کی  
آواز میں کوئی ایسی بات تھی جس کی کوئی توجیہ وہ نہ سمجھتا  
نہیں پایا۔ وہ جیسے کچھ کہنا چاہتی تھی اور ضبط کر کے خود  
کو روکے ہوئے تھی۔

”آمنہ تو یوسف آئے ہیں۔ تو دی آجا۔ دو  
دس ماڑے (دن) پھٹلی لے لینا۔ اللہ وا کر م۔“ وہ کچھ  
کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ چند لمحے اس کی تیز سانسوں  
کی آواز ابتر نہیں سے آئی رہی۔  
”کیا بات ہے بیگم!“

”سوئے (جلدی) نکل پڑنا۔ میں لی اڈیک (لسا)  
انتظار نہیں کر سکتی۔“  
اس نے واضح طور پر حکیم بیگم کے بدلے ہوئے  
لیجے کو محسوس کیا تھا۔

”گھر وانا جمل بڑا دل گیا ہے۔ ام کلثوم وی پوتری  
جسٹ وی برادر ریڈی ہوئی تھی (تو پھٹلے سے پھٹلے  
سہل بیوہ ہو گئی تھی) اسے میں نے ڈا (بڑا) پکا گھر  
دینے کے لیے دیا ہے۔ پھر دے وامنڈا ہے اس  
ول بڑی لائق لگ۔ کئی ہے تے صالحہ دے ڈھور  
وہ بڑے میں باندھ لیے ہیں۔ سیالی (جائزے میں) ان  
کے لیے کو کھوئی ہو ایوں کی۔ ہور سن (اور سنو) کا کال اپنی  
کنڈھ (دیوار) نال جو نالی ہے۔ اس تے اک گاڑ  
(گھری) نے آنا (خوفسہ) بنا لیا ہے۔ بڑے چراں  
پچھوں (دیت بھڑ) گاڑنے اور دوسوں (بیرا) کی ہے تو  
گاڑوں کا بڑا وری تھا۔ جے کوئی بھول اہلکے ایدھر  
مذ کر لیتے تے غلوٹ مار کے پر کا رجا (ڈورا رتا) تے ہاں  
صاڈا نے کو تری رکھے ہیں۔ بس تو چھہتی آجا۔  
تیرے دیکھوں لی بہت چھہ ہے۔ تو بڑا حیران ہوگا۔  
میں تجھے سچ (لیے) سمجھاواں۔۔۔ چڑی چو پکے (سچ  
سویرے) تے پینڈا شروع کر دینا۔“ اس نے گویا ایک  
بار پھر خود بچہ کر کے کچھ پھیلا تھا۔

ان میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو اسے حیران کر  
پاتی۔ نہ تو اسے کیوتوں اور کلہروں سے کوئی دلچسپی  
تھی اور نہ ہی صاڈا اور اس کے بیٹے کے اوپر بسرام



کرنے کی خبر اس کے لیے نئی تھی۔ پہلے بھی حکیم بیگم اس بارے میں تذکرہ کر چکی تھی۔ جہاں تک آئمہ کی آمد پر خوش ہونے کا تعلق تھا تو آج سے قبل کبھی بھی اس نے ایسی سرست کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر کیا تھا وہ وہ بیٹے کے لیے بے چین تھی اور کہہ نہ پاتی تھی۔

وہ تمام سفر ارکانات کے بارے میں سوچتا آیا تھا۔ اور اس کی الجھن تب دور ہوئی تھی جب مسجد والے کنوئیں کے پاس پشادے ہسپتال کی کھٹی سبز چھاؤں تلے حکیم بیگم نے اس کے کان میں وہ لفظ کہا تھا۔

”تمہارے بال (بچہ) ہونے والا ہے۔“ وہ چند لمحے کوئی دو عمل ظاہر نہ کر سکا۔

”ہاں کا کا! اسے بچا (تیسرا) مہینہ لگا ہے۔“  
”عمرا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔ اتنا اسارت ہونے کا۔ ایک لڑکے کا اس قدر خوبصورت ہونا تو غیر اتفاقی حرکت ہے۔“

آئمہ دو سال بعد اسے ملی رہی تھی۔ اس کے بیچ چھ برس پرانے بیوی مسکراہٹ عمر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”آپ کو بہت مبارک ہو باقی اچھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“ عمر نے اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”ہم ناراض تو نہیں، ہو کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد یہ خوشخبری کیوں سنائی۔“ یوسف بولا تو عمر نے ہنستے ہوئے ٹی میں گردن ہلائی۔

”دراصل ہمیں بھی یقین کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی تھی انیس سال ہو گئے ہمیں دو ورہے کھاتے ہوئے۔“

عمر کی نظروں نے اختیار چیمبر سے متصل دہلی دیوار کی طرف اٹھیں جہاں حکیم بیگم کے ہاتھ سے لپٹی ہوئی کیوبی لیکر بس سالوں کے انتقال کی داستان ستاری تھیں وہ تعداد میں بیس تھیں۔ حکیم بیگم اور عمر ایک دلچسپ کو دیکھ کر یوں مسکرائے جیسے کسی سازش میں شریک ہوں۔ دونوں میں سے کسی نے یوسف کے حساب کی سچ نہیں کی تھی۔

”تیرے برسوں کی بے شمار جدوجہد کے بعد جب ہم ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے تو اچانک۔“

بھابھی آپ کے لیے کسی کے ”حصار نے اتنا جوانی کو گھڑن سے باہر آگرا سے سلام کیا تھا۔

”بچھون (پوچھنے) دی اوڑھتیں۔ تو چھپتی لے کے آتے اور کمری پے سڑکے آیا ہے۔“

اس کے بجائے حکیم بیگم نے جواب دیا تھا۔

بعد میں آئمہ اسے خاصی دیر اس طریقہ علاج کے بارے میں سمجھاتی رہی تھی جس کے ذریعے یہ بچھو رو نما ہوا تھا۔ عمر کو اس سرجری کی چھیدگی اور جدید طب کی سحر آفرینی میں کوئی اسرار نظر نہ آیا۔ اسے رتی برابر بھی شک نہ تھا کہ حکیم بیگم کی دواؤں کے سوا کوئی شے آئمہ کو بار آور کرنے کا باعث بنی تھی۔

یوسف اور آئمہ صرف دونوں حکیم بیگم کے گھر گزارنے کا ارادہ رکھتے تھے اس کے بعد وہ یوسف کے والدین کے پاس نارووال شہر چلے جاتے۔

موتل میں قیام کے اختصار کی بہت ساری وجوہات تھیں۔ جہاں باپ ہاتھ کے پتھروں سے بوجھ کر پیڑھل فین اور ریلو سے چل کر یونیورسٹی تک ہی پہنچ پاتی تھی۔ کنوئیں اور نلکوں کی جگہ بجلی کی موڑوں کے لیے لی تھی مٹی، تار پٹی اور پتیل کے بان پلاسٹک ڈز سبوں سے بدل گئے تھے۔ لیکن ایئر کنڈیشنر، غسل واٹر انٹریٹ کی منزل ابھی دور تھی۔ باقی

ہیجن hygiene جیسے اہم مسئلے سے وہ مانی لوگ نا حال انجان تھے۔ انسانوں اور مہاشیوں کا ایک ہی اجاڑے میں اکٹھا رہنا یا نلک قلعہ بات سمجھی جاتی تھی۔

صاف کی گائے یا صاف کا چھ سالہ اونٹ ننگا بیٹا جسے زورہ ہوا تھا۔ چھینتے تو آئمہ کی احتیاط کا درجہ دونوں صورتوں میں ایک جیسا ہی ہوتا۔ آئمہ اپنے ساتھ منزل واٹر کے لیٹن سپیڈز تیل برتن اور مشو پیچ کے ڈھیر لے کے آتا رہتے اور پھر۔ فکر انگ کہ صاف منزل یا حکیم بیگم میں سے کوئی ان چیزوں کو چھون لے پھر بھیڑ کا نوازیندہ مہمنا اور گیوتوں کا جوڑا دن بھر پورے

آئین اور کمریوں میں لے ہمارے بیٹے ایسے بہت چوکنا رہتا رہتا۔ جب حکیم بیگم۔ پتھروں اور پتھروں کی آگ دیکھنے گئے پکوان انہیں کھلانے کی کوشش کرتی تو زور لگتے کے شعور سے ہی ان میاں بیوی کو لگائیاں آنے لگتیں۔ کم و بیش تمام کھانے کی چیزوں میں گوبر کی پوری ہوئی تھی۔ ”جیورا“ انہیں ڈبوں میں بند خشک خوراک اور پھلوں سے بھوک مثالی پڑتی۔ مکھیوں پتھروں کی کثرت، گھوڑو ڈیسیلور تھیت ورک کی عدم دستیابی اور ایسے بہت سارے من صرتے جو ان کو ذیابیط اور گائوں میں ٹھہرنے نہ دیتے تھے۔

وہ آئمہ اور یوسف کے ساتھ نکاتن کے ساتھ میں کھاٹ پر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ حکیم بیگم گائے کا وہ وہ دوہنے سے پہلے لٹھنی سے چلوں میں پالی بھر کر اس کے بھرے ہوئے تھنوں کو دھور رہی تھی اور صاف بسورتے منزل کو کندھے سے چنائے گھن میں نھل نھل کر ہلانے میں گھن تھی کہ ایم کلڈیم ہاتھ میں ہتھ لگے تھی۔

”گھوڑو گھوڑو مبارک! حکیم بیگم، ارب چاند جیسا، پترا (تو اس) تیری بھونٹی ڈالے۔ میں تو چھپ (چھان) بھر کے مٹھیا کی کالوں کی۔“ اس نے حکیم بیگم کے قریب ٹوک کر سلام دعا کی اور نگاری میں سر کھائے جھوسے لے چارے پر منہ چلائی ہوئی گائے کی گیلی تھو تھنی سلانی رہی۔ پھر وہ آئمہ کے سر پر چاروینے کے لیے آگے بڑھی تو آئمہ نے جھر جھری لے کر کندھے الٹا لیے اور پہلو بدلتے ہوئے اس کی دسترس سے دور ہو گئی۔

”کیا حال ہے ماسی! ٹھیک تو ہوتاں۔“ آئمہ نے چھوہاں کے برصے ہوئے ہاتھ کو دیکھتے سے گریز کیا تھا۔ اس کی پچھلی ہٹ فطرت کے اصولوں کے عین مطابق تھی۔ یہ وہی ہاتھ تھا جس کو چند خانے قبل لگائے نے اپنی زبان سے چاٹا تھا۔ لیکن چھوہاں نے اس روئے کو اپنی توجہ نہ گردانا تھا اور ان سے بڑے کو تروں کی دھامی کے یاں موڑھا جیسا کر بیٹھ گئی۔ مغرب کی آذان میں

تھوڑا وقت رہ گیا تو سر اٹھا کر ان کی شل توڑی ملی ہوئی مٹھا والی ڈوٹ کھچی میں نکلنے سے پانی بھرا اور چھوہاں کے قریب کھڑا ہو کر مسواک کرنے لگا۔ اسے آئمہ کا برتاؤ بڑا اگا تھا لیکن چھوہاں سے اس کے گئے کا حال احوال دریافت کرنے سے عمر کا مقصد اس کی رنجونی کرنا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زہرا گئے بناس کا بی بٹکا نہیں ہو گا۔ ان لمحات میں وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

”ماسی! جب میری ماں الوھر تھی۔ تو اس سے ملنے کبھی کوئی آتا تھا؟“ اس نے حتی الوسع سب سے کوسری دیکھنے کی کوشش کی۔

چھوہاں نے چلم میں دیکھنے کو نکلوں کو دیکھنے سے کریہ کر آگے پیچھے لڑھکا پھر قیص کے دامن میں لگی جب سے بے ہوشے تھا کہ گھوڑو اور گڑ کی بھیلی نکالی، بھیلی گو دو حصوں میں توڑ کر ایک کھڑا چلم میں رکھا اس پر تمباکو دھرے کے دوسرا کھڑا تمباکو کے اوپر رکھا اور کو نکلوں کو پھر سے بلا جلا کر ترتیب دیا۔ حدت ہاتھ ہی گڑ پکھل کر تمباکو سے چیک گیا تھا چھوہاں نے عمر کی بات جیسے سنی کیا نہ تھی۔ وہ سوال دہرائے ہی والا تھا کہ چھوہاں بول پڑی۔

”وہ سالی (بھیلی) تھی۔ ہر حکیم بیگم یا کی پلیدی کا دھیان نہیں کرتی تھی جن بھانڈوں میں اسے کھلاتی تھی۔ انہیں خود کھائیں۔ سچ پوچھو تو میرا روح ہی نہیں کرتا تھا اور آئے کو۔“

چھوہاں نے منہ مال کو ہونٹوں میں دیا کر لمبی سانس کھینچی۔

”پورہ چھ سات مہینے اس گھر میں رہی تھی۔ کسی نہ کسی سے تو رابطہ کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ شاید بے

تی نے تم سے کبھی ذکر کیا ہو؟“  
”ایسی اوھلیوں (گھر سے بھاگنے والی) کے پیچھے کون آتا ہے۔ عاشق چار دن دل خوش کر کے پھوڑو جاتے ہیں۔ اور وارث و تھوڑے نکالیں تو گانا آتا رہتے ہیں۔“ آئمہ اور یوسف کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ چھوہاں کی توجہ ان کی جانب منتطف ہوئی تو اس کے ماتھے کی کھریوں میں لہری پیرا ہوئی۔ حنے کی نکالی کو



منشی میں کچھ کر رہی ہوں۔ کچھ دیکھی رہتی تے کھے چنی بد ذات کہیں۔ کچھ کھی رہتی تے کھے چنی اداوے۔ تم بتاؤ جزی کے بوٹ سینو لیے کھانے لگیں تو وہ اللہ (دیلیس) بن جاتے ہیں؟ کسی کا اصل کبھی نہیں بدلتا۔ کالے منہ والی۔" تمباکو ملے تھوک کے چھینٹے اس کے ہونٹوں سے اڑے۔ "کھوتوں کے گٹے بھاڑتی جوان ہوئی آمتہ اور آج مجھ سے مختار کر رہی ہے۔ امریکہ چلی گئی تو خون بھی بدل گیا۔ میں غریبی کسی پر زمینداروں کی وہی ہوں اک ات سیت (سجد) کے منبر میں گئی اور اک کمر کے فرش میں جزی۔ دونوں کا تیرا ایک جیسا نہیں ہوتا۔" ہوا کے تیز جھونکے نے گڑ اور تمباکو کی ملی جلی گڑوی منک اس کے تھنوں میں پھونکی۔ سب چھوٹاں سے کچھ پوچھا عیث تھا۔ وہ خاموشی سے سواک کرتا رہا۔

"ایک بات میں نے تمہیں کبھی نہیں بتائی۔ اس نے پتیل کی کی مٹھل پر اٹکی بھراتے ہوئے غور سے عمیر کو دیکھا۔

"تیرے تو تمہیں پتہ ہے کہ حکیم بیگم راقی کا نام کرتی تھی اور کبھی کبھی کوئی کہیں کرنے کے لیے مجھے بھی پالتی تھی۔ تمہاری ماں جب یہاں آئی تھی تو وہ بیٹ گراتا چلتی تھی۔"

سواک کا پھر نڈا عمر کے حلق میں چلا گیا۔ کھانٹے کھانٹے اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی بہت سی ایسی باتیں اس کے کانوں میں رننے لگی تھیں، جس کا مفہوم چاہے وہ سمجھ نہیں پاتا تھا مزلت کا احساس ضرور ہوا تھا بچپن سے لے کر اب تک وہ بچپن آئیر لفظوں، مٹھن اور گالیوں کا سامنا کرتا کیا تھا ہر اسے یاد نہیں تھا کبھی کسی ایک جملے سے اسے اتنی تکلیف پہنچی ہو۔

عشاء کی نماز پڑھ کر وہ لوٹا تو راوی کی طرف سے نم آلود ہوا جلنے لگی تھی اور آکا وکا بادل بھٹکے ہوئے مسافروں کی طرح بدحواس سے یہاں وہاں بکھرتے تھے وہ اور پوسٹ چھل قدمی کے لیے نکلے اور ٹھلے ہوئے

بغلی کے کنارے تک چلے گئے۔

"عمر! تم کچھ وقت نکال کر گھر کی الیکٹرک وائرنگ سے ڈھنگ سے کروادو۔ رفتار بچر ضرور برتر پہلی فرصت میں خرید کر لے آؤ۔ ہم یہیے بچواتے کس لیے ہیں۔ آخر ماہی ضرورت کی چیزوں پر کیوں استعمال نہیں کرتیں۔ چڑیوں میں پھونٹیں مارنے اور کتوں میں سے پالی بھرنے کا دور گزر گیا۔"

I dont know whats wrong with her some times she acts really wierd

(میں نہیں جانتا ان کے ساتھ کیا مسئلہ ہے بعض اوقات ان کا رویہ بہت عجیب ہوتا ہے) وہ میاں بیوی حکیم بیگم سے ایسے ہی تالاں رہتے تھے۔

"منشی کے تیل والا چولہا تو میں نے بے بی کو پھینک دینے والا تھا مگر وہ استعمال نہیں کرتی اور رفتار بچر کا پوچھا تو اس نے منج کر دیا میں منشی فون کا کہہ رہی تھی کہ لکھو ایوں اور نہیں نے لکھائی تھی کہ دیا ہے۔" ایسے ہی کبھی صحت کو بوس کی تھوکت لگتا تھا۔ "ہاں سے منشی بار کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں لیکن وہ اس بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں۔ ہم سے زیادہ ان کا ساگون ہے اور اب انہوں نے ایک نئی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ صالہ اور اس کے بیٹے کو گھر میں رکھنے سے بے انہیں کسی سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔ اب اگر کچھ کہا جائے گا تو ان کا دل دکے گا۔"

عمر اس سلسلے میں کیا بول سکتا تھا۔ وہ خود بھی تو ایسی ہی ایک ذمہ داری تھا جو حکیم بیگم نے کسی سے پوچھے بغیر اٹھالی تھی۔

"خیر چھوڑو۔ تم نے امریکہ آنے کے بارے میں کیا سوچا؟ اس ملک کے تعلیمی ادارے یورپ اور امریکہ کے معیار تک پہنچنے میں کم از کم سو سال تو ضرور ہی لگا دیں گے مجھے معلوم ہے کہ تم بھی ماہی کی طرح جذباتی ہو۔"

لیکن کوئی Melo dramatic response اپنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا کہ تمہاری آنے والی نسلیں بھی اس فیصلے سے متاثر ہوں گی۔ تم ہا ہی بھرتو تو میں تمہارے کاغذات تیار کروا تا ہوں۔ چند ماہ میں تمہارا سسٹر بھی کھلیٹ ہو جائے گا۔

اگر کچھ عرصہ پہلے اس سے یہ بات پوچھی جاتی تو انکار کرنے کے لیے اسے ایک لمحہ بھی سوچنا نہ پڑتا لیکن اب بہت کچھ بدل چکا تھا۔ اس نے ہنس کے گھر سے بھروسے پائی میں قطعی رات کی سیاہی کو دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا تھا۔

اسے سگریٹ کی طلب محسوس ہو رہی تھی اور شاید ایک ٹھنڈے مار گرنے کی بھی۔ اس نے پوچھتی مرثیہ ریسٹ وارج میں وقت دیکھا تھا۔ گرانٹ کے کمرے سے کوئی آہٹ نہ آئی تھی۔ وہ یا تو سوچا تھا یا پھر سوئے۔ کھ لے لیٹ چکا تھا۔ کچھ عرصے سے پورے کسی اور دن کا پتہ نہ تھا۔ لیٹ کر گرا کر اٹھا۔ اس نے ہنسی بھرنا بھی تو کہہ دیا تھا۔ وہ ہر دم کھانٹتا ہوا کھانٹا آؤچی آواز میں بڑھتا۔ اپنے کمرے کی چار دیواری میں بند رہتا۔ اس کی ہر وقت مہو ہونے کے صوفیہ کے کمرے لٹکنے کے اور کائنات محدود کرنے پر تھے۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور بچرتوں سمیت چاؤ اور ڈھے بستر پر بیٹھی خاصی دیر سے ساتھ والے کمرے میں خاموشی چھاننے کی منتظر تھی۔ بظاہر تو حالات اس کے لیے سازگار ہو چکے تھے۔ تاہم تصدیق کرنا ضروری تھا۔ اگر اس کے جانے کے بعد گرانٹ اس کے کمرے میں بھانک لیتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ صوفیہ کی واپسی پر وہ اسے اندر رکھنے نہ دیتا اور تمام رات اسے فٹ پاتھ پر گزارنا پڑتی۔ سناگام اور گالی گلوں جس کے سوا تھے۔ وہ گریہ پائی سے چل کر گرانٹ کے کمرے کے دروازے تک پہنچی اور دروازے سے کلن چڑکا دیا۔ پھر اس نے دروازے کی ناک کو دیر سے غمناک ہاتھ کاٹا لٹکا دیا تو دروازہ مدھم چڑھا ہٹ کے سنا پڑا مکمل

گیلے بے اختیار اس کے جسم میں حسرتی دوڑ گئی تھی۔ کچھ اندھیرے میں بلیٹن اس کے سامنے ایک ہول تھا اور وہ یوں محسوس رہا تھا جیسے کھڑے کھڑے کھلی آنکھوں کے ساتھ سو گیا ہو۔ وہ لٹے قدموں واپس اپنے بستر پر چلی آئی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"کہاں جا رہی تھیں؟" گرانٹ کی بلغم زدہ آواز پر صوفیہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور اسے لگا جیسے وہ مدت بعد اسے دیکھ رہی ہو۔ وہ انتہائی دبا لگ رہا تھا۔ اس کے ہڈیاں کٹھنے آگے اور پیچھے کی سمت جھکے ہوئے تھے اور آنکھیں غیر معمولی حد تک بڑی نظر آ رہی تھیں۔

"میں بیچر گر لینے جا رہی تھی۔ لیکن میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" وہ نقاہت بھری آواز میں گرجا۔ "میں نے شام کو اسپتال چھٹی بنائی تھی میٹ باڈ کے ساتھ اور اور پر بی سائن بیچر اور ڈھمیلو سائن بھی ہے۔ ساتھ ساتھ ڈھمیلو سائن بھی نہیں لکھا سٹیں؟"

"یہ رسواں شام کی بات ہے۔"

وہ پچھ و پکھوئی ہوئی کیفیت میں سوچتا رہا۔ "تو شاید میں میں بھول گیا ہوں میں بھولے لگا ہوں۔"

"میں تم سے یہ ہی پوچھنے آئی تھی تو کیا میں جاؤں؟"

"ہرگز نہیں وقت کیا ہوا ہے؟"

صوفیہ نے ریسٹ وارج پر نظر ڈالی اور آتائے ہوئے لیجے میں بولی۔

"ابھی تک میں بھی نہیں ہے۔"

"تمہارے باہر قدم نکالنا تو واپس نہ آتا۔"

اگر اس کے پاس رہنے کے لیے کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ایسا کرنے میں خوشی محسوس کرتی۔

"یہ میرا گھر ہے اور اس میں وہ ہو گا جو میں چاہوں گا۔ اس وقت صرف آوارہ لڑکیاں باہر نکلتی ہیں۔ میں نے تمہیں آوارگی کی اجازت دے دی تو تم اپنی ماں جیسی بن جاؤ گی۔"



صوفیہ نے ایک خوبیل ساتس بھری اور صوفیہ کنٹرول اٹھا کر ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ اس کے بعد گرانٹ جو کچھ کہتے جا رہا تھا وہ اسے ازرق تھا۔ کچھ دنوں سے وہ یہ تقریریں سے بچی ہوئی تھی۔ اور آج صوفیہ اسے دعوت دے بیٹھی تھی۔ اب نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اس تمام کارروائی سے گزرنا تھا جو ایک عرصے سے ان کی روزمرہ زندگی کا جزو بن چکی تھی۔

”میں نہیں آؤں۔ چھوڑ دوں تو تمہارا انجام بھی اسی ماں جیسا ہو گا۔ تم نے اتنے سال اس عورت کے سامنے میں گزارے ہیں۔ تمہارا ذہن کچا تھا۔ لیکن صحبت کا اثر تو جانوروں پر بھی ہوتا ہے۔ وہ بھولی تھی اور تم بھی سمجھتے ہو تھی۔ اس نے میری دنیا برباد کر دی اور تم میری آخرت برباد کرنے پر تلی ہو۔“

صوفیہ نے ٹیلی ویژن کا ایوم بڑھا دیا تھا۔

”تم سمجھتی ہو میں تمہیں اس جیسا بن جانے دوں گا۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مرتے دم تک ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ تصور کرو وہ جسم فروشی کرتی تھی۔ تم بھی یہی کر رہی آ کر میں تمہیں نہ روکوں۔ خون اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے اور تمہارے جسم میں وہی گندہ خون ہے۔ وہ کسی آوارہ دنیا سے بھی بدتر تھی۔“ گرانٹ کی آواز لفظ یہ لفظ بلند ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ٹیلی ویژن کا ایوم آخری حد تک اونچا کر دیا۔

”میں اس سے نہ ملا ہوتا تو میری زندگی مختلف ہوتی۔ اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ مجھے میری محبت سے محروم کر دیا۔ وہ لڑکی ڈیزیز کا پھیل تھی۔ خالص اور معصوم۔ ایسا مجھے اس سے دور کر دیا۔“ اس کے کانوں تک آواز پہنچانے کے لیے گرانٹ کو چننا پڑ رہا تھا۔ اچانک وہ خاموش ہو کر ہانپنے لگا۔ کچھ دیر تک خالی خالی نظروں سے ٹیلی ویژن اسکرین کو گھورتے رہتے کہ بعد وہ آگے بڑھا اور سوچا پینل پر ہاتھ مار کر برقی روک منقطع کر دی۔

”وہ کیسی شرمناک موت مری تھی۔“ اس نے ہنسنے لگا۔ ”میں سلسلہ کلام پھر سے جوڑا۔“ اس کا عذاب تمام نہیں ہوا۔ وہ بھل رہی ہو گی۔ تاہم جتنی

رہے گی۔ خدا نے بوکھڑوں کی یہ ہی سزا مقرر کی ہے۔ تمہیں سب سے خوف نہیں آتا صوفیہ! کیا تم بھی اپنی ماں کے پاس چشم میں پینچنا چاہتی ہو؟“

اسے بے اختیار ہنسی آئی۔ جس جسم میں وہ زندگی بسر کر رہی تھی کیا اس کے سوا کوئی اور جسم بھی اس کا منتظر تھا۔ وہ اپنے میل فون پر ٹیم کھینے لگی۔

”خدا کے ٹیکو آواز مت دو۔ جسم فروش پوروں جیسا جاوے گا کہ تم چوری چھپے گھر سے نکل رہی تھیں۔ میں تم پر نظر نہ رکھوں تو تم آوارہ لوگوں کے ساتھ آزادانہ گھومو گی۔ پارٹیاں، رقص اور ٹائم کلپنگ تمہارے گناہوں میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔“

وہ کوہلوں پر ہاتھ رکھے یوں جھکا ہوا تھا جیسے بے تحاشا تھک گیا ہو۔ اس کی آواز میں ہتھت بڑھ چکی تھی۔ ”تمہیں روکنے کے لیے مجھے جس بھی حد تک جانا پڑا میں جاؤں گا۔ تم میری نجات ہو اگر ایک گناہ گار مان کی اولاد کو میں گناہ سے بچاؤں تو خدا مجھے سنت۔“

صوفیہ نے اس کے منہ سے سرخ پہلے اڑنے ہوئے دیکھے۔ اس نے اسٹین سے اپنا منہ صاف کیا اور کف پر تلے والے لال دھبے خون کے سوا کسی شے کے نہیں تھے۔ صوفیہ کو اس کے کان کی کیا بہانہ بنا ہٹا ہٹا زرد لہرا سرخ ہاتھ ہوا آبلہ بھی دکھائی دیا۔ ایسے ہی کچھ چھالے کچھ روز گزرے اس کی جینوں کی پشت پر دیکھ چکی تھی۔ وہ روز بروز گھٹاتا ہوا جا رہا تھا۔ صوفیہ اب اس کی چھوٹی ہوئی اسیاستعمال کرنے سے کہتا رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ واؤ کائی آؤ بھی بولیں جو اس نے ہاتھ روک کر بگنٹ سے نکال کر اپنے بید کے گدے تلے چھپائی تھی اسے واپس اسی جگہ رکھ دے۔ کیا خبر گرانٹ نے اپنے کو اپنا غلطی منہ لگایا ہو۔

صوفیہ کیم ہارٹی تھی۔ اس کا مہو پٹ گیا تھا۔ اس نے دوبارہ کھیل شروع کیا۔

”تمہاری ماں کے گناہ ایسے رزبل ہیں کہ بیان کرتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ اس کی ماں کے فریب کے بارے میں بتانے لگا۔ کیسے اس نے

گرانٹ کو سکر چال میں پھنسا لیا تھا اور کیونکہ اس کی صحبت کو اس سے دور کر دیا تھا وہ کیسے مجبور ہوا تھا کیسی اذیت سے گزرا، صوفیہ کو ایک ایک لفظ معلوم تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی اسے ذہن نشین ہو چکی تھی۔ گرانٹ سیڑوں باریہ سب ہر اچکا تھا۔

گرانٹ کی آواز اب پر دیا ہٹ سے مشابہہ ہو چکی تھی اور قائلین پر لمبے گھٹنے اٹھائے ٹیڑھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس سے بالکل لاطعلق ہو کر میل فون میں ملن رہی۔ جب بولنے لگے گرانٹ کا گلا پینچ گیا اور وہ آٹھ مرتبہ بھی کھیل جیتنے میں ناکام ہو چکی تھی تو گرانٹ آٹھٹی سے اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ اس نے میل فون کو بیڈ پر زور سے شیخ دیا۔ اب تک اس نے جوتے نہیں اتارے تھے۔ اس کا رازہ تبدیل نہیں ہو سکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جب وہ بے قدموں گھر سے نکل رہی تھی تو گرانٹ کے فینڈ میں بیڑ بولنے کی آواز دروازے سے ماہر تک سنائی دے رہی تھی۔ وہ کوہلوں اور بوڑھی انت پت ہو کر جانے اس کے سالی ماننے جا رہا تھا۔

سڑک کا موڑ مڑتے ہی صوفیہ کو دور سے بیٹا کھی کے بل اچک اچک کر بے ہنگم چال پھٹا پھیل دکھائی دیا۔ وہ رک کر اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ ٹیبل اس کے پاس گھرنے کے بجائے سر جھکائے ہوئے خاموشی سے گزرنے لگا تو صوفیہ نے بازو سے تھام کر اسے روک لیا۔

”وقت نہیں ہے۔“ اس نے کندھا ہلا کر بازو چھڑو لیا۔

”کس کے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس نے بیبل کا کارڈر سے منشی میں جھک لیا۔

”وہ ناراض ہو گا۔ میں واپس گیارہ جاؤں گا۔ کچھ کاغذ لینے ہیں گھر سے۔“ منگل اتھولی غصے میں تھا۔

”اگر اتنی جلدی تھی تو وہ خود کھیل نہیں آ گیا۔ تم جیسے تیز رفتار آدمی کو کیوں بھیج دیا۔“

ٹیبل پھر سے جانے کے لیے کدھس لیا۔ ”بجانے

وہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔“

”تمہیں میری بات سناؤ گی۔ میں تمہیں اس کے بغیر نہیں جانے دوں گی۔ میں بہت ادا اس ہوں۔“

صوفیہ نے کار کچھ کاغذ کے کراسے جھکا دیا۔

”تم ادا ہو، رونا مت، میں تمہاری مدد کرتا ہوں۔“ اس نے اپنا ہتھ باندھ پتلون سے رگڑ کر صاف کیا اور پھر تشویش بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیالہ سہلانے لگا۔

صوفیہ نے کار کچھوڑ کر اس کا ہاتھ سختی سے ہٹا دیا تھا۔

”میں رو نہیں رہی ہوں۔ مودوں۔ اپنے گندے ہاتھ مجھ سے دور رکھو۔“

”ٹھیک ہے تم ادا نہیں ہو۔ میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تم گیارہ میں کرتے کیا ہو؟“

”ڈپٹس ریجنٹر میرے پاس ہوتا ہے۔ میں سارا حساب کرنا ہوں۔“

”تو پھر تمہارے ہاتھوں پر گریس کیوں لگی ہے۔“

صوفیہ نے اپنے بالوں میں ہر انگلیاں رگڑ کر ہاتھ کو سوکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں دو سرے کام بھی کرتا ہوں۔“

”اتھولی تمہیں منشی تنخواہ دیتا ہے؟“

”مجھے پتا نہیں۔“

”ایسا مطلب، تمہیں پتا نہیں؟“

”وہ خود اپنے پاس رکھتا ہے۔“

”کیوں؟“

”اسے پتا ہے۔“ ٹیبل نے سر کو زور سے ہلایا تھا۔

”وہ کہنے ہے کاغذات میں وہ تمہیں اپنا تنخواہ وار ملازم ظاہر کرتا ہے۔ تمہیں تنخواہ بھی نہیں دتا اور ٹیکس کے چند وار بھی چاہتا ہے۔“

”وہ میرا خیال رکھتا ہے۔“

”وہ تو میں دیکھ ہی رہی ہوں۔ اچھا سنا، تمہیں کیا لگتا ہے گارل میکارٹھی مجھ سے پیار کرتا ہے یا نہیں؟“



میل خاموش کھڑا پلکیں جھپکاتے لگا۔

”میں اس کی سب کمرل فریڈ سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں اور میں ان سب سے بہتر کہ طرح دار بھی ہوں۔ بس ایک چھوٹی سی منیبت ہے خدا نے اس کے دل میں میرے لیے پیار نہیں ڈالا۔ خدا نے دنیا کے کسی بھی شخص کے دل میں میرے لیے پیار نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ اس نے میری منگی ماں کو بھی اس خصوصیت کے بغیر بنایا۔ وہ میرے لیے اس دھلت کی طرح تھی۔“ اس نے میل کی جیسا کھی پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”فوس اور ٹھنڈی وہ تھے اس چھوٹی آدمی کے حوالے کر گئی جو تھے۔ لیکن خدا سے میں کچھ نہیں مانگوں گی۔ نتیجہ مجھے پہلے سے معلوم ہے۔ وہ نہیں دے گا“ اس نے کبھی تھے کچھ نہیں دیا۔“

میل نے پورا منہ کھول کر ہنسی لی اور خود کو آواز میں بولا۔ ”بہت تھک گیا ہوں“ مجھے شینڈ آرہی ہے۔“ شاید وہ بھول چکا تھا کہ اسے کیراج وہاں بیٹھا تھا۔ سو فیڈ نے اس کے ہتھکڑیا لے لے ہال گئی میں لے کر اسے چھوڑ ڈالا۔

”میری بات شور سے سنتے رہو“ آنکھیں مست بند کر دیا کارنل اس بد وقت شکل والی اندر سے دیواروں ملنے لگا ہوگا۔ ہیلڈ نے اس کی صورت دیکھ کر تڑپ کر لی۔ اس نے مجھے ایک فون بھی نہیں کیا۔ وہ اپنے ایک سو بیچاس bucks کے لیے ہی رابطہ کر لیتا۔ ایک آخری فون کال اور وہ کتابیں تمہیں ڈمب کر رہا ہوں۔ تم میری محبت کے قابل نہیں ہو۔ تم نے مجھ سے ذہت پر جانے کی قیمت کیوں وصول کی ہے میں تمہیں کوئی پیسہ کرنے لگا تھا، لیکن تم نے میرے جذبے کو بچا پانا ہی نہیں۔ تم بہت بڑی اتمق ہو اور میں گنتی۔“

میل آنکھیں موند کر جیسا کھی کے سارے جھونے لگا تھا۔ سو فیڈ نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر میدان ہوا اور پٹی پٹی آنکھوں سے اسے

دیکھنے لگا۔

”تمہیں میری بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ تم اتنے بے وقوف کیوں ہو۔ جانور بھی تم سے زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔“ اس نے ایک اور تھپڑ میل کے گل پر مارا۔ اس نے انگوٹھی پہن رکھی تھی جس کا نوکیلا سزا گھٹنے سے میل کی آنکھ کے نیچے والی جلد پھٹ گئی اور خون کی ننھی ننھی یوئیدیں چھوٹ پڑیں۔ وہ تکیف سے ہلکا اٹھا تھا۔

”بچھہ مارو“ مجھے درد ہوتا ہے۔“ وہ سہم کر چند قدم دور صٹ گیا۔

”تمہیں درد کی سمجھ آتی ہے۔ درد کی سمجھ سب کو آتی ہے“ تمہیں پتا ہے رات کے اس پہر تم میرے سامنے کھڑے بے چاروں کی طرح کیوں رو رہے ہو۔ یہ خدا کی مرضی ہے وہ چاہتا ہے کہ تمہیں درد ہو۔ وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس نے تمہیں سفید فاسوں کی دنیا میں کلا بنایا۔ تمہاری اس دنیا میں کسی کو ضرورت نہیں تھی پھر بھی خدا نے تمہیں منگی کھی مٹی سے بنایا اور تمہیں یہاں بیچ دیا صرف تمہارا تمہارا کچھ ہے۔ تم اتنے بد صورت ہو کہ کسی بھی شخص سفید فام کو تمہاری صورت دیکھ کر مٹی ہو سکتی ہے۔ اس نے تم سے تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی پھینک لیے اور تمہیں مٹھو کر دیا تاکہ تم زمین پر ریختے چھو ستمزیک کر سکو۔ Laudscr (ایک براہ جہرا لکنا) بھی تم سے بہتر زندگی گزارا ہے۔ اس کی ماں کو کہ از کم اٹھیلی جیسی بے حس نہیں ہے۔ وہ اس کو شیپو سے شکاری ہے۔ اس کی جسم میں کتنی کھلی گئی ہے اور اس کے پسینہ بھری ہتھکڑیاں سے کھلانی ہے۔ لیکن تمہیں تو اتھنی نے بھی پچکارا تک نہیں اور یہ سب خدا کی چاہت ہے۔ میل۔“

وہ لب چپکچپوں سے رو رہا تھا۔ ”وہ مرنے کے بعد بھی تمہارے درد میں کسی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے تمہارے لیے جہنم وہ کار کھا ہے۔ جب تم نے جہنم میں ہی جانا ہے تو تم گناہ کیوں نہیں کرتے“ کچھ ایسا کر جاؤ کہ تمہیں جہنم میں جھٹنے پر

کچھ تارا نہ ہو۔ کسی کو جان سے مار ڈالنے کے بارے میں کیا خیال ہے انٹھنی کو پھر مجھے ایک ہی بار بھڑک کر کچھ سمجھو جاؤ۔“ وہ مں کی طرح کیوں سکتے ہو۔“ بلکنا ہوا میل مڑ کر جانے لگا تو سو فیڈ نے اس کی واحد پنڈلی پر زور سے ٹھوکری۔

”جیسے جاؤ نگر اور کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا۔ تمہیں وہ کچھ کر مجھے گھن آتی ہے۔“ وہ چلا کر بولی تھی۔



اس رات وہ تین بجے کے بعد بار سے لوٹا تو جھنک سے چور تھا۔ وہ Bar back کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور اس کی ڈیوٹی آخری شفٹ میں تھی۔ لاسٹ کال کے بعد جس کا وقت رات دو بجے مقرر تھا اور جس کے اعلان پر آخری گاہک کو بھی رخصت کر دیا جاتا وہ بار شیڈز کے ساتھ مل کر ٹوٹی ہوئی بوتلیں گلاسوں کا کچھ اور تلف کیے جانے کے لائق کارکنوں کو پلاسٹک کے ٹھیلوں میں جمع کر کے ڈمب سٹر میں جان استعمال شدہ گلاسوں کو دھو کر وہاں خشک ہونے کے لیے پھینک دیا۔ اس وقت گھر پر فرش پر بیٹھے ریز سٹ جو بیٹھو اور ٹاک ٹیلڈ کرنے سے پیب دار اور متعفن ہو جاتے تھے انہیں دھونے کے بعد فرش کی صفائی کرتا اور آخر میں باری سٹ اور میز صاف کر کے اسٹے دن پہلی شفٹ کے لیے تنظیم قائم کر دیتا۔

اس بے زار کو دینے والی مشقت سے روزی ان کا بدن اور ذہن کئی اٹکار کرتے تھے پھر آج معمول سے بڑھ کر کچھ ہوا تھا۔

اس کی شفٹ کا آغاز ہی ہوا تھا کہ وہ نو جوان لڑکوں نے جو شاید آزمودہ کار نہ تھے ایک پیٹ کے وہ وہ گلاس بننے کے بعد میز اور فرش پر تے کر دی تھی۔ اس سے دل تھی اس فرش پر سے یہ لٹکی صاف کرنا پڑی تھی۔ لیکن ایسا پیشہ یار خالی ہونے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ اس نے لوگوں کی بھیڑ میں کبھی یہ روزیل کام نہ کیا تھا۔ لیکن آج وہ مجبور ہو گیا تھا۔ ساتھ والی میزوں پر بیٹھے لوگ اٹھ کر گوشوں میں سٹ گئے تھے اور چند

افراد بار سے باہر جانے والی راہ بھی اپنا رہے تھے۔ اسے سب کی موجودگی میں گھنوں کے بل بھٹک کر سر کندھوں پر گر کر وہ غلاقت صاف کرنا پڑی تھی۔ وہاں کسی نے بھی اس کی کیفیت کو محسوس نہ کیا ہو گا۔ مگر وہ ان لمحات میں خود کو دنیا کا سب سے حقیر آدمی سمجھ رہا تھا۔

بار منٹ کے دروازے پر گئی کال ٹیل بجانے کے بعد ایک لمبے کا توقف کیے بغیر وہ دروازے کو کھینچنے سے پہلے لگا تھا۔ اس کے پاس دروازے کی چابی تھی لیکن رائن نے اندر سے یوٹ چڑھایا ہوا تھا۔ پانچ منٹ تک مسلسل دروازہ بجانے پر بھی جب کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے دروازے کو ٹھوک مارنے کے لیے پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ رائن نے آنکھیں مچھلاتے ہوئے دروازے کا پت ذرا سا اوکھا۔ اس نے رائن سے کچھ بھی کہے بغیر اندر جانے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ زبان کھولنا تو ہوائے گالی کے کچھ پر آمادہ ہوا۔

”کوہ تم اندر نہیں آسکتے میری بات تو سن لو“ سو فیڈ نے اسے آواز دے کر آواز میں بولا اور ہانڈ صوڈ کر اس کی چھاتی پر رکھتے ہوئے اسے اندر جانے سے روک دیا۔

”رائن! میں تمہیں سمجھتی ہے بتا رہا ہوں کہ اس وقت میرے ساتھ اٹھنے کی غلطی ہرگز نہ کرنا میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔“ اس نے رائن کو دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔

”وہ سوزن آئی ہوئی ہے وہ تمہاری صحت کو بالکل پسند نہیں کرے گی۔ بہت نفیس طبیعت کی ہے۔ تم سے بڑی آدمی ہے۔ تم کار میں کیوں نہیں سو جاتے“ رائن سوئی جاگی کیفیت میں بول رہا تھا۔

احمد کا بچی چاہا کہ وہ رائن کا دم کھوٹ کر اسے مار ڈالے اور اس نازک طبع سوزن کا سر گلہنگی سلوشن سے بھینکے ہوئے اپنے بھاری جوتوں سے چلنے کے بعد غصی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر اس اذیت ناک زندگی کا انتقام کر لے۔

اس نے سخی بھیج کر رائن کے ماتھے پر ضرب لگائی



مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری ماں کو قوی بنا کر دو اور عورت تھی۔ کیا کہنے! میں کسی روز تمہیں جان سے مار دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتا میرا سامان باہر نکال دو میں ابھی کہیں اور چلا جاؤں گا۔"

رائن چند لمحے اپنا ماتھا سماتا رہا پھر سہانہ نیند بھرے بچے میں کئے لگا۔  
"بار بیک ہونے کا یہ ہی ایک فائدہ ہے کہ مفت ڈور کس لٹی جس میں نے برا نہیں مانا۔ مجھے معلوم ہے تم نشے میں ہو۔ تمہاری ان باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ کار کی چابی تو تمہارے پاس ہے۔ صبح جلدی اٹھ جانا۔ مجھے دس بجے وارنر برادرز اسٹور ہوز جانا ہے اور میرے کئی موٹے نہیں مل رہے۔ شام سے ڈیوٹیز رہا ہوں۔ تم نے تو نہیں دیکھے۔ وہ رائل پلیئر رنگ کے ہیں۔" سر کھجاتے ہوئے غر کر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

کچھ دیر اجہرا کھڑے ہوئے، روغن والے ہنر دروازے کو جاتی آنکھوں سے ٹھوڑا رہا اور پھر دروازے پر لگا ہار ٹھوکریں دینا شروع کرنے لگا۔ سامنے والے ایئر منٹ سے خمدہ گمروا ڈونڈلہ آنکھیں ملتا ہوا نکلا تھا اور کچھ گالیاں ہنسنے کے بعد وہ بارہ اندر عائب ہو گیا تھا۔

غبارت کے بارنگ لائٹ کی چمکن زد فضا میں اسے سخت گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کار کو باہر سڑک پر نکال لایا اور سمت کا تعین کیے بنا رواں ہو گیا۔ رائن کے ان دھلے پرائل بلبوگ کی موڑ سے اسے پہچر سویت کی گلدی پر ٹیک مین چار میں گھمبے ہوئے مل گئے تھے۔ اس نے چار سویت انہیں کھڑکی سے پار فرٹ پاتھ پر اچھال دیا تھا۔

رائن کے ساتھ مزید ایک دن بھی گزارنا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔ وہ غلیظ لاروا ہے جس اور ڈھنکی کی حد تک بے شرم تھا۔ ہنسنے میں ایک یا دو بار احمد کو ضروری کار میں رات بسر کرنا پڑتی تھی۔

اور رائن کے طرز زندگی سے نہایت عازرہ آچکا تھا اور کب کا اپار منٹ چھوڑ کر چایکا ہوتا۔ اگر اس کے پاس کوئی بھی مستقل مقابل ہوتا، پھر رائن کی کار استعمال کرنے کی سہولت سے دستبردار ہوتا بھی ایک مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ رہائش سے بھی زیادہ اہم تھا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی میں سے تھوڑا تھوڑا پس انداز کر رہا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ آٹھ آس ماہ تک ایک سیکنڈ ہینڈ واگس ویگن خریدنے کے قابل ہو جائے گا۔ اور شاید اس دوران کسی فلم کرشل یا ٹیلی ویژن سیریل میں کوئی رول مل جائے اور پارٹی ٹور کی کو ترک کرنا۔ سوچتے ہوئے اس نے خود کو نوک دیا تھا۔ وہ پھرت ناممکن کو ممکن شمار کر رہا تھا۔ اس کی خوش فہمیوں کی عمر تمام ہوتے ایک مدت بیت چکی تھی۔ پر امید جانے کیوں ایسی سخت جان تھی کسی طرح دم توڑتی ہی نہ تھی۔ سٹیشن، کبھی وہ دم چلتی، کبھی بھڑک اٹھتی، لیکن بچنے کا نام نہ تھی۔

اپنی سوچوں میں ہم ایک چوراہے سے کار موڑتے ہوئے اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسٹریٹ اور آنکھوں کے نیچوں سے ان حرکت کئے شہرارت چھوٹے ہوئے۔ اس نے شدید جھکا کر سنا اور جسم کو کھٹنے والے دھچکے سے بے ساختہ اچھل کر اسٹیرنگ ویل کے اور بجائی کے بل گرا۔ نشست سے جدا ہوتے ہوئے اس نے سر اور کندھوں کی پشت دھاتی چھت سے ٹکرائے تھے۔ خاصی دیر وہ کسی موڑے کی طرح بے حس و حرکت اسی حالت میں پڑا رہا۔ جب ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو اسے دھیرے دھیرے کچھ میں آگیا کہ کبھی گاڑی نے اس کی کار کو عمیق سمت سے ٹکر ماری تھی اور کار جو نہایت ست روی سے ٹپل رہی تھی سڑک سے اتر کر ایک درخت کے تنے سے ٹکرانے کے بعد رک چکی تھی۔ وہ آہستگی سے سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنے جسم کو ٹٹلے ہوئے چوں کا جائزہ لینے لگا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہی لگ رہا تھا۔ اسے اتھے اور ہاتھوں پر ہلکی خراشیں تھیں۔ پیسیلوں، گردن اور گھٹنوں میں درد کا احساس تھا۔ مگر وہ رات کی حد سے

اٹھاؤ نہیں ہوا تھا۔ گاڑی کی وینڈر سکریں اور ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ پچھلی نشست بھی ایک طرف سے تدرے پچھلی ہوئی نظر آتی تھی۔  
پچھروہیاں اس کی جانب منتقل ہوا جو اس حادثے کا باعث بنا تھا۔ اس کا ذہن واضح نہیں تھا کہ غلطی کس کی تھی، لیکن بہر حال اسے عقب سے دھکیلا گیا تھا تو غالب امکان یہ ہی تھا کہ نقلت دوسرے فریق نے دکھائی تھی۔

وہ نیچے اترا کار کو لاک کیا اور کسی قدر نظر ڈال کر چلنے لگا۔ کچھ دور فٹ پاتھ پر پرانے ماڈل کی کمرے سرخ رنگ کی کار آڑھی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا گلا فینڈر اور ایک ہیڈ لائٹ نوٹ کر چھوٹے لگے تھے۔ نوٹ کا کوئی بھی اندر دھک گیا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کھڑکی کے شیشے سے اندر جھانکنا اور شیشے پر انگلیوں سے دستک دی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس نے ڈور ہینڈل پکڑ کر باہر کی جانب پھینچا تھا۔ دروازہ لاکڈ نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر سرخ پائوں والی لڑکی سر جھکائے خاموشی سے سائت چمکی تھی اور کار میں وہ کھڑکی پر کھڑے کئے گاڑی کے اسے حیرت کرنے کی کوشش کی لیکن شاید وہ اب تک مدد کی کیفیت میں تھی۔ کبھی بار پلندہ آواز میں پکارنے پر بھی کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ پھر جب اس نے لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا سا دایا تو وہ یوں متحرک ہو گئی جیسے اسی بات کی منتظر تھی۔ وہ اچانک جھپٹے ہوئے اپنے نکلے ہاتھوں سے احمد کے بازوؤں کو بری طرح کھسوتے لگی تھی اور اگر وہ فوراً دور نہ ہوتا تو شاید اس کی نگاہیں اہولمان ہو چکی ہوتیں۔

"یہ کیا ہے ہو گئی ہے تمہیں احساس ہے تم نے کیا کیا ہے؟ اور مجھے معذرت کرنے کے تم مجھے مزید جوت پہنچا رہی ہو۔ اگر میری کار درخت سے بھڑک کر رکتی نہیں اور لٹ جاتی تو شاید میں مر ہی گیا ہوتا۔ تم نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" وہ سخت دلچس کی حالت میں اسے برا بھلا کہنے لگا تھا اور

جواب میں اس کی کھلمکھلائی تھی من گھڑاکت ہو گیا۔

وہ گاڑی سے اترنے کے لیے کسی ٹیوب کی طرح ڈبل کرا تھی۔ پہلے ایک ٹانگ باہر نکالی اور دو تین بار زمین کو پاؤں سے چھوئے کے بعد۔ ہنچکے ہوئے نیچے اترتی۔ وہ ایک زبردور اور ذات لڑکی تھی۔ اس کے پتے ہونٹوں پر لگی گہری لپ لپ انگ کھڑی ہوتی تھی اور ہونٹوں کے گوشے کیلے سے نکلتے تھے۔

"cops کو مت بلانا مجھے ان سے نفرت ہے" نہیں نفرت نہیں ڈر لگتا ہے پولیس کار کو دیکھنا تو تو میں بھاگ پڑی۔

وہ مجھے breath reath breth liser میں سانس لینے کو کہتے تو پتا چل جاتا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کو گرفتار کر لیتے ہیں۔" اس کی باتیں بے ربط اور آواز لڑکھاہٹ زدہ تھی۔  
breathalyzer کہنے کے لیے اسے بہت جلد جھڑکنا پڑتی تھی۔

"ہیرین ہیڈ سیر سے ساتھ یہ ہی کرنی ہے مجھے" سیرت پاتھ تو نہیں گلاب رہے، دیکھنا تو انٹور سے دیکھو لیکن وہ ہیرین نہیں تھی شاید جن تھیں لیکن بھی نہیں "رہم رورم اور وہ مفت تھی۔ بالکل مفت ایک بھی سینٹ فرج نہیں ہوا۔" وہ ہنسنے لگی اور ڈنگاتی ہوئی احمد کے پاس آئی۔  
"مجھے فینڈ آتی ہے میں تمہیں پکڑ کر سوؤں گی، ورنہ گر سکتی ہوں۔"

اس نے پھر لڑکی کو برے دکھایا دیا تھا۔  
"میں تمہیں خود پولیس اسٹیشن لے چلا ہوں۔ تمہارا نشہ وہ لوگ ایک منٹ میں اتار دیں گے۔ تم جیسے لوگوں کو جیلوں میں ہونا چاہیے۔ سڑکوں پر آزاد ٹھونسنے کے لائق نہیں ہو تم۔"  
اسے مسلسل ہنسنے پکارا احمد نے ہوش بچھین لینے تھے۔ اس لڑکی سے اچھے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بات کو صحیح مفہوم کے ساتھ سمجھنے سے قاصر تھی اور احمد سوچ رہا تھا کہ اس معاملے سے کیسے نمٹے۔



ایسے اپنے جسم اور کپڑوں سے شرابہ کی بو آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اور ناز و نور نہ کیا تھے نیز منہک والے سے صدف کے مگلوں سے سے ہوئے تھے۔ وہ ایک بھر پور ٹیکس کی شہرہ خواہش محسوس کر رہا تھا۔ بے خوابی کے دور سے اس کی آنکھیں بھلستی تھیں۔ اس کا مضمحل بدن ایک آرام دہ بستر تانگ رہا تھا۔ اور ایسے میں پولیس آفسرز کی کڑی نگاہوں اور چبھتے ہوئے سوالات کا سامنا کرنا اسے نہایت نامسندیدہ خیال لگ رہا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر ہمیشہ ہی پولیس سے کتر یا کر رہا تھا اور اس ذہنی اور جسمانی کیفیت میں تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

”تمہارا برس کہاں ہے؟“ نے اسے کدھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ”اس میں کتنی رقم ہے؟“ ہمیں تمہیں صرف اس صورت میں جانے دوں گا کہ تم مجھے گاڑی کا ڈرائنگ کاشیاں کا خرچ فراہم کرو۔ ورنہ دوسرا راستہ سیدھا پولیس آفیشن کو جانا ہے۔ بلکہ جانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ میں cops کو کہیں بلا لیتا ہوں۔“ اس نے لڑکی کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس کے منہ پر ایک چھچھری مار رہا تھا۔

”مجھے بے وقت سمجھتے ہو۔ لاکھوں جبرے دیاں کو بند نہیں کرتا۔ میرے شعور کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ زیادہ چالاک مت بنو۔ میں سویر ہوں۔ مجھ میں ایک ٹانگ پر کھڑی ہو سکتی ہوں۔“ وہ اصرار کا اندھا پکڑ کر لگتے ہوئے ایک پاؤں اٹھانے کی سر توڑ کوشش کرنے لگی۔ ”تھپتھپ کا اس پر تپ برابر بھی اثر نہ ہوا تھا“ اور وہ مسلسل اول فونل بے جا رہی تھی۔ جھنجھلا کر احمد نے اسے زور سے دھکا دیا۔

”میں تمہارے برس کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے نقصان کی قیمت چاہیے بلکہ تم رہنے دو۔ میں خود ہی لے لیتا ہوں۔“ اس نے ڈرا سیورانی طرف کے کھلے ہوئے دروازے کو دھکیلتے ہوئے بند کیا تھا۔

”میں cops کو بلاؤں گی۔ تم خاتم ہو۔ میں تمہارا

ڈرائیونگ لائسنس کینسل کرواؤں گی۔ ایک پولیس آفسر میرا دوست ہے پر شاید ایسا قدم میں اٹھائے یا نہیں آ رہا۔“ وہ کھنٹوں اور کھنٹیوں کے بل رہ سکتی ہوئی اس کے پیچھے آنے لگی۔

”میرے برس میں بہت مزے دار چیزیں ہیں۔ میں تمہیں بھی دوں گی۔ تم رکھی ہو۔ تمہیں تم بھولنے کی ضرورت ہے۔ دو دست۔ میں تمہیں دوں گی۔ جاو کی چیزیں۔“ اس نے احمد کے پیروں کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھے بیٹھے بازو لہا کر کے ڈرائیو سٹ کے نیچے سے ایک ایئر پوزیک نکالا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک درمیانے درجے کی بیل جو کبھی قسم کے لیبل سے عاری تھی۔ نکال کر احمد چھوڑی تھی۔

”مجھے یہ تمہاری آمد رو ہے۔ دو دست ہے۔ سب کی دو دست ہے۔“ احمد نے چند لمحے سوچنے کے بعد بول کاؤ حکم بنایا اور دہانے کو ٹانگ سے قریب کرتے ہوئے منہ نکھلا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے بول میں سے ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ ذائقہ نہایت سٹح تھا۔ اسے جھکن میں شدید ملن محسوس ہوئی۔

لڑکی ہسپانوی میں مسلسل کچھ بڑبڑا رہی تھی لیکن احمد نے اس کی آواز بڑھیاں نہ بنا جہد کر دیا تھا۔ ایک دھندلی تھی جو اس کے جواس پر غلاف کی طرح چلپ رہی تھی۔ اچانک اسے ہنسی آئی۔

”تم نے رائن کی کار تو ڈری۔ اچھا گیا۔ میرا بول بھی یہی کرنا تھا۔ تو ڈری تمہے نے تو ڈری۔ تو ڈری۔ سب کچھ تو ڈالا۔“

ساتھ والی سیٹ پر مائیکس پیار کر بیٹھی ہوئی لڑکی کے سر پر دھبہ مار کر وہ اسے گالیاں دینے لگا۔ وہ ان سب لوگوں کے نام جن کی طرف سے اسے زلت سہنا پڑی تھی یاد کر کے انہیں گالیاں دینے لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اسے ایسا کرتے ہوئے مزہ آ رہا تھا۔ اس

کے اندر ایک بے عنوان خوشی پھیل رہی تھی۔ بول میں اٹکول کے سوا جانے کیا تھا کہ اس کا سر گھومنے لگا تھا اور جوتوں میں مقید اس کے پیروں کے انگوٹھوں میں سنسناسٹ ڈوڑھی تھی۔ اس نے لڑکی سے کہنا چاہا کہ اسے تندر آ رہی ہے اور وہ لیننا چاہتا ہے لیکن اس سے کہا ہی نہیں گیا۔ وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ اس سے زبان بھی ہلائی نہ جاتی تھی۔ وہ لڑکی تو ہسپانوی بولے جا رہی تھی اور احمد کو اس زبان سے خاص واقفیت نہیں تھی۔ اس سے کچھ کہنے کا فائدہ ہی کیا تھا۔

بہت بہت بہت

اس کی آنکھوں پر اتنا بوجھ تھا کہ اسے پونٹے کھولنے کے لیے سخت مشقت کرنا پڑی تھی۔ پلکیں ذرا سی جدا ہونے پر اس نے دوبارہ آنکھیں میچ کر لیں۔ روشنی کسی تیز و ہار جاتو کی الٹی تھی جو اس کی پلکیوں کو چیر رہی تھی۔ اس کی پلکیاں درو سے بھری ہوئی تھیں۔

پلکوں کے اندر سے نیچے اترنا چاہا اور لڑکھڑا کر فرخ پر دھیر ہو گیا۔ اسے الٹی آ رہی تھی۔ سقے کرتے ہوئے اس کے بدن کے سارے مساموں سے بیٹ بیٹ برا اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ کاٹس اپنے باول میں محسوس کیا تھا۔ وہ سرخ باول والی ہسپانوی لڑکی تھی۔

وہ اس کے ساتھ گھسٹا ہوا ایک ادھ کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پاؤں بے حد دنی تھے اور اس میں لٹکا کر زمین پر دھرتا ایک صبر آزما کام تھا۔ وہ کہہ دراصل ہاتھ روم تھا۔ ٹکوں سے گرا ہوا پانی نہایت پر شور آواز کے ساتھ ہاتھ ٹپ کے دلخ دار پینڈے سے ٹکرا کر چھینٹیں اڑا رہا تھا۔

لڑکی نے قوت کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے اس کا سرٹ ٹھنڈے پانی کی موٹی دھار سے دبا دیا تھا۔ اس کا سانس لٹنے لگا۔ اس نے خود کو آزاد کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے اعضاء میں مزاحمت کی حرکت ہی

نہیں تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے کھولے ہوئے گرم پانی کو اپنے سر پر ڈالنا ہوا محسوس کیا تھا۔ اس نے ہاتھ پاؤں مار کر اپنا سر پانی کے ٹپے سے نکالنے کی ایک اور سٹی کی۔ کچھ پانی اس کے کھلے ہوئے منہ اور ناک کے ذریعے حلق میں بھی چلا گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اس نے گردن اور سر پر سے ہاتھوں کا ڈباؤ ہٹے ہوئے لیا تھا۔ لڑکی نے توبے سے اسے خشک کرتے ہوئے پوچھا کہ وہ کیسا محسوس کر رہا تھا تو اس نے جواب میں کہا۔

”خاصا بہتر۔“ بیڈ پر دیوار کا سارا لے کر بیٹھے تک واقعی اعصاب کے بوجھل پن میں کمی ہو چکی تھی۔ اس کی کپٹیوں میں ہونے والا درد تقریباً ”مٹقا ہو گیا تھا۔ اور پونٹے پہلے جیسے بھاری نہ رہے تھے۔ گردن ڈھلا کر اس نے اس پاس نظر میں لکھا۔

وہ ایک مختصر اور بے ترتیب کہہ تھا۔ کھڑکی کے ذرا سے نئے ہوئے پردے کی اوت سے اس نے باہر اترتی شام کو دیکھا اور حیران ہوا۔ وہ کتنا وقت سویا رہا تھا۔ یا عروس رہا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا۔ رائن کو آج وارنر براؤن رائلٹیوں پوز جانا تھا۔ اس کے اور Swinger کے بل غائب ہو جانے پر وہ سخت گدگد میں مبتلا رہا ہو گا۔

جانے وہ لڑکی اسے کہاں لے آئی تھی اور اس حالت میں اس نے ڈرائیونگ کیسے کی ہوگی؟ ایک آواز سن کر اس کی توجہ کھڑکی کے قریب دیوار کے ساتھ رکھے گاٹ کی طرف متعلق ہوئی۔ ایک پتھر گاٹ میں لیٹا ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل ڈیڑھ دو ماہ ہوئی اور شاید وہ لڑکی تھی۔ اس کے نعوش سے ایسا ہی تاثر ابھر رہا تھا۔ تو وہ اس کے رونے کی آواز تھی۔ پھر احمد نے ہسپانوی لڑکی کو دروازہ کھول کر اندر آنے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کالج کا گلاس تھا جس میں اس کے باول کی رنگت سے مٹا جیسا لال بھرا ہوا تھا۔

”اسے پی لو۔“ احمد نے ہاتھ جوھا کر گلاس لے لیا تھا۔ ”لیا ہے یہ؟“ ”بلڈی میری لڈا کا اور نمائز کے رس پر جی ایک کاک ٹیل کسوجو مت۔ پیگ اور (کثرت شراب



توشی کے بعد پیدا ہونے والی نشیاتی وجہیاتی کیفیات ہیں اس سے بڑا افتادہ ہوتا ہے تم بس خاموشی سے بی جاؤ تمہیں اچھا لگے گا۔"

"ہمارے دو زمان جو یکجہ بھی ہوا۔ میرا اس میں کوئی وہ شامل نہیں تھا۔ اگر میرا ذہن صحیح کام کر رہا ہو تو میں یہ کبھی نہ ہونے دیتا۔" اس نے وضاحت کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"وہ اسٹوکر کے بعد اس نے کسی بھی لڑکی کے نزدیک" اس نے غلطی نہیں کی تھی۔

"تم میرے لیے desconocido نہیں ہو۔"

"میں کیا نہیں ہوں؟"

"اجتم اپنی نہیں ہو۔ میں نے پچھلے سال تمہیں ساخا کلاز پریڈ میں دیکھا تھا۔ اور تب میرے سر Jeros (محبت کا یونانی یونان) کا پیمبر معلق تھا۔"

اس کے محبت بھرنے پر اس کے سامنے میں بھی۔ اس نے موہ کا بیان کچھ پر آزمایا۔ میں تب ہی تمہاری محبت میں پھنسا ہوئی تھی اور اس وقت سے تمہیں ڈسٹوئی پھر رہی ہوں۔ میں نے تمہیں ہالی وڈ لیوڈ اور اس

سٹٹ بلوڈ کے آس پاس کے علاقوں میں بہت تلاش کیا لیکن تم ملے ہی نہیں اور آج قسمت نے ہمیں خود ملا دیا۔ میں بہت خوش ہوں۔"

چاہے احمد اس وقت بھی ملڈی میری کے دیے ہوئے شمار میں تھا لیکن اسے بالکل بھی شہ نہیں تھا کہ لڑکی کی بات صحیح ہو سکتی تھی۔

"میں پچھلے سال کرسمس پریڈ میں نہیں گیا تھا۔" اس نے ترویج کی۔

"تو اس سے پچھلے سال گئے ہو گئے محبت میں وقت کا حساب رکھنا تمہیں ہی کہاں ہے۔" اس نے اپنی ابھری ہوئی ہنسی کی ہڈی کو اٹھیلوں کی پوروں سے چھوٹے ہوئے کہا تھا۔

"میں کبھی بھی اس پریڈ میں شریک نہیں ہوا۔ کسی بھی سال نہیں۔"

"تو پھر وہ تمہارے جیسا کوئی ہوگا لیکن۔" اس نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ "تمہارے جیسا کوئی لوہے

ہو سکتا ہے تم تو صرف ایک ہی ہو۔ اور تم میرے ہو۔"

احمد گولگا جیسے لڑکی اب بھی نقشے میں تھی۔ وہ البا مارسلو تھی۔ کچھ سالوں قبل باہلو ناسے لاس اینجلس آئی تھی۔ احمد کی طرح اسے بھی اداکاری اور شہرت کا شوق تھا۔ صحیح لایا تھا۔ وہ چند غیر اہم فلموں میں ایک سٹرا کے طور پر کام کر چکی تھی اور اس کی بڑی ملاتی ملازمت ڈاؤن ٹاؤن لاس اینجلس میں ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور کے لیے ہانڈنگ کرنے کی تھی۔ لیکن کچھ ماہ پہلے کسی معمولی کوتاہی کو قیادینا کر اسے ہال کی حیثیت سے محروم کر دیا گیا تھا اور ان دنوں وہ صرف اپنے ایکٹنگ کیریئر پر دھیان دے رہی تھی۔ وہ بھی صوفیہ البانائی بہن کی بیٹی تھی جس کی پیدائش کے محض دو ہفتے بعد اس کے ماں باپ ایک دفعہ الیکسیلٹ میں ہلاک ہو گئے تھے اور اب اس کی ذمہ داری البانیا کے سپرو تھی۔

احمد نے سوچا تھا کہ البانیا اور اس کی بڑھتی stand one night ثابت ہوگی مگر اس کا قیاس درست نہیں تھا۔ آجی رات وہ سچے بارنڈر ایلیون کے جانے کے بعد جب وہ اکیلا ہی صفائی کا کام بنانے میں لگن تھا تو گارنٹو میں سے یا کسی پھل تلخیدہ کرتے ہوئے اسے

فرش پر گرتی اورچی اڑتی کی تک تک سائی دی تھی۔ اس نے ہر اٹھایا اور البانیا سے بار کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھنے کے لیے جھکتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ لمحوں کے لیے وہ ساکت ہو گیا تھا۔

"تمہیں یہاں کا پتا ہے معلوم ہوا؟"

البانے باؤل میں سے چیری کا خوشہ اٹھا کر منہ میں ڈالا اور اسے چہانے بغیر زبان کی مدد سے گل میں گھماتے ہوئے بولی۔

"تمہارا ڈرائیونگ لائسنس تمہارا آئی ڈی۔ تمہاری بار کا شمیری کارڈ سب کچھ تو تمہاری جیبوں میں تھا۔ پھر بھی پوچھ رہے ہو۔"

کھنیاں باؤ کی سچ پر رکھ کر وہ آگے جھکی اور تب احمد نے عین ادب جلتے ہوئے گلوب کی تیز روشنی میں دیکھا

کہ البانیا کے ہالوں کی اصل رنگت سرخ نہیں تھی۔ اس کی پیشانی کے قریب چند نیس بھوری تھیں۔ اس نے ہالوں کو برنگا ہوا تھا۔

"مجھے ایک بلڈی میری مل جائے گا۔ کاک ٹیلز میں سے سب سے زیادہ پسند ہے مجھے۔ لیکن میں اس کی قیمت ادا نہیں کروں گی۔ یہ ہاؤس کی طرف سے ہوگا۔"



اس رات کے بعد پڑا ناخہ ہرات البانیا میں آنے لگی۔ وہ "کلاسے کال" تک کسی میز پر بیٹھی اس کے فارغ ہونے کی منتظر رہتی۔ احمد ڈرکس سرو کرنے کے لیے جس طرف بھی رخ کرتا البانیا کی نظروں کو خود پر جتے ہوئے پاتا۔ چاہے اس کے پاس رکنے یا اسے مخاطب کرنے سے لیے احمد کو ایک لمحہ بھی میسر نہ ہوتا۔ وہ بنا کسی کوفت کے گھنٹوں چلنے کے ساتھ اس کا انتظار کرتی۔ یہاں سے وہاں حالت ہوئے جب کبھی احمد کی نظر اس پر پڑتی تو اسے لکڑی کے جھکڑے کی جگہ ہلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتی یا پھر کوئی برکین اشارہ اچھاں دیتی۔ احمد کو اس ارٹیکلز سے بعض اوقات اچھن ہونے لگتی تھی۔ اسے البانیا پسند نہیں تھی اور وہ

اس کے ساتھ کوئی دیرپا تعلق قائم کرنے کا بھی خولہاں نہیں تھا۔

تمام گھنٹوں کے جانے کے بعد احمد اور ایلیون صفائی کے لیے کمرے تو البانیا ہی ان کے ساتھ شامل ہو جاتی۔ منع کرنے کے بارے میں احمد کے جھکے کا تقریباً تمام کام اتنے ذمے لے لیں۔ پھر وہ دونوں خالی ہال میں بیٹھ کر چند ایک ڈرکس پیتے اور بائیں کرستہ البانیا پوری رات اس کے ساتھ بتا دیتی اور احمد کو تک گزرتا کہ اس سے ملنے کے سوا البانیا کو دنیا میں کوئی کام تھا ہی نہیں۔ جب کبھی وہ البانیا سے استفسار کرتا کہ وہ رات بھر کے لیے صوفیہ کو کس کی عمرانی میں چھوڑ آتی ہے تو وہ کوئی واضح جواب دینے کے بجائے موضوع ہی بدل دالتی۔ اس نے زیادہ جتنس بھی ظاہر نہیں کیا۔ کیونکہ

یہ مزا سر البانیا کا ذاتی مسئلہ تھا۔ ابتدا میں احمد نے اس کی حوصلہ چھٹی کر کے اور پہلو تھی رہنے کی اپنی ہی کوشش کر کے دیکھ لی تھی پر البانیا نے ذرا سا بھی انٹر قبول کیے بنا پیش قدمی جاری رکھی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ احمد کو بھی اس کا ساتھ نسبتاً کم تا گوارا لگنے لگا۔ اتنا عمر اسے خول میں بند ہو کر جینے کے بعد اسے سنانے کے لیے کوئی ماسخ و کار دکھا اور البانیا کے ساتھ فروغی نوعیت کی باتیں کرنے سے اس کے اندر کی گھنٹیں کم ہو جاتی تھی جیسے کارخانوں کی چیمبیاں دھواں اگل کر اندرونی فضا کو شانت کر دیتی ہیں۔

البانیا سے ملنے ہوئے اسے قریباً ایک ماہ بیت چکا تھا اور اس دوران کسی ایک رات بھی البانیا سے بار میں آنے والے معمول کو توڑا نہ تھا۔ جب ایک بار وہ بار کے بند ہونے تک بھی نہ آئی تو احمد کے علاوہ ایلیون نے بھی اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا تھا۔

"تمہاری بلڈی میری کہاں ہے؟" ایلیون نے تیسری بار اس سے پوچھا تھا۔ البانیا کے پسندیدہ کاک ٹیل اور اس کے ہالوں کی اگست میں ممالمت کی بنا پر ایلیون نے اس کا نام بلڈی میری رکھ چھوڑا تھا۔

"مجھے کیا معلوم۔" اس نے بے نیازی ظاہر کی۔

"تو کسے معلوم ہے؟"

"وہ کل آگے کی تو اس سے ہی پوچھ لیا۔"

"تو وہ کل آ رہی ہے؟"

"تو وہ تو وہی جاتی ہے۔"

"تم کچھ نہیں جانتے؟"

"کیا تم کو کچھ نہیں ہے میں مصروف ہوں۔" احمد نے ان دھلے ہوئے گلاس تک میں ڈھیر کیے

"کیا تم دونوں کے سچ کوئی ناراضی ہوئی ہے؟"

"جو میں کر رہا ہوں مجھے ختم کرنے دو۔"

"یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تم اگر پریشان ہو تو اسے فون کر لو۔" وہ کہے ہوئے جڑوں کے ساتھ گلاس دھونے میں مبتلا ہوا۔

"تم اگر پہلے سے فون کر چکے ہو تو مجھے بتا دو۔ ویسے



زیادہ دیر تم۔ سے ناراض رہ ہی نہیں سکتی۔ وہ تمہاری محبت میں سر تپاؤ ذلی ہوئی ہے۔ ماؤ تم تو اس کے لیے ایسے ہی ہو جیسے "بلڈی میری" میں نمائندگی کا رس تمہارے بغیر وہ نہ bloody (لوہی لال) کہہ سکتی ہے اور نہ ہی merry (سورگ) وہ خاموش کہتا ہے۔ مگر اگر تو ڈالا تھا۔ ایلیون کے سوالات بند کرنے کا اسے اور کوئی طریقہ نہیں سوچنا تھا۔ بعد میں وہ اپنے رد عمل پر متعجب بھی ہوا۔ اس قدر بلش میں آئے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ شاید وہ اس لیے جھنجھلا رہا تھا کہ الما کے نہ آنے سے اسے بار کی بہتری سمیٹنے کا فرض خود بخود پڑا تھا۔

دوسری رات اور پھر تیسری رات بھی وہ نہ آئی تو احمد کو تشویش ہوئی۔ اس نے الما کو ٹیلی فون کرنے کا بھی سوچا لیکن پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ شاید وہ کسی مصروفیت میں پھنسی ہوگی یا بیمار ہو اور ممکن تھا وہ آتا مگر ہو اور مزید اس سے ماننا نہ چاہتی ہو۔ اس آخری بوجھ کو تسلیم کرنے سے اس کا دل صاف نکلا کر رہا تھا۔ احمد سے آگے جانا ایک معمولی شخصیت والی لڑکی کے بس کی بات نہ تھی۔

چوتھی رات جب وہ بار سے واپس آیا تو پارٹنر شٹ کے دروازے کو اندر سے بندھا کر دھک سے رہ گیا۔ رائن گزشتہ دو دن سے شعیار کب گیا ہوا تھا وہاں مارٹن آرٹھر کی ایک فلم کے ہیکھ مناظر میں جشن کے علاقہ میں آن لوکیشن فلم بند ہونا تھا۔ اور رائن مارٹن کا اسٹینڈ ان تھا۔ آج وہ یہ سوچا کہ اس نے فون پر احمد کو بتایا تھا کہ وہ ایک ہفتے بعد لوٹے والا تھا۔ تو پھر پارٹنر شٹ میں کون تھا۔ کچھ دیر تندیب میں بیٹھا رہنے کے بعد اس نے کال ٹیل بجائی اور تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ جس نے اطلاع دینی کا جواب دیا اسے وہاں دیکھنے کی احمد کو ہرگز توقع نہ تھی۔ "ہا ہا! انم اندر کیسے داخل ہو میں؟" اس نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی تم میری کمی کو

اتنی شدت سے محسوس کرو گے۔ میں روزانہ ایلیون کو فون پر پوچھتی تھی اور اس نے بتایا کہ تم میرے بغیر کتنے آؤ اس ہو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے جڑ پڑے ہو گئے ہو۔ میں بیان نہیں کر سکتی میں کتنی خوش ہوں۔ میں دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی ہوں۔"

"تم نے پارٹنر شٹ کا دروازہ کیسے کھولا؟" احمد نے سوال دہرایا تھا۔ "میں نے ایلیون کے ساتھ مل کر تم سے پھونسا سا مذاق کیا۔ میرا مقصد ہو گا تمہیں دیکھ دینا نہیں تھا۔ تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو؟"

"تمہارے پاس چالی کہاں سے آئی ہشام کو میں خود دروازہ لاک کر کے گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" "کچھ دنوں پہلے میں تمہارا دلٹ دیکھ رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ تمہارے پارٹنر شٹ کی چابی کی ایک نقل بنوائی چلی ہے۔ بس یونہی کیا خبر کب ضرورت پیش آجائے۔ تمہیں دیکھنا بھی تو ہنگ اور ہو سکتا ہے اور دیکھ لو اگر میں ایسا نہ کرتی تو میرے اچانک سامنے آنے پر تو خوشی نہیں ملی ہے۔ اس کی شدت ایسی زیادہ تو تھی نہ ہوئی۔ اچھا! تمہیں اس نقل ہانچ میں زیادہ دینی تو میں لگ رہی۔"

تب پہلی بار احمد کو اس لڑکی سے خوف آیا تھا۔

شیونائے ہوئے اس نے رائن کی پکار سنی اور ہاتھ روم کا دروازہ کھولا اور اس کے ہونے باہر چھاؤنگا۔

رائن ہاتھ میں ٹیلی فون کا ریسیور پکڑے اسے باہر نکلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"تمہارے لیے فون ہے۔ نہیں وہ تمہاری ہسپانوی دوست نہیں ہے جس سے تم نے ابھی تک مجھے نہیں ملوایا۔ تو ایڈی بلیک دل ہے۔ بہت ہی غیر معروف اور ناکارہ قسم کا اینٹ ہے۔"

میں پچھلے دو منٹ سے اسے سمجھا رہا ہوں کہ میرا دوست کسی غیر اہم کردار سے اپنے کیرئیر کا اتنا زخم نہیں کرنا چاہتا ہے اسے جتنا عرصہ بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ لیکن وہ ایضاً

احمد نے جھاگ میں ملغوف ہاتھ اپنی شرت سے

گراؤتے ہوئے رائن کے ہاتھ سے ریسیور بچھٹ گیا تھا۔

ایڈی بلیک دل کوئی بھی رسمی جملہ ادا کرنے کی زحمت گوارا کیے بغیر مطلب کی بات پر آیا۔

"ایک انٹریٹڈٹ پروڈکشن ہے۔ بجٹ بہت قلیل ہے۔ پروڈکشن سے جڑے سب ہی لوگ غیر معروف ہیں۔ بالکل تمہاری اور میری طرح۔" "یقیناً" ایڈی نے رائن کی ہرزہ سرائی سن لی۔ "میرا وعدہ ہے کہ آئندہ تمہارے لیے یقیناً" اس سے کچھ بہتر کروں گا۔ تم میں مجھے وہ جنون نظر آتا ہے جو آج کل کے نوجوانوں میں پائیڈ ہو نا جا رہا ہے۔" احمد وہ سادھے شتارہا۔

"خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ تمہیں ایک part speaking (مکالمے والا کردار) کے لیے ملتا ہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے آفس میں تم ایک سٹرائٹے کا ڈکریسٹے ہی بھڑک اٹھے تھے۔"

ریسیور پر بھی اس کی غم پھیلی اور بھی مرطوب ہو گئی۔ اس کا دل اس ایک منٹ میں اٹک کر پھٹ گیا تھا۔ "وہ تمہیں ایک اسپیکنگ پارٹ کے لیے ملتا ہے ہیں۔"

اسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے جو مقررہ دھن کے لیے کہا تھا۔ وہ اطلاع دینی میں نہیں ڈرتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے انجینی الفاظ پر فطریں دوڑائیں اور بے بس سے اسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے لگا۔

"تمہیں اطلاع دی پڑھنا نہیں آتی۔" احمد کی خاموشی کو محسوس کر کے اس نے پوچھا تھا وہ اسے کیا بتاتا کہ اس کی اٹالین مقامی ریستوران کی فہرستوں میں کیسے اطلاع دی کہ انہوں نے ناموں تک ہی محدود تھی۔ اور یہ کہ پڑھنے کے علاوہ اسے اطلاع دی بولنا بھی نہیں آتی تھی۔ وہ اسٹنٹ ڈائریکٹر کے ہونٹوں سے برآمد ہونے والے لہلہے فقرے کی بہت کرنے لگا۔

"تم نے میرا وقت برباد کیا ہے۔" ایڈی پھر "ایڈی میں

ہے اور نہ رو رہا تھا۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کھٹے تختی سے آپس میں ماسے بیروں کو اظہار آری کیفیت میں جنش دے رہا تھا۔

"اس نے درست کہا ہے۔"

"وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میں تمہیں ایک ٹیپ شدہ آواز سنوا رہا ہوں۔ مجھے اس کی نقل کر کے سٹاؤ اور پھر مجھے ملے کرنے دو۔"

"تھک ہے۔"

ہے اور نہ رو رہا تھا۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کھٹے تختی سے آپس میں ماسے بیروں کو اظہار آری کیفیت میں جنش دے رہا تھا۔

"ایڈی نے خاص طور پر تمہارا نام تجویز کیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تم کسی بھی مردانہ آواز اور لہجے کی آواز سنوا سکتے ہو۔"

اس کے بیروں کی حرکت موقوف ہوئی۔ "اس نے درست کہا ہے۔"

"وہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ میں تمہیں ایک ٹیپ شدہ آواز سنوا رہا ہوں۔ مجھے اس کی نقل کر کے سٹاؤ اور پھر مجھے ملے کرنے دو۔"

"تھک ہے۔"

وہ ایک درمیانی عمر کے مروی آواز تھی جس میں کھر کھرہٹ کا خفیف عنصر تھا۔ جو ہی ان چند جملوں کی گونج تھی۔ احمد نے آواز انداز میں کسی تحریف کے بنام نہ سن انہیں دہرایا۔

اگر سامنے بیٹھا شخص سٹار ہو جائے تھا تو اس نے اپنے آواز سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔

"اچھا اب میرے ذہن سے اس اطلاع کو دور ہواؤ۔ میں آواز مورگن کی طرح ہی رکھتا۔ تو آواز کے مالک کا نام مورگن تھا۔"

وہ مختصر اور آسان سا فقرہ تھا۔ احمد کو مورگن کے لب و لہجے میں اسے ادا کرنے میں کوئی وقت پیش نہیں آئی تھی۔ اسٹنٹ ڈائریکٹر نے کروان کو خم دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔ پھر احمد کو اس کا کردار سمجھانے لگا جو ایک قابل کا تھا۔ وہ مجسم ساعت بن گیا۔

وہ ایک بہت ہی عجیب سا کردار تھا اور اسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس قدر کفایت لفظی سے کام لیا تھا کہ اس کے لیے کچھ بھی نہ پڑا۔ احمد نے ایک دفعہ اسے ٹوکے ہوئے کچھ چیزوں کی وضاحت مانگی اور ایک مشورہ دیا تو وہ آگ بگولہ ہو گیا تھا۔ اس نے اتنی کڑھک سے احمد کو

اسٹنٹ ڈائریکٹر نے اسے جو مقررہ دھن کے لیے کہا تھا۔ وہ اطلاع دینی میں نہیں ڈرتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے انجینی الفاظ پر فطریں دوڑائیں اور بے بس سے اسٹنٹ ڈائریکٹر کو دیکھنے لگا۔

احمد نے میرا وقت برباد کیا ہے۔ ایڈی پھر "ایڈی میں

ہے اور نہ رو رہا تھا۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ کھٹے تختی سے آپس میں ماسے بیروں کو اظہار آری کیفیت میں جنش دے رہا تھا۔

"اس نے درست کہا ہے۔"



بھارت کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ اس دن آستانہ — سمجھ سکا کہ کردار بہترین کو کس کمزور بنا ہے۔ اس کو باور کو بچھانے کے لیے اسے ایک کمزور اور کار تھا جو اسے خود مہیا کرتا تھا اور اس کا چہرہ پر دے پر نہیں دکھایا جائے گا۔ اسے مایوسی تو ہوئی لیکن جو بھی مل رہا تھا، غنیمت تھا۔ کم از کم کریمز میں اس کا نام تو شامل کیا جائے گا۔

”منگل کے دن صبح سویرے میرے میٹ پر پہنچ جانا۔“  
 ”کیا تم سرسٹل کریں گے؟“  
 اسے ٹٹی میں جواب ملا تھا۔ ”اس ایک لائن کو بولنے کے لیے تمہیں سرسٹل کی ضرورت ہے؟“  
 ”کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو ایسے ہی۔“ وہ بوکھا ہٹ زور آواز میں بولا۔

”کیا مجھے فلم کا پورا اسکریپٹ مل جائے گا؟“  
 ”یہ میں اپنے کردار کی اصل روح کو سمجھ کر اسے ادا کرتا ہوں۔“  
 اسٹیشن ڈائریکٹر نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی داغی صحت کے بارے میں مشکوک ہو گیا ہو۔  
 ”تمہیں کچھ تو نہیں ہو؟“ ایک لڑکے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ ورنہ میں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔“  
 لہجہ کے ذہن میں بہت سے سوالات گھبرا رہے تھے اور جواب پانے کے لیے اسے کوئی اور راہ ڈھونڈنی تھی۔ وہ اکتایا ہوا شخص ہونے کا کام میں بالکل اناڑی لگتا تھا، اسے مزید برہم کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔

اسے ہر حال میں فلم کا پورا اسکریپٹ پڑھنا تھا، جب تک اسے معلوم ہی نہ ہو کہ قاضی کا دوسرے کرداروں کے ساتھ کیا رشتہ تھا اور اس کے اعمال کے پیچھے کون سی ذہنی روش کار فرما تھی، وہ کیونکر ایک سفر کے اس مکالمے کو اس کے درست معانی کے ساتھ ادا کر پائے منگل صرف وہ دن کی دوری پر تھا اور اتنی تھوڑی مہلت میں اسے ڈھیروں کام کرنا تھا۔ اس کی رگوں میں دوڑتے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دو گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ فلم کی کہانی ایک ناول سے لی گئی تھی۔

بلی ڈیوڈ پر pickwick بک اسٹور سے اسے temptation (ترغیب) نامی وہ ناول مل گیا تھا۔ وہ تیسرے درجے کا روٹلی تھا اور کہانی بے سرو پا ہونے کے ساتھ ساتھ سستی جذباتیت سے لٹی پڑی تھی۔ اسے اس کے اولی معیار سے سروکار نہ تھا، اس کا مطلب نظر تو بعض اپنے کردار کی صحیح سلجھانا تھا۔ ”مے فلادر“ کافی شاپ میں بیٹھے بیٹھے اس نے وہ ناول پڑھ لیا تھا اور کہانی ذہن نشین کر لی تھی۔ پھر وہ رستورے کے bistro کی جانب روانہ ہوا جہاں اینجیلو banitor کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اٹلانوی اینجیلو ایون کا دوست تھا اور کبھی گھسار بار میں اسے ملنے کے لیے آجایا کرتا تھا، احمد کی بھی اس سے رسمی جان پہچان تھی۔

اس نے اینجیلو کو mimeographed ورق دکھایا اور اسے وہ جملہ بولنے کو کہا۔ اینجیلو کو سنجیدگی اپنانے پر مجبور کرنے کے لیے اسے قریباً دو سو منٹ صرف کرنا پڑے تھے۔

”اس طرح نہیں اینجیلو! ایسا برا وقت ہے۔“  
 تم کوئی کبھی کوئی عبارت پڑھ کر سکتے ہو۔“ کاغذ کی طرف متوجہ ہو کر اسے ہنسی چاہو۔ تمہارے لیے میں استحقاق ہونا چاہیے۔ حق جتنا کرو لو۔ جیسے تمہیں یہ سچ ہو کہ جب تم اسے بارک میں ملاقات کے لیے کہو گے تو وہ ہر صورت وہاں پہنچے گی۔ محسوس کر کے بولو۔“  
 اینجیلو کو ذرا مغز اور بد مذاق تھا۔ خاصی دیر اسے ترجیح کرنے کے بعد اس نے جیسے گو کہتے ہیں۔ ”بہتر انداز میں ادا کیا۔“ احمد نے متعدد بار اس کے سامنے الفاظ کو دہرا کر اپنے اٹلانوی تلفظ کی درستی کا اطمینان کیا تھا۔  
 اس کی اٹلی منزل استعمال شدہ بلوسٹ کی دکائیں تھیں۔ رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تھی۔ جب اسے ایک فرسودہ کونو کرائے پر دستیاب ہو سکا۔ پہلی نظر میں ہی احمد نے بھر کھار رنگوں والے اس کونو کو ناپسند کیا تھا۔ گھراس پر سمجھوتے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ اس نے ناول میں بیان کردہ خاکے سے ملتا جلتا کھنڈا بھی حاصل کیا اور آخر میں فلورسٹ کے پاس پہنچا۔

قاضی کو کون سا پھول ہے یوں کہنا چاہیے تھا کہ اپنی صورت میں جب وہ کھولنے سے منہ ڈھانپ کر خود کو اس کا محبوب ظاہر کر رہا تھا، اس نے انتخاب کے لیے پھولوں پر نظریں دوڑائیں۔ ہر پھول کی اپنی ایک زبان تھی۔ انہیں جو باتوں کا بیان ہوتا تھا۔ ہنسی، گلاب۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا، گلابی کارنیشن۔ میں تمہیں کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اس نے کاسنی gloxinia کو منتخب کیا تھا۔ وہ پھول پہلی نظر میں محبت کی تجسیم تھا۔ اس نے چار اطراف جلتے جلتے روشنیوں کے جگنوؤں کو رات کی کالی پوشاک پر چلتے ہوئے دیکھا۔ اور ایک طویل سانس سینے کی تہ سے کھینچ کر فضا کے سپرد کیا۔

وہ آئندہ صبح دوسرے سفر کرنے کی تمام تیاری مکمل

کلی روز صبح اس نے رات کو پکا کر مطلق کیا کہ وہ اس کی کار کے کرائے کے ساتھ ساتھ رات کے ساتھ ساتھ احمد کو دیکھا تھا۔ اسے شکر نہیں جاتا تھا کہ اس نے احمد کو بس کے ذریعے سفر کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مجبوراً اسے البا کو ٹیلی فون کرنا پڑا۔ وہ اب تک سو رہی تھی لیکن احمد کی آواز سننے ہی حسب توقع اس پر چھائی کسلندی دور ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو کر پارٹمنٹ کے دروازے پر آؤ جوڑ ہوئی اور آتے ہوئے وہ اس کے لیے بیٹن اور سگتے کے رس کا ناشتہ بھی لے آئی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رات کی موجودگی میں آئی تھی۔ اس سے قبل رات نے اس کا ذکر ضرور سنا تھا مگر ملاقات نہ ہو پائی تھی۔

”میں بیٹن نہیں کھاتا۔“ احمد نے عجلت میں گھٹتے کانس پیتے ہوئے البا کو بتایا تھا۔  
 ”تھکر کیوں؟“ بہت خستہ بنے ہوئے ہیں۔“  
 ”البا اورک بھلی سے بنتے ہیں اور میں مسلم ہوں۔“  
 ”میرے لیے پورک ممنوع ہے۔“  
 ”مجھے معاف کر دینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔“

رات نے بے ملاحظہ کی ”تمہیں افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں جس کھاتا ہوں، مجھے کسی قسم کے گوشت کی ممانعت نہیں ہے۔ ویسے میں نے تمہیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ مجھے تمہاری صورت بالکل بھی اچانک نہیں لگ رہی۔“  
 ”مجھے یقین ہے، میں تم سے پہلے کبھی نہیں ملی۔“ البا نے قطعیت سے کہا تھا۔

”میری یادداشت تو بہت شان دار ہے۔ مجھے کبھی بھی دھوکہ نہیں دیتی۔ جانے کیوں مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں تمہیں کہاں دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے روئے سخن احمد کی جانب موڑا۔ ”تمہاری دوست کی شکل مجھے مانوس لگ رہی ہے۔ یقین کرو یہ میرا وہم نہیں ہے۔“ احمد کو اس کی بات سننے کی فرم تھی تو کبھی وہ دھیان نہ دیتا، ان لمحات میں تو یوں بھی اس کے اعصاب پر اپنا کردار اور آنے والا مشکل چھایا ہوا تھا۔ وہ ان سنی کرتے ہوئے البا کے صراہہ پر نکل آیا تھا۔

مطلوبہ پارک کے سامنے پہنچ کر احمد نے اپنی بی شہرت اور بیخبر کے اور کو فون پینا اور درمیان چھپوں والا ٹھکانا چہرے پر لگا لیا۔ راستے میں وہ البا کو وہاں آنے کا مقصد مختصراً بیان کیا تھا، اس لیے اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا۔  
 ”مجھے مارہ بچے لینے کے لیے آجانا پھر ہم اکٹھے ہی وہ پیر کا کھانا کھائیں گے لیکن اس وقت سے پہلے تم پارک میں نہیں گھسو کیونکہ تمہاری موجودگی سے میری توجہ بٹی رہی گی۔ مجھے مکمل ٹیکسوٹی چاہیے۔“ پارک کے داخلی راستے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اس نے ہدایت کی تھی۔

اندر آتے ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بہت جلدی آیا تھا۔ بارک تقریباً اور ان راہ ہوا تھا۔ وہ روشوں پر بے مقصد چھلنے لگا۔ ہفتہ واری تعطیل اور خوش گولار موسم کی وجہ سے اسے امید تھی کہ جلد ہی لوگوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ سب سے پہلے وہ دو ذمی عورتوں اور چار نو عمر لڑکوں کی آمد ہوئی جو مشکل و شبہات سے ایک







## تیر چہرے گل آئے

”تمہارے شہری ہوا میں سانس لے رہی ہوں  
سعید احمد۔“

سعید احمد کے موبائل پر پیغام نمودار ہوا۔ سعید احمد نے ایک بار اسکرین پر گھمت کا بھیجا ہوا ایس ایم ایس پر دھا اور سگریٹ کا فوٹو مل کر لیتے ہوئے موبائل دوبارہ تپائی پر رکھ دیا۔ مینٹوں بعد گھمت نے اسے یاد کیا تھا اپنے مخصوص انداز میں۔ سعید احمد اسے جھٹلا نہیں پایا تھا وہ ابھی تک اس کے دل سے نہیں اترتی تھی۔

کناؤ لہجے

دونوں میں کوئی رابطہ نہیں رہا تھا، مگر آج نصف شب کے وقت گھمت کے پیغام نے اسے جیتے ہوئے دنوں کی ایک یاد دلادی تھی۔

”بہت تیز بارش ہے اور میں برآمدے میں اکیلی کھڑی ہوں۔“

”اکیلی؟“

”مجھے بہت بڑا لگ رہا ہے، آسمان نظر نہیں آ رہا، ہر طرف اندھیرا ہے اور تیز بارش۔“

”ڈرنے کی کیا بات ہے پانگل؟“

”اور تک کوئی نہیں ہے میں اکیلی ہوں، چوکی دار چائے نہیں کہاں چلا گیا ہے میرا دل ڈوب رہا ہے۔“

”تو نہ نہیں!“

”میں کیا کروں مجھے بہت خوف آ رہا ہے۔“

”جب آپ اکل اس میں رونے والی کیا بات ہے؟“

”میں کیا کروں؟“

”میں آ جاؤں۔ چھتری لے کر۔“

”تم نہیں آؤ گے، کبھی نہیں آؤ گے سعید احمد۔“

میں جانتی ہوں میں ہمیشہ اسی طرح اکیلی کھڑی رہوں گی۔ اس نے پھینکی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

وہ پھینکی ہوئی آواز اور ڈرا ہوا لہجہ ہمیشہ کے لیے سعید احمد کی سماعت میں محفوظ ہو گیا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا تیز بارشوں میں اس کی کئی ہوئی بات تو ہمیشہ شدت سے یاد آتی۔ ”چھتری سہا یہ تو ہے سارا نہیں سعید احمد!“

اپنا نیت بھر لہجہ دل سے لیتے والے الفاظ کا پتہ اور اس نے وقت بھی تو عجیب چنا تھا، اُوہی رات کا وقت،





جب پورا درد چاکتا ہے اور دینے اور لینے والے سب جانتے ہیں۔ سعید احمد چاک رہا تھا، محنت چاک رہی تھی۔ اس نے فقیر القادہ کو یادوں کی بالائیں پردے کے بیچ دیا تھا۔

”تمہارے شہری ہوا میں سانس لے رہی ہوں سعید احمد! کتابا مہجی اور بھرو پورہ جہلم تھا۔ اس ایک جگہ میں ساری کہانی تھی، ایسی کہانی جس کے صرف وہ کردار تھے اور کوئی تیسرا اس قصے سے واقف نہیں تھا۔ ایسا ہی ایک پیغام بیٹے دنوں میں سعید احمد نے گنت کے نام بھیجا تھا۔ ”اس سڑک پر چنگی بہت ہے۔“ کوئی کیسے جانتا وہ کس سڑک پر سے گزر رہا ہے؟ کہاں کی بات کر رہا ہے مگر گنت تو اس کی پور پور سے واقف تھی۔

”جانتی ہوں آج میرے اردگرد خوشبو کا مزہ ہے۔“ اس نے ہوائی ایس ایم ایس بھیجا تھا۔

”دیکھئے جانا؟“ سعید احمد حیران رہ گیا۔  
”یہاں ایسی خوب صورت جگہ بھی نہیں آتی۔“  
”آج میں سوچ میں پڑی تھی۔“

”کس سوچ میں؟“  
”یہ خیال گزرا کہ کسی خوب صورت شخص کے قدم آج یہاں پڑے ہیں۔“  
”میں ایک کتاب کی تقریب رونمائی میں آیا ہوں تمہارے ہاش کے سامنے دانی سڑک سے گزر کر۔“  
”میں نے کب کہا مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

سعید احمد گنت کے ہاش کی سامنے والی سڑک سے گزرا تھا اور گنت کو خبر ہوئی تھی کہ اس کے اردگرد خوشبو کا مزہ ہے اور کسی خوب صورت شخص کے گزرنے سے خوشوار ہو گئی ہے اور وہ شخص سعید احمد ہی ہو سکتا ہے۔ مگر گنت اس کے شہری ہوا میں سانس لے رہی تھی اور سعید احمد کو خبر نہ ہوئی۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے دیکھے سعید احمد نے موبائل دوبارہ تکی سے اٹھایا۔ اس کا پیغام ایک پار پھر پڑھا اور جواب لکھا ”کیسے آتا ہوں؟“

پیغام بھیج کر وہ موبائل اسکرین پر نظریں جمائے

رہا سے یقین تھا جواب آئے گا۔ ”یہ گھر ہو تم سے ملنے نہیں آتی ہوں۔“ یا ہو سکتا ہے وہ کہے۔ ”تمہارے دروازے پر کھڑی ہوں، ایک ہاتھ میں پینول اور دوسرے میں کتابوں کا بیٹل ہے، دروازہ کھولو! وہ یہ بھی کہہ سکتی تھی۔ ”قانون کے سامنے نہیں ہوں اس کا سر ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔“

اس سے کچھ بھید نہیں تھا، مگر سعید احمد کو جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ اپنے لگا کچھ دیر انتظار کے بعد اس سے پیغام پیغام بھیجا۔ ”کہاں ہو؟“  
”تمہارے پاس نہیں ہوں کیا؟“ وہ کہے گی۔ سعید احمد نے اپنے آپ کو دلاسا دیا، جیوتی نسلی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب گنت سے اس کا وہ رشتہ نہیں تھا وہ تعلق اب نہیں رہا تھا۔

”سعید اللہ کی یارات میں۔“ مقررہ ہو مل آجائے۔“  
دو بعد مختصر سا جواب آیا اور سعید احمد کا سینہ اٹھل چھل کر گیا۔

بہتر وقت  
یہ عجیب بات ہوئی تھی کہ گنت کے ساتھ ہی فائزہ کی یاد بھی ویسے یاد بھی آئی۔ یہ ہمیشہ ایسا ہی ہوا تھا، ایسا کیوں ہوا تھا؟ سعید احمد اس بات کا فیصلہ اس وقت کر پاتا تھا جب وہ دونوں اس سے مسلسل رابطے میں رہتی تھیں، نہ آج سعید احمد کو یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی، جب وہ دونوں ہی اس کے ذہن سے محو ہوتی جا رہی تھیں۔

فائزہ جس نے سعید احمد کی کتاب پر خوب صورت تبصرہ لکھا تھا۔ تب تک سعید احمد اس سے ملا نہیں تھا، مگر وہ ان پستوں لوگوں میں شامل تھی جن کے بارے میں سعید احمد کا خیال تھا کہ زندگی کی رحمانی ایسے ہی چند لوگوں سے ہے۔

”سہرا! آپ کی کہانیوں میں اتنی اداسی کیوں ہوتی ہے؟“ اس نے ایک بار پوچھا تھا۔ سعید احمد کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا، وہ خود نہیں جانتا تھا اس کی ہر کہانی اداس کیوں ہو جاتی ہے اور ہر کہانی کا

اختتامیہ الم ناگ کیوں ہوتا ہے؟  
”آپ ہمیشہ جو اپنی کار سے نہیں اختیار کرتے ہیں؟“ کبھی تو ملے۔ ”کسی کہانی کا اختتام تو بلا سبب سر نہیں۔“ سعید احمد ہر بار کو شش کرتا تھا، مگر فائزہ کی خواہش کا احترام وہ کبھی نہ کر سکتا۔ اس نے ہمیشہ اداس کہانی لکھی۔ فائزہ نے بصرے میں لکھا تھا۔ ”سعید احمد کی کہانیوں کی اداسی کو یاد دہرے دہرے اپنی گرفت میں لیتی ہے اور پھر وہ سبک اداس رہتی ہے۔“

چھٹلے سال فروری کی چوہوں میں شام سعید احمد کا تعارف گنت سے ہوا تھا۔ وہ آندھی اور طوفان کی طرح اس سے کرائی تھی۔  
”یہ کیا فضول کہانیاں لکھتے ہیں آپ؟“

سعید احمد کو فون پر ایک انجینیئر کی کال پر ایک انجینیئر آواز سن کر اتنی حیرت نہیں ہوئی تھی جتنا اس انجینیئر کی غیر متوقع بات نے سعید احمد کو چونکا دیا تھا۔ وہ ایک انسان دکھتا تھا اور بہتر سن اولیٰ بچوں میں یہ سب چکا تھا، لوگ اس کے افسانوں کو پسند کرتے تھے۔ اس کی دو کتابیں شائع ہو چکی تھیں اور اسے بہت سے لڑکیاں خط موصول ہوتے تھے جن میں اس کی کہانی کی سنا کر اس اور کئی اور لڑکیوں کی توصیف ہوتی تھی۔ نئی لڑکیاں ایسے فون بھی کرتی تھیں، سعید احمد کی تحریر انہیں پسند تھی اور وہ ہر لمحہ اس کا اظہار کرتی تھیں، مگر بچوں کی زندگی میں پہلی بار کسی نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ ایک انجینیئر جس سے اس کا پہلی تعارف نہیں تھا اس کی کہانیوں پر تنقید کر رہی تھی۔

”کیا یہ مطلب ہے میں سمجھا نہیں۔“ سعید احمد واقعی اس کی بات کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔

”میں زمانے کی کہانیاں آپ لکھتے ہیں، اب عورت اتنی مجبور نہیں رہی کہ مرد کی حکومت رہے، نہ آج کی لڑکی اتنی بے بس ہے کہ والدین کے ہر غلط فیصلے پر سر جھکا دے۔“ بہت تند تیز لہجہ تھا اس کا۔ اتنا تیز جو سعید احمد جیسے مرد کو بھی تھوڑی دیر میں اپنے ساتھ

ہانگے حالت۔  
”آپ کس کہانی کی بات کر رہی ہیں؟“ سعید احمد نے سیلاب کے آگے کنوڑہ بندھنے کی کوشش کی۔  
”اس ماہ جو ”نور“ ہے، میں آپ کا افسانہ ”زرد پتے“ چھپا ہے اس میں آپ نے لکھا ہے کہ انیس سالہ صاحبہ نے اپنے سارے خواب خود ہی راکھ کر دیے، ساری خواہشات کا گلا گھونٹ دیا اور اپنے باپ کے حکم پر سر جھکا دیا۔“ اس کے لہجے میں بہت تندی تھی جو سعید احمد کو اپنے اندر اتنی محسوس ہو رہی تھی۔

”جی ہاں۔ میں نے افسانے میں یہ ہی لکھا ہے۔“  
”بالکل کواں لکھا ہے۔“ فون والی کا لہجہ یک دم اتنا کھیلا ہو گیا کہ سعید احمد اپنے ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔ اس لہجے میں کبھی کوئی اس سے مخاطب نہیں ہوا تھا۔ ایسے کڑوے لفظوں میں کبھی کسی نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ ایسی بات سننے کا وہ عادی نہیں تھا۔ یہ نہ جانے کون تھی جو سارے حساب آج ہی پکڑنے والی تھی۔

”یہ لڑکی سعید احمد نے ہونٹ سے گلا۔“  
”یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لڑکی بچپن سے کسی کے خواب دیکھتی رہی ہو اس کی زندگی کا ہر سانس کبھی کی امانت ہو، دل کسی کو دے چکی ہو اور اچانک ایک مرد باپ کے حکم پر ریت کے سارے کھروندے تو گزر کسی اور کے نعل میں جائے، اپنا جسم کسی اور کے حوالے کر دے، جسے اس نے چاہا، یا کبھی زندگی میں پہلے کبھی دیکھا۔“ اس کی بات بہت تندی تھی اور لہجہ مزید کڑوا ہوتا جا رہا تھا۔

”تمہارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے، میں نے ایسا ہی لکھا دیا ہے۔“ سعید احمد نے تھوکر لگتے ہوئے کہا، وہ کم گو شخصیت تھا، کم بولتا تھا۔ کسی انجینیئر سے یوں بات کرنا اس کے لیے بہت مشکل تھا اور جب بولنے والا اخیر کسی اور رعایت کے ہوتا چلا جا رہا ہو۔

”وہی عام مردوں والی سوچ ہے آپ کی بھی۔“ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھانے لڑکی کو کھڑی اور گائے کی



طرح جہاں جس کھنٹے سے چلے باندھ دینا اور اس کی مدد کو کل کر کے اپنی کامیابی پر جشن منانا کہ میری بیٹی نے میری صدمہ مٹا دیا میں کی میری بہن نے میری لالچ رکھی۔ یہ کیوں کرتے ہو تم مرداویس؟ کیوں عورت کو دکھ دے کر تمہیں تمہیں مٹی سے پہلو جو اب دیا۔

اس نے سعید احمد کو یوں مخاطب کیا تھا جیسے گلاس میں میچر کسی بیچے کو کھڑا کرتی ہے اور اس سے وہی سوال پوچھتی ہے جو اسے یاد نہیں ہوتا۔ یاد اللہ اللہ کے کمرے میں کھڑے ملازم کی طرح جس پر عائد جرم کی شہادت جج کے سامنے رکھی ہوتی ہے اور وہ ان سوالوں پر جواب دہ ہوتا ہے جو اس نے خود بھی سوچے نہیں ہوتے۔ سعید احمد بھی اس وقت گلاس میں میچر کے سامنے کھڑا سبق بھولا ہوا طالب علم تھا یاد اللہ اللہ کے کمرے میں سر جھکائے ملازم جس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے ہر بات وہ من تو رہا تھا مگر ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتا تھا۔

”آپ کون ہیں؟“ یہی آواز میں بمشکل اس نے پوچھا۔

”میرا نام گہمت ہے اور میں تمہارے اقصائے کی ایس سالہ لڑکی صاحبہ جیسی نہیں ہوں جس نے باپ کے حکم پر سر جھکا دیا اور چپ چاپ پینتالیس سالہ منظم آفسر کی بیویوں والی کار میں بیٹھ گئی۔ میں نے چھ گینال کی کوٹھی والے بوڑھے مل ایونر کی انگوٹھی سینے سے اتکار کر دیا ہے اور بڑے بھائی کا گھر چھوڑ کر موٹل میں آگئی ہوں۔ تم نیچے بائی گھر کہتے ہو۔“

گڑبے لہجے میں بات شروع کرنے والی نے کسلیے لفظوں میں بات ختم کر کے کال ختم کر دی۔ سعید احمد سواگل فون کلن سے لگائے بہت دیر تک صدمہ پیشا رہ گیا۔ اس نے جو لکھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ زمانہ بدل گیا تھا، سب کچھ پہلے جیسا نہیں رہا تھا، رویے نہ لوگ، مگر ایسی کمائیاں ابھی عام تھیں۔ لڑکیاں تو خواب دیکھتی ہیں، بے بوق ہیں، مگر زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ آخر کار والدین ہی کرتے ہیں۔ بیٹیاں چپ چاپ اس فیصلے پر سرنگوں ہو جاتی ہیں۔

باہنی کی بات میں بھی دزلن تھا وہ وہیل سے بات کر رہی تھی۔ بائیں طرف بات کر رہی تھی بلکہ عملی طور پر اس نے ثابت کر دیا تھا۔ وہ بھائی کی خزانہ میں کے مطابق بوڑھے ل مالک کی چھ گینال کی کوٹھی کی باگن بننے کے بجائے اپنے باپ کا گھر بغاوت کر کے چھوڑ آئی تھی اور اب پائل میں تھی۔ سعید احمد کو وہ اجنبی لڑکی اپنی کسی کہانی کا کردار لگی، ایسی کہانی کا جو ابھی اس نے لکھی نہیں تھی، مگر آنے والے دنوں میں اور کسی افسانے کا مرکزی کردار بننا تھا۔ ایسا ہی ایک کردار اسے آج دیکھ رہا تھا۔

وہ کتابوں کی دکان پر کھڑا تین کتابوں کا جائزہ لے رہا تھا جب اس کی نظر سامنے پھولوں کے اسٹال پر پڑی۔ وہی تیلی چھوٹے قد کی لڑکی، گانہ پھول چہن کر گلہ ستہ بنا رہی تھی۔ اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور پھولوں کو گلہ ستے کی شکل سمجھتا ہوا تہہ ٹاپ رہے تھے۔ وہ جلالت میں تھی اور اس کی گھبراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ نہیں ہے۔ پھول لیتے تو وہ کسی آن دیجے خوف کا شکار ہے۔ ایک دن میں کئی بوٹی لیتے۔ وہ وہاں جا رہی ہے۔ چھپائے چہرے کو نقاب میں لیے بانی لوگوں سے لا تعلق بننا یہ وہ اس خوف میں مبتلا تھی کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

”یہ پھول وہ کس کو دے گی؟“

کتابوں سے نظریں ہٹا کر اس لڑکی کو دیکھتے ہوئے سعید احمد نے سوچا تھا۔ کئی لوگ پھول خرید رہے تھے مگر وہ ان سب سے جدا سب سے الگ تھی۔ کالج یا یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ لگ رہی تھی اور خواب دیکھنے والی اس عمر کی لڑکیوں کی طرح یقیناً وہ بھی اپنے خوابوں کے خزانوں کے لیے پھول خریدنے آئی تھی۔ آج پھول بچنے کا دن تھا، چودہ فروری، سعید احمد ذاتی طور پر خوشیوں کو دنوں سے منسوب کر کے تقسیم کر دینے کے خلاف تھا۔ پھول تو کسی بھی روز کسی کو بھی دیے جاسکتے ہیں۔ محبت کا اظہار تو کسی بھی روز کسی سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ گلہ ستہ بتا کر اس لڑکی نے

پھولوں کی قیمت دکان دار کو دی اور اسے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا، قلم کے لیے وہ لکھو اور بیگ منگتی رہی، پھر یوں قلموں سے دکان دار کی طرف دیکھا۔

”اسامے کاؤنٹر سے لے لیں۔“ دکان دار نے اس سے کہا۔

وہ ایک ہاتھ میں پھول سنبھالتی اور دوسرے میں اپنا بیگ پکڑے سعید احمد کے پاس آگئی۔ کوٹھی۔ کاؤنٹر پر رکھی پائل اٹھاتی، کارڈ کاؤنٹر کے شیشے پر جھلا اور کارڈ کھولنے سے پہلے دائیں پھر بائیں دیکھا۔ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سعید احمد کی نظریں بے ارادہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ لڑکی فیصلہ نہیں کر پائی کہ اس کے سامنے کارڈ پر لکھے یا نہ لکھے۔ وہ تہذیب کا شکار تھی۔ سعید احمد نے اچھتی سی نظریں اس کے ہاتھ میں پکڑی پائل اور شیشے پر رکھے کارڈ پر ڈالی، ہاتھ سے بنا ہوا وہ ایک دلکش کارڈ تھا، شہنشاہی رنگوں والا شاہکار کارڈ برٹشڈ نہیں تھا۔ یقیناً لڑکی نے اپنے ہاتھوں سے بنا یا تھا۔ سامنے سعید احمد کا دل اسے داؤدینے کو چاہا۔ نقاب والی لڑکی کی بے چینی نے اسے پرے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

لڑکی نے جلالت میں چند الفاظ کارڈ پر لکھے، پائل کاؤنٹر پر رکھی، کارڈ گلہ ستے میں جھپٹا اور بیگ کمرے سے لٹکا کر مڑی اور سعید احمد سے ٹکرائی جو عین اسی وقت پلٹا تھا۔ گلہ ستے پر گیا اور اس میں سے پائل کر کارڈ بھی فرش پر کھل گیا۔ دونوں ایک ساتھ جھکے لڑکی زیادہ تیزی سے جھکی تھی اور اس نے کارڈ کو اٹھایا تھا، جیسے وہ اس کے اندر لکھی تحریر کو سعید احمد سمیت نہانے بھر کی نظریں سے چھپانے رکھنا چاہتی ہو۔ سعید احمد نے گلہ ستہ اٹھاتے ہوئے لڑکی کے ہاتھ میں پکڑے کارڈ میں موتیوں جیسے پروئے ہوئے لفظوں کی ایک جھلک دیکھی، انتہائی خوب صورت لکھائی میں لکھا تھا۔ ”اگھے برس ہم مل کر پھول نہیں گے۔“

لڑکی، سعید احمد کے ہاتھ سے گلہ ستے لے کر تیزی سے مڑک گئی اس یاد تھی اور اس کی نظریں سے اوچھل ہو گئی، مگر اپنے پیچھے ایک ایسی کہانی چھوڑ گئی جو

# موٹاپے سے بچات

کہا جاتا ہے کہ ہر بیماری کی تیزی سے تھی خرابی سے روکتا ہے اور جینٹ کا کارڈ جیٹا خوراک کا ایک بہت بڑا سلسلہ ہے۔ اسی طرح چہرے پر ہاتھ کھل جھانکنا بھی صحت کی افزائی سے ہوتی ہیں۔

خواتین کے ان تمام مسائل کا حل موٹا پارہیٹ کا کارڈ جانا، معدے کی گروٹی اور تیزابیت ختم کی جاسکتی ہے۔

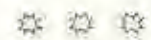


قیمت = 80 روپے

**Wahid Herbal Lab**  
 Cell: 0383-2338677  
 0114-2994207/05  
 Herbal Lab Rawalpindi Pakistan



کے والے دونوں میں سعید احمد نے لکھنا تھا اور جس کا مرکزی کردار ایک انجینیئر لڑکی تھی جس کا سارا وجود چادر میں لپیٹا ہوا تھا اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور وہ اپنے محبوب کے لیے پھول خریدتے ہوئے سعید احمد کو نظر آئی تھی۔ اپنے خوب صورت ہاتھوں سے اس نے شہ رخ رنگوں والا ایک دلکش کارڈ بھی بنایا تھا جس کے اندر صفحے پر اس نے اپنے دل کے اندر برسوں سے پالی ہوئی خواہش کو لفظوں میں سمو دیا تھا۔ موتیوں جیسے لفظوں میں لکھی اس عبارت کو سعید احمد نے پڑھ لیا تھا۔



کڑوے لمحے والی نکتہ نے سعید احمد کو واقعی بے چین کر دیا تھا۔ اسی شب سعید احمد نے نکتہ کو پو پوئی بار فون کیا۔ یہ اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ یوں کہتی تھی کہ "سعید احمد بول رہا ہوں۔"

"میرے سوال پر آپ کا نام آ رہا ہے پولیس۔" وہی گڑا لہجہ شکر شرمندہ کر کے والی صاف کہتی۔ "مجھے آپ سے یہ کہنا تھا کہ آپ بھی کمانی لکھیں۔" سعید احمد نے دعا بیان کیا۔

"میں؟ میں کمانی لکھوں؟" وہ حیرت زدہ لگی۔ "جی ہاں! آپ لکھیں، اس لڑکی کی کمانی جس نے بھائی کے سامنے بغاوت کی۔" سعید احمد نے مختصر مگر جامع بات کی۔

"مطلب؟ کمانی؟" وہ سمجھ گئی تھی۔ "میں یہ نہی کہہ رہا تھا۔" سعید احمد نے متانت سے کہا۔

"میں نہیں لکھ سکتی مجھے لکھنا نہیں آتا۔" پو پوئی بار اس کا لہجہ نرم پڑا۔ "لکھ سکتی ہیں مگر لکھنا نہیں چاہئیں۔" "کیوں؟ یہ کیوں کہا آپ نے؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"اس لیے کہ آپ ج بول سکتی ہیں مگر لکھنے سے

خوف زدہ ہیں۔" سعید احمد نے اسی کے لمحے میں جواب دیا۔

"میں خوف زدہ نہیں ہوں، کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔ سچ بولتی ہوں ہمیشہ، کسی کو اچھا لگے یا برا۔" نکتہ سے اٹھڑی تھی۔

"وہ تو میں جانتا ہوں آپ کو کسی کی پروا نہیں۔ کسی کو اچھا لگے یا برا۔ جو زبان پر آئے بولتی چلی جاتی ہیں۔ مگر میں بچ رہی کہہ رہا ہوں آپ لکھیں مجھے یقین سے آپ بہت اچھی کمانی لکھ سکتی ہیں۔" سعید احمد نے اپنی بات مکمل کر کے کال ختم کر دی۔ اسے یقین تھا وہ لکھنے کی اور بہت اچھا لکھنے کی۔



مارچ کی دسویں صبح عبداللہ کے فون نے سعید احمد کو نیند سے بیدار کیا۔

"تیسری تکب کے سرورق پر سعید احمد کی تصویر چھپے گی تو اس شہری آدھی لڑکیوں کو آپ جیسی سکون کی نیند نصیب ہوگی شہری۔" یہی برتھ ڈے ٹیوٹو "عبداللہ کی زندگی سے بھرپور چٹائی آواز میں انڈیا شہر لوٹ گیا ہے۔ یہ شہر شہر اور شہر شہر عبداللہ کے سرورق کا خاصہ تھی جو سعید احمد جیسے خشک مزاج تخلیق کار کو بھی بہت پسند تھی۔

"وہ چھٹے سال کی طرح اس بار بھی عبداللہ۔" "تھیک یو سوچ؟" سعید احمد کو بہت اچھا لگا۔

"اس بار بھی ایک عبداللہ کی طرف سے پھول مت چاہئے گا۔" اس نے باو دلایا۔

"پھوڑو یا ر ایک کا تکلف نہیں کرنا۔" سعید احمد نے بے تکلفی سے کہا۔

"تھیک تو کہے گا اور ڈنر بھی اٹھنے کریں گے۔ سب سے پہلے وٹس کرنا تھا اس لیے اتنی صبح فون کیا ہے آپ آپ مزے سے ٹینڈ پوری کریں۔" وٹس آئین ابھی برتھ ڈے ٹیوٹو "عبداللہ نے ٹکٹا کر دیا۔

عبداللہ نو جوان پیشتر تھا جس کے ساتھ سعید احمد کا محبت اور غلوں کا رشتہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے

کے مزاج کو خوب سمجھ گئے تھے۔ سعید احمد کے دونوں انسانی مجموعے عبداللہ نے شائع کیے تھے اور انتہام سے شائع کیے تھے۔ دونوں بار اس نے سعید احمد سے بہتر کہا تھا کہ بیک ٹائٹل پر سعید احمد کی تصویر بھی چھاپی جائے تاکہ اس کے افسانوں کے قارئین کو اس کی صورت سے بھی آشنا ہو مگر سعید احمد نے انکار کر دیا تھا۔ اس کا موقف تھا کہ قاری کو تخلیق کار کی تصویر نہیں تحریر سے روشناس ہونا ضروری ہے۔

عبداللہ اس کی اس دلیل سے متفق نہیں تھا۔ وہ اکثر مذاق میں کہتا تھا۔ "مرا آپ کی کمانیاں لڑکیوں کو پسند آتی ہیں، کبھی کسی مر کی ذیلی آپ کی تعریف نہیں سنی۔"

"اس میں میرا کیا تصور ہے بھائی؟" سعید احمد ہنس کر کہتا۔

"تصور آپ کا ہی ہے،" تصور جو چھاپے نہیں دیتے لڑکیوں کو پتا چلے کہ سعید احمد تیس سال کا لڑکا نہیں بلکہ ساٹھ سالہ مرد ہے جس کے بال سفید اور آنسو بہت گرتے ہیں۔ مگر شہری اور چھائی مہنور ہے۔ اسے کامر میں اور سیار وقت ہے تو آپ کا انساں کبھی کوئی لڑکی پڑے نا تعریف کرے۔"

سعید احمد کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کی کمانیاں لڑکیاں پسند کرتی ہیں یا مردوں میں وہ زیادہ مقبول ہے۔ وہ میرے سے یہ تقسیم ہانے کے خلاف تھا۔ قاری تو قاری ہوتا ہے اس میں مرد اور عورت کی کیا تقسیم پسند کی اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ تخلیق اس کی ترجیح تھی۔ وہ لکھتا تھا کبھی بہت زیادہ لکھ لیتا کبھی کئی ہفتے اس پر تخلیق کا دورا نہیں ہوتا تھا۔

اسی وہ پہرا ڈاک میں سعید احمد کو وہ لفافے موصول ہوئے۔ ہلکا فاف نکتہ نے بھیجا تھا۔ جس میں بارہ صفحوں پر لکھی ہوئی ایک کمانی تھی۔ "ایک انجینیئر سے مل کر۔" لکھائی بہت کمزور تھی۔ سعید احمد کو پڑھنے میں بہت تروڑ کر ناراض مگر کمانی بہت شان دار تھی جنان دار کہ سعید احمد اس کے سحر سے نکل نہیں پایا۔ نرین کے انتظار میں پٹیت فارم پر بیٹھ جوتے ایک لڑکے کی

کمانی جس کی پہلی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی تھی جو ویٹنگ روم میں سوئی رہ گئی تھی اور اس کی نرین نکل گئی۔ سعید احمد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نکتہ اتنی خوب صورت کمانی لکھ پائے گی۔

دوسرے لفافے پر انتہائی خوب صورت لکھائی میں سعید احمد کا پتا لکھا گیا تھا۔ جو اب پتا موجود نہیں تھا۔ سعید احمد کو وہ لکھائی مانوس لگی مگر یاد نہیں آیا ایسی خوب صورت صاف لکھائی میں کون لکھتا ہے اس نے لفافہ کھولا اور ایک پل کے لیے ساکت رہ گیا۔

اس کی نظرس افسانے میں موجود برتھ ڈے کارڈ پر جم کر رہ گئی۔ کئی پنل سے بنا ہوا انتہائی دلکش کارڈ مصور کی شہکار تخلیق تھا۔ سعید احمد نے کارڈ کھولا۔ "انتہائی محترم سعید احمد صاحب سالگرہ مبارک۔"

وہی لکھائی جو سعید احمد کتابوں کی دکان میں پھول سے بنی لڑکی کے ہاتھ سے لکھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کون تھی؟ سعید احمد نہیں جانتا تھا، مگر سالگرہ کارڈ بھیج کر اس نے باور کرا دیا تھا کہ سعید احمد اس کے لیے انجینیئر نہیں۔ وہ اسے جانتی ہے، تا صرف جانتی ہے بلکہ اسے پہچانتی بھی ہے۔ سعید احمد کا برتھ ڈے جان لینا کوئی بڑی بات نہیں تھی، بہت سے لوگ جانتے ہوں گے، اس کا پتا بھی بے شمار لوگوں کے پاس تھا، اسے خط موصول ہوتے تھے۔ کتا میں اور رملے اسے ملنے تھے، مگر یوں کبھی کسی نے برتھ ڈے کارڈ نہیں بھیجا تھا۔ یہ سعید احمد کے لیے خوشگوار حیرت تھی۔ اس دن کتا کی دکان میں لڑکی نے اسے پہچان لیا تھا؟ وہ اسے جانتی تھی؟ یہ سوال شام تک اس کے ذہن سے چمٹے رہے۔

"اس کا فون نمبر وہیں میں بات کرتا ہوں۔"

عبداللہ نے ایک کٹنے سے پہلے کہا تھا۔ "پانگل ہوئے ہو؟ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ پتا نہیں کون ہے؟ کہاں ہے؟" سعید احمد نے عبداللہ کو بتایا تھا کہ آج اسے ایک انجینیئر لڑکی نے سالگرہ کارڈ بھیجا ہے اور اپنا نام نہیں لکھا۔

"یہ عجیب بات ہے، کوئی کارڈ بھیجے اور اپنا نام نہ



کہنے۔ "عبداللہ بھی حیران تھا۔  
"ہاں مجھے خود تعجب لگا ہے مگر اچھا بھی لگا۔" سعید  
انہوں نے کہا۔

"اچھا ہی ہے۔ سمجھ گیا۔" عبداللہ نے شرارتی انداز  
میں اچھا ہی کو پہنچ کر کہا کیا۔  
"ایسا کچھ نہیں، اچھا ہی۔" سعید احمد نے ہنستے  
ہوئے اسی کے انداز میں "اچھا ہی" کو طویل دیا۔ "اور  
تم بھی ذرا ایسے ایم ایس کم کیا کرو، لگتی لڑکیوں کے نمبر  
پس تمہارے سوال میں؟"

"میں تو ایک ہی ایس ایم ایس کرنا ہوں سہہ باہ  
لڑکیوں کو۔" عبداللہ نے معصومیت سے کہا۔  
"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔" سعید احمد کھٹکھٹا کر  
ہنسا۔

اسی شام بستر کرتے ہوئے عبداللہ کے سامنے سعید  
احمد نے نکت کی کال مانی۔ نکت کے سوال سے پہلے  
ہی سعید احمد نے پوچھ لیا۔

"ایک اجنبی سے مل کر واقعی آپ نے کبھی  
ہے؟" سعید احمد نے سعید کی پوچھا۔  
"ہاں! نکت نے جواب دیا۔

"پہلی کہانی ہے؟" وہ بہت سنجیدہ تھا۔  
"بالکل! میں نے اس سے پہلے کچھ نہیں لکھا۔  
کتابیں بہت پڑھی ہیں مگر لکھا کبھی نہیں تھا۔"  
"مجھے یقین نہیں آتا۔" سعید احمد کو واقعی یقین  
نہیں آ رہا تھا۔

"کیوں؟" وہ حیران تھی۔  
"اتنی اچھی کہانی۔"

"کیا واقعی مر؟" پہلی بار نکت نے نرم لہجے میں  
پوچھا۔ ایسا لہجہ جس میں ایک دم احترام بھی شامل ہو گیا  
تھا۔

"ہاں مجھے بہت پسند آتی وہ بڑا نفل! سعید احمد نے  
کھلے دل سے تعریف کی۔ وہ کم ہی کسی کی تعریف کرنا  
تھا۔ "رنگی؟" نکت کے لیے بھی یہ ناقابل یقین بات  
تھی۔

"بچ بہت اچھی! آپ اچھی رائٹرز ہو۔"

"بعض رائٹرز نہیں مرے۔" وہ اس لیے بول نکلا  
تھی۔ سعید احمد جیسا کہ اس کی تعریف  
کر رہا تھا۔ بہت بڑی بات تھی۔

"آپ لکھو مزید لکھو۔ ایسی اچھی کہانیاں  
لکھو۔" سعید احمد نے اسے چسکی دی۔ عبداللہ نے  
ویدے بخار شرارتی انداز میں سعید احمد کو دیکھا۔  
"مختیار! بگ سوچتے مجھے امید تھیں تھی سہہ  
میں لکھوں گی مزید لکھوں گی مگر سزا ایک وعدہ کریں  
پلیز!"

"وعدہ؟" سعید احمد چونکا۔  
"آپ میری کہانیاں پڑھا کریں گے، مجھے بتائیں  
گے میں تمہیں غلط کہاں ٹھیک ہوں میری اصلاح  
کریں گے تمہیں گے ہاں؟"

"شہرور! میں کہانیوں پر بات کرنے کے لیے ہر  
وقت حاضر ہوں۔" سعید احمد نے کہا۔  
"کہانیوں کے علاوہ بھی بات کرنے کے لیے۔"

عبداللہ نے شوقی بھری سرکوشی کی۔ سعید احمد نے  
اسے حیرا۔  
"نکت ٹھیک؟" آج سے آپ میرے استاد ہیں مرزا!  
نکت کا لہجہ بے حد مستون تھا۔

"ارے نہیں استاد نہیں ہو مجھے پتا ہے وہ میں کہانی  
کے بارے میں آپ کو بتا دیا کروں گا۔" سعید احمد نے  
خلوص سے کہا۔ کال بند ہو گئی۔  
"جلد ہی ایک اچھی افسانہ نگار کی کتاب چھاپنے  
کے لیے تیار رہو پلٹو۔" سعید احمد نے کوک کارپ  
لیتے ہوئے عبداللہ سے کہا۔

"یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے صاحب؟"  
عبداللہ نے سعید احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر  
پوچھا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے پارا تھا نے دار نہ بنا کرو۔"  
سعید احمد ہنسا۔

اپریل کی پہلی صبح نکت نے سعید احمد کو عجیب سی



اپریل کی پہلی صبح نکت نے سعید احمد کو عجیب سی

خوشی اور غم کے دو راسے پر لا کر رکھا۔

"۱۲ ستمبر! میں بھائی کے ساتھ گھر جا رہی ہوں  
واپس ہاسٹل چھوڑنا ہے۔" اس کے لہجے میں سرسرت  
تھی۔

"اچھا؟ یہ تو بہت اچھا فیصلہ ہے۔" سعید احمد کو بھی  
خوشی ہوئی۔

"سوچا تھا اب کبھی لوٹ کر نہیں جاؤں گی مگر بھائی  
پہلے ہی لینے تو اسے مایوس نہیں کیا۔" وہ بہت خوش  
تھی۔

"میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں، واپسی کا سفر  
اچھا فیصلہ ہے۔" سعید احمد اس کی خوشی میں شامل  
تھا۔

"آپ کو خوشی ہوئی مرزا؟" اس نے پوچھنا شروع  
میں پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" سعید احمد کے لہجے میں بھی  
خوشی نمایاں تھی۔

"کیوں سہہ میری واپسی پر آپ کیوں خوش  
ہیں؟" اس نے تعجب سے سوال کیا۔ سعید احمد ایک ہاتھ  
کے لیے چپ رہ گیا۔ اسے واقعی کچھ نہیں آیا  
نکت کی خوشی میں اسے کیوں خوشی محسوس ہو رہی  
تھی۔

"جانتا نہیں مارا! نکت نے دوبارہ پوچھا۔  
"تم خوش ہو اس لیے مجھے بھی خوشی ہوئی۔" سعید  
احمد نے مختصر جواب دیا۔

"میری خوشی سے آپ کی خوشی کا کیا تعلق؟" اس  
نے پھر خوشی بھرا سوال کیا، ایسا سوال جس کا جواب  
سعید احمد دے نہیں سکا۔

"ایک اور بھی خوشی کی خبر ہے مرزا! نکت سے  
خوشی اچھائیے نہیں چھپ رہی تھی۔

"خوشی کی خبر؟" سعید احمد نے سوال دہرایا۔  
"جی سہہ میں چھ گینال کی کوٹھی میں چلی جاؤں  
گی۔ میں نے بھائی کی بات مان لی ہے۔" نکت کی  
بات مکمل ہونے کے بعد بھی دیر تک سعید احمد کی زبان  
سے کوئی لفظ ادا نہیں ہوا۔ نکت چھ گینال کی کوٹھی

میں چلی جائے تھی بھائی کی بات مان کر وہ مل مالک سے  
شادی کر لے گی۔

نکت اس فیصلے پر بے حد مسرور تھی، مگر سعید  
احمد اس کی بات من کرنا رنجیدہ کیوں ہو گیا تھا؟ لفظ  
اس کی زبان کا ساتھ کیوں چھوڑ گئے تھے؟ وہ چپ کیوں  
رہ گیا تھا؟ اس سے بولا کیوں نہیں گیا؟ اس نے خود کہا  
تھا وہ نکت کی خوشی میں خوش ہے تو اب کیا ہوا تھا؟

نکت خوش بھی سعید احمد ناخوش کیوں تھا؟  
"مرزا! آپ میری بات من رہے ہیں؟" نکت نے  
پوچھا۔

"ہاں۔" سعید احمد نے ہنسنے کی بجائے  
"میں نے ٹھیک کیا نا؟" وہ تائید چاہ رہی تھی۔  
"ٹھیک۔" سعید احمد نے ٹوٹے لفظوں  
میں کہا۔

دونوں طرف کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔  
نکت چپ ہو گئی تھی سعید احمد بھی چپ تھا۔  
"آج عزم اپریل سے سہہ اپریل کا پہلا دن یاد رکھا  
کریں پلیز! ایک دم نکت کا تھکاؤ والی لہجہ ابھر آیا۔ اس  
کی آواز میں ایک ایسا درد تھا جس نے سعید احمد کو شواہ  
کر دیا۔ نکت نے بیوقوف لولا تھا۔ وہ اپریل فولڈ ٹارڈی  
تھی مگر آج اس کے جھوٹے سعید احمد کو ایک صبح  
سے روشناس کر لیا تھا کہ نکت سے اس کا تعلق محض  
ایک ادبی رشتہ نہیں رہا۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا  
تھا۔

اسی دوپہر سعید احمد نے عبداللہ کو جواب دیا۔  
"میری نئی کتاب کا ٹائٹل وہ لڑکی بنائے گی جسے میں  
جانتا نہیں اور وہ مجھے خوب صورت کارڈ بنا کر بھیجتی  
ہے۔"

"مجھے مسودہ پر ایس میں بھیجنا ہے آپ مکمل کرتے  
ہیں۔" عبداللہ حیران رہ گیا۔

"تیسری کتاب اس کے ہاتھ کے بنے ٹائٹل سے  
ہی چھپے گی۔" سعید احمد نے ختمی بات کی۔ عبداللہ سر  
پکڑ کر بیٹھ گیا۔ کارڈ بھیجے والی نہ جانے کون تھی؟ کہاں  
تھی؟







کاسوت خرید لیا تھا۔ کیا یہ اہم بات تھی کہ وہ بطور افسانہ تو نہیں کامیابی کے ذریعے طے کر رہی تھی؟ یا یہ امر باعث خوشی تھا کہ اس نے اپنے لیے کچھ خریدنے کے بجائے ان بیویوں سے سعید احمد کے لیے کھدرا کاسوت خرید لیا تھا۔ کھدرا۔ جو سعید احمد کا برسوں سے پسنایا تھا اسے بے حد پسند تھا۔ سعید احمد نے ان دونوں باتوں پر غور نہیں کیا وہ تو اس انجمن۔ کی سلیجھن میں بھی نہیں پڑا کہ نکتہ چیل کر اس سے ملے اس کے فلیٹ تک چلی آئی تھی۔ وہ تو جملے کے آغاز میں اندازہ مخاطب پر گم صم تھا۔ "سعید احمد! آج پہلی بار نکتہ نے اسے نام سے مخاطب کیا تھا وہ ہمیشہ اسے استاد جی یا سر کر کے مخاطب کرتی تھی اور آج۔ سعید احمد۔"



جون کی آنھوں صبح عبد اللہ نے سعید احمد کے تیسرے افسانوی مجموعے "پڑاؤ" کی پہلی کاپی اس کی پیشکش پر رکھ دی۔ ہمیشہ کی طرح عبد اللہ نے کتاب محبت سے کمپوزی اور خوب صورتی سے شائع کر کے محبت کے ساتھ سعید احمد کو پیش کی تھی۔ عبد اللہ کی یہ اور سعید احمد کو بہت پسند تھی۔ وہ ایک کامیاب پیشکش تھا اور اپنے کام میں باہر تھا۔ اس بار سعید احمد کو اپنی کتاب سے زیادہ اس کے سروق سے دلچسپی تھی۔ وہ شدت سے منتظر تھا۔

"بیک ٹائٹل پر سر بی کی تصویر بھی چھپ جاتی تھی۔"

"تو لڑکیوں کو پتا چل جاتا سعید احمد بیس سالہ لڑکا نہیں ساٹھ سالہ بڑھاپے جس کے بال سفید اور واٹ تھی۔" سعید احمد نے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں سر بی لڑکیوں کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ فرٹ ٹائٹل زیادہ خوب صورت ہے یا بیک ٹائٹل۔" عبد اللہ نے بھی سعید احمد کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔ سعید احمد اس کی حاضر جوابی پر مسکرایا۔

سعید احمد نے "پڑاؤ" کے پہلے صفحے پر اہتمام کے

ساتھ اپنی لکھائی میں لکھا۔ "خوب صورت کارڈ بھیجنے والی لڑکی کے لیے"۔ بچے دستخط کر کے اسے لکھنے کو اس نے کئی بار پڑھا پھر اپنی حماقت پر ہنسنا شروع کیا۔ وہ بھیجنے والی لڑکی کو جانتا نہیں تھا۔ اس سے واقف نہیں تھا۔ اس کا پتا معلوم نہیں تھا۔ مگر وہ اسے اپنے دستخط کے ساتھ اپنی نئی کتاب کی پہلی کاپی بھیجنے کا ارادہ کر بیٹھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی اس سے بڑی حماقت وہ پہلے کرتے والا تھا۔ جب اس نے "پڑاؤ" کا انتساب ایک اجنبی لڑکی کے نام کرنے کا سوچا تھا۔ ہزار پروں میں چھپی ہوئی لڑکی جس سے اس کا رابطہ ڈاک سے تھا وہ بھی ایک طرف۔

"خوب صورت کارڈ بھیجنے والی اجنبی لڑکی کے

نام۔"

کا انتساب لکھ کر اس نے کاٹ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس انتساب کی ہزار وضاحتیں اسے کرنا ہوں گی۔ عبد اللہ بال کی کھال اتار لے گا اور ج تو یہ ہے کہ عبد اللہ سے انتہائی بے تکلفی کے باوجود وہ اس لڑکی کا ذکر عبد اللہ کے سامنے کرنے سے اب گریزاں ہونے لگا تھا۔

"خوب صورت کارڈ بھیجنے والی لڑکی کے لیے۔" لکھ کر کتاب اس نے اپنی الماری میں رکھ لی۔



جون کی آنھوں شام عبد اللہ نے سعید احمد کو فون کیا۔

"سر بی! کہاں ہیں؟" اس کی آواز چمک رہی تھی وہ بہت خوش تھا۔

"میں شہر سے یاہر جا رہا ہوں کل لوٹوں گا کیوں؟"

"آپ تیس چار ہے ہیں۔ بیس منٹ میں میرے آفس چھٹیں۔" عبد اللہ نے دو ٹوک بات کی۔

"کیا مطلب؟" میں اس وقت اسٹیشن پر ہوں گاڑی آنے والی ہے۔" سعید احمد نے حیرانی سے کہا۔

"گاڑی آنے دیں اور جانے دیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔" کلمہ کہ عبد اللہ نے کل شہم کر دی۔

سعید احمد کو گو کا شکار بار بار اس کا نمبر ڈائل کرنا پڑا مگر عبد اللہ نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" سعید احمد الجھا ہوا عبد اللہ کے پاس پہنچا۔

"نہیں! عبد اللہ نے ٹھنڈے پانی کا گلاس اسے تھماوا۔

"پہلے بناؤ۔" سعید احمد نے گلاس میز پر رکھ دیا۔ اس کا مزاج واقعی بگڑ رہا تھا۔

"ان سب پر آپ کے دستخط چاہئیں۔" آؤ گراف۔" عبد اللہ نے کونے میں جمود تہ کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سعید احمد کی نئی کتاب "پڑاؤ" کے بنڈل تھے۔

نکتہ پر۔" سعید احمد حیرت زدہ تھا۔

"جی! ایک ہزار ہی تو ہیں۔"

"آؤ گراف؟"

"جی ہاں! جنہیں دستخط بھی کہتے ہیں۔" عبد اللہ اس کی بے چینی سے لطف لہو زور رہا تھا۔

"کیوں؟" سعید احمد مزید الجھتا جا رہا تھا۔

"میں نے ان کتابوں کی قیمت مزج آؤ گراف وصول کر لی ہے اس لیے۔" عبد اللہ نے اطمینان سے کہا۔

"کیا؟" سعید احمد کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"جی! ایسا ایڈیشن بک گیا ہے، ایک ہزار کتابیں، ایک گا بک! عبد اللہ نے ایک کتاب کا سلا منصف کھول کر سعید احمد کے سامنے رکھ دیا اور رقم پکڑانے کی کوشش کی۔ "بسم اللہ!"

"وہس نے خریدی ہیں؟" سعید احمد نے قلم نہیں پکڑا۔

"وہس نکتہ۔" نے! عبد اللہ نے سعید احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرارت بھرنے لگے میں کہا۔

"نکتہ نے؟" سعید احمد نے وہہرایا۔ اسے لگا اس کا سارا وجود کٹن ہو گیا ہے۔

"وہ پے منٹ کر گئی ہے۔"

"اگر گئی ہے؟" سعید احمد چونکا۔

"جی ہاں! وہ آئی تھی خوب صورت لڑکی ہے، خوب ہنستی ہے تو اس کے گالوں میں ڈمپھل پڑتا ہے اور ٹھوڑی کے نیچے ایک گل بھی ہے۔" عبد اللہ نے خوشی میں کہا مگر سعید احمد کو زندگی میں پہلی بار عبد اللہ کا شہنہ لہجہ بہت برا لگا۔

"نکل تک کتاب کی ہزار کاپیاں اس کے ہاتھ میں پڑ چکی ہیں۔"

"ہزار؟"

"اس نے شرط رکھی تھی پہلے ایڈیشن کی ساری کاپیاں ہر کاپی پر سعید احمد کے دستخط! ویدے کے مطابق مجھے وہ کاپی بھی مرس نکتہ کو دینی ہے جو صبح آپ کو دی تھی۔"

سعید احمد کھلے منہ کے ساتھ عبد اللہ کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔ کئی بل کی خاموشی کے بعد اس نے ایک جملہ کہا۔

"جسے سن کر عبد اللہ بھی چونک گیا۔

"وہ کاپی! میں نہیں دوں گا۔"



جولائی کی آخری شام تک سعید احمد اور نکتہ ایک دوسرے کو اپنے آپ سے زیادہ جان کھتے تھے نکتہ کو پتا چل چکا تھا کہ نظر ہر ایک مضبوط شخصیت کا مالک سعید احمد اندر سے ٹوٹ چھوٹ کا شکار تھا جی کا ہارا ہوا شخص ہے، جو ہجوم سے گھرایا ہوا لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ اس کے والدین کی انیس کی تاجانی نے اسے بھی توڑ کے دکھ دیا ہے۔ ماں باپ کی علیحدگی کے بعد وہ چھوٹی عمر میں بڑے دکھ پال بیٹھا تھا۔ اس نے دونوں کو چھوڑ دیا تھا، ماں باپ کی زندگی سے نکل آیا تھا۔ سعید احمد کو خبر ہو چکی تھی کہ نکتہ والدین کی موت کے بعد بھائی کی عدم توجہی کا شکار لڑکی ہے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی کونڈوں کی جائیداد عیاشی میں اڑانے والا بھائی اپنی مرضی کے فیصلے اس پر مسلط کرنا چاہتا ہے، مگر وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی خواہش مند ہے۔ بینک بیلنس موجود تھا، اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی مگر وہ ہانسنے والا اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔



علیحدہ طور پر لکھا گیا ہے۔ جسے دیکھنے والے ہاٹل میں آگئی تھی جنہاں اسے محفوظ کا احساس تھا۔

سعید احمد جان گیا تھا گنت کو بھی اس کی طرح شب بے داری کی عادت اور کے رستوں پر دوڑ تک چلنا پسند ہے۔ گنت سمجھ گئی تھی کہ کالا رنگ سعید احمد کی کمزوری اور تیز بادشوں میں ننگے پاؤں چلنا سعید احمد کا جنون ہے۔

ہر شب بارہ بجے سعید احمد کا ایس ایم ایس "گنڈ ہائٹ" موصول ہوتا تھا اور پھر گنت صبح تک اسے چگائے رکھتی تھی۔ ہر صبح "گون سارنگ پٹنوں؟" گنت پوچھتی تھی اور سعید احمد ہر روز اسے کالے رنگ کے پینٹوں پر مجبور کر دیتا تھا وہ دنوں کا صبح شام کا ساتھ تھا ہر ل کی مہربانی تھی مگر سعید احمد نے گنت کو دیکھا تھا نہ گنت سعید احمد کے سراپا سے آشنا تھی۔

جولائی کی آخری شام پہلی بار وہ دونوں ہاٹل کے سامنے لان میں اکی گھاس پر ایک ساتھ بیٹھے۔ گنت نے نکالی تو میں نکلی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر کالا وہیلہ تھا۔ کلائی پر کالے ڈائل والی گھڑی۔ پیروں میں کالے سینڈل۔ کتوں میں کالے بندے۔ فلی ٹیل پائس "کالے پاؤں والی کی آنکھوں کی رنگت بھی کالی تھی۔ اس کے قدم سے قدم ملاتے ہوئے سعید احمد نے دھیرے سے اس کی کلائی تھام لی۔ دونوں کے قدم رگ گئے۔ سعید احمد نے اس کی کلائی کالج کی کالی چوڑیوں سے بھردی۔

وہ پہلی شام تھی جب دونوں پہلی بار ملے۔ پہلی شام جب دونوں نے ایک لفظ نہیں بولا۔ گنتوں بے تکان ہونے والی گنت چپ رہی اور سانس لے لے بغیر یا نہیں کرنے والا سعید احمد خاموش!

اسی شام وہ ابھی کے سفر پر اسے میں سعید احمد کے موبائل پر ایک ٹائٹل نمبر سے ایک ٹائٹل نمبر سے آواز نے ایک عجیب سا سوال پوچھا۔ "محبت یک طرفہ ہو سکتی ہے سر؟"

سعید احمد نے وہ آواز پہلی بار سنی تھی۔ وہ سوال پہلی بار پوچھا گیا تھا۔ اس کے جواب سے پہلے ہی پوچھتے والی نے رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ کال ختم نہ کرتی تو پہلی سے جواب نہ ملتا۔ سعید احمد جب وہ جا رہا تھا وہ آواز پہلے نہیں سنی تھی مگر سعید احمد کو لگا وہ لہجہ اس کی ساجت میں بدلت سے محفوظ ہے۔ وہ لہجہ از مخاطب انہی تھا نہ مخاطب کرنے والا انجان۔ وہی لڑکی تھی جو پچھلے کئی دنوں سے اسے روزانہ ایک کارڈ بھیج رہی تھی؟ کیا وہ سعید احمد کی محبت میں۔ ایک طرف محبت میں سعید احمد ایک دم سرشاری و اداسی کے حصار میں جھک گیا۔

سونی کلائی والی کی ہاتھ چوڑیوں سے بھر دینے کی سرشاری تھی یا اس سے پہلی ملاقات کی۔ کارڈ بھیجنے والی کی پہلی کال نے اسے شاد کر دیا تھا یا اس کی ایک طرف محبت کے اقرار نے۔

گنڈ ہائٹ پر بارہوا تھا۔ گنت سعید احمد کے گھر میں آگئی تھی اور گئی دوسرے کو اس فریب میں مبتلا رکھنا سعید احمد کے لیے ممکن نہیں تھا۔

آنسو کی سولہویں شب اس لڑکی کے تھکنے نے سعید احمد کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ جو اسے خوب صورت کارڈ بنا کر بھیجتی تھی ہر صبح "صبح بخیر زندگی" کا ایس ایم ایس کرتی اور عجیب سوال پوچھتی تھی۔ ایک بار اس نے پوچھا تھا۔ "بیک وقت دو مختلف لوگوں سے محبت ہو سکتی ہے سر؟"

سعید احمد شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ کیا وہ اسے آقا رہی تھی؟ کیا وہ جانتی تھی کہ سعید احمد گنت کی محبت میں مبتلا ہے؟ کیا وہ گمان کر بیٹھی ہے کہ سعید احمد اس ان دیکھی لڑکی کے عشق میں گرفتار ہے؟ وہ کیوں پوچھ رہی ہے بیک وقت دو لوگوں سے محبت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ پھر ایک شام اس نے پوچھا تھا۔ "کسی کو چاہتا اور کسی سے چاہا جانا اختیار میں ہے سر؟"

سعید احمد اس سوال کا جواب بھی نہیں دے سکا تھا۔ کیا وہ اسے باور کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ سعید احمد کو چاہتی ہے اور یہ اس کے اختیار کی بات نہیں؟ کیا وہ جتنا چاہتی ہے کہ سعید احمد اس سے چاہت کا اظہار نہیں کرتا یہ بھی اس کے بس میں نہیں؟

سعید احمد اس کی بات سن کر چپ رہتا تھا۔ وہ بھی جواب کے بغیر خاموش ہو جاتی۔ گل شرم کر رہی تھی مگر آست کی سولہویں شب اس نے سعید احمد کو عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔

"کسی کے بغیر جتنا گل ہو تو۔؟" اس کے لیے میں است کرب تھا۔ ایسا کرب جس نے سعید احمد کو بھی درد کا کائنا چھو دیا۔ "اسے اپنا لینا چاہیے۔" سعید احمد نے بمشکل کہا۔

"وہ اپنا نہ چاہے تو؟" دیکھی لڑکی کی جھکی آواز نے سعید احمد کو دکھ میں مبتلا کر دیا۔ اس کا جی چاہا وہ اسے سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ بتا دے کہ اس نے گنت کی کلائی کو کالج کی چوڑیوں سے بھر دیا ہے تو جب صاف اسے قدم کا شرمہ "سعید احمد کے الفاظ اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔

"میں۔۔۔ مرجاؤں گی!" پانچ لڑکی ایک دم پھٹک بڑی۔ فون مڑو ہو گیا۔ سعید احمد کو لگا اس کی شریانوں میں دوڑنے والا لویک دم رگ گیا ہے اس کے ہاتھ پیچھے جان ہو گئے ہیں اور مر گیا ہے اسے اس اجنبی لڑکی سے محبت نہیں تھی مگر وہ اس محسوس کرنے لگا تھا کہ اس لڑکی کے دکھ نے سعید احمد کو کالٹ کے رکھ دیا تھا۔

اس شام پہلی بار سعید احمد نے گنت کو اس پانچ لڑکی کے بارے میں بتایا۔ "میں سمجھ نہیں رہا وہ لڑکی ایک طرف میری محبت میں پانچ ہو رہی ہے یا۔"

"تم فیصلہ نہیں کر پارے؟ وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔" گنت نے اس کی بات کٹ دی۔ اس کی نظریں سعید احمد کے چہرے پر

میرا سحر سے سحر سجاری ادب

# مرزا ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

قراری 2011  
کام کی ایک نئی شکل



پہلے سحر رات کے مسالہ

ان کے سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

کلموں

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا

سحر و جادو کی بات کرنا اور ان کے سحر و جادو کی بات کرنا



جی نہیں جو اس سے آنکھیں نہ ارا تھا۔  
"میں؟ اس کی محبت میں۔"

"ہاں! آج یہ ہی ہے سعید احمد! نکلتے ہوئے  
پہنچے۔"

"یہ بھوت ہے۔ یقین جانو مجھے اس سے محبت  
نہیں ہے۔" وہ کھوکھے کبے میں گتت کو یقین دلانا  
چاہتا تھا۔

"تمہیں خود پر یقین نہیں ہے۔ اپنے آپ پر  
اعتبار نہیں ہے۔" نکلت نے مضبوط لہجے میں کہا اور  
گرمی کی پشت سے سر ٹیک لیا۔ اسے لگا اس کا ریت  
گھر وندہ کوئی پاؤں تلے روند گیا ہے۔

جوس کے گلاس میز پر لبالب بھرے بڑے دسے  
سعید احمد اور نکلت دونوں اندر سے خالی ہو کر اٹھ چکے  
تھے۔



ستمبر کی دوسروں صبح تک سعید احمد نے دوبارہ کبھی  
اس لڑکی کی کل نہیں سنی۔ اس کا ایس ایم ایس نہیں  
بڑھا۔ پڑھے اور جواب دہیے بشرطیٹ کر دیا۔ اس  
کے پیچھے ہوئے کارڈ نہیں دیکھے۔ بند لٹانے گھرے  
میں کھڑے پڑے تھے۔ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا  
ورسے یک طرفہ محبت کے روک میں قید رکھنا نہیں  
چاہتا تھا۔ وہ اس سے رابطے کا سلسلہ توڑ چکا تھا۔  
یک واقعے "ایک مکان کی بنیاد پر وہ نکلت کو کھودینے کی  
مطلبی نہیں کر سکتا تھا۔ نکلت جس کے بغیر سعید احمد کا  
بیتاب محال تھا۔

ستمبر کی بارہویں صبح عبداللہ اس سے ملنے آیا اور  
اس کے کمرے میں بھرے ہوئے ڈاک کے لفافے  
سمیٹ کر لے گیا۔

"مضبوط صورت کسانا والی یقیناً" خود بھی خوب  
صورت ہوئی سربئی! "اس نے عجیب سی بات کی تھی۔  
سعید احمد نے اس کی بات کا جواب دیا۔ اسے ایشی  
لڑکی کے کارڈ والے لفافے لے جانے سے روکا۔ وہ  
اس کسانا کو اب ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس قصے کو عبداللہ

سے بھی چھپانے کا خواہش مند نہیں رہا تھا۔



اسی شام وہ نکلت کو اپنے نام کی انکو تھی پہنانے لے  
گیا۔

"سعید! سنرا خواب آج تعبیر ہو رہا ہے سعید احمد۔"  
نکلت نے شوگیں میں سچے سونے کے جھلملاتے  
زیوروں کو دیکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"یہ خواب میں نے بھی دیکھا تھا۔" سعید احمد بھی  
سے حد خوش تھا۔

"مجھے کالے رنگ کا رنگ پڑنا۔ میں نے زندگی  
میں سے باقی سارے رنگ نکال دیئے ہیں سعید احمد۔"  
نکلت نے جب لڑی شاپ سے نکلتے ہوئے کہا۔ سعید  
احمد ایک پل کے لیے کھڑا رہ گیا اور پھر نکلت کے پیچھے  
چلا آیا۔

"ایک منٹ۔ پٹیرا" دروازے سے نکلتے ہوئے  
سعید احمد کے قدم اس لڑکی نے روک لیے جس کا  
سارا جسم چاروں کی پٹا ہوا تھا۔ چہرہ نقاب میں چھپا ہوا۔  
جو پائی پاؤں کے نکالوں کی زبان میں پھول سجھانے  
ہوئے ملی تھی۔ جو اسے کارڈ بھیجتی تھی جس نے اس  
کی کتاب کا سروق بنایا تھا جو اسے روزانہ ایس ایم  
ایس کرتی اور عجیب سوال پوچھتی تھی اور جس سے  
سعید احمد کو محبت نہیں تھی۔

اس کی آواز میں عجیب سا درد تھا "مجھے میں سبے پناہ  
کر رہی۔"

"تمہیں؟" سعید احمد کے قدم روک گئے تھے نکلت  
بھی ٹھہرنی تھی۔

"فائزہ!" اس نے کہا۔ سعید احمد رکا ہوا۔ نکلت کے  
قد پر دھیرے دھیرے اٹھنے لگے وہ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔

"نکلتے جانا ہے۔" سعید احمد نے اس کے پاس سے  
گزر کر نکلت کے پیچھے جانا چاہا۔

"میں بھی چلی جاؤں گی" ہمیشہ کے لیے۔ "اس کی  
آنکھیں یک دم پھلک گئیں۔ سعید احمد بے بس لڑکی  
کے پاس سے گزر نہیں سکا۔ اس نے چاہا کہ وہ آج

اسے صاف صاف بتا دے کہ وہ نکلت سے محبت کرتا  
ہے۔

"وہ ناراض ہے۔ نکلت سے بات نہیں کرتا" میری  
بات نہیں سنتا میں مرنا ہوں گی مرنا! زندگی ہوئی آواز  
نے سعید احمد کو چونکا دیا۔ وہ یوں چونکا جیسے طویل  
خواب سے جاگ گیا ہو۔

"وہ کون؟"  
"سعید! اللہ! بل کے ہاتھوں مجبور لڑکی نے سعید  
احمد کی پلکیں نم کر دیں۔ ساری کہانی اسے سمجھ میں  
آگئی تھی۔ وہ عبداللہ سے محبت کرتی تھی۔ عبداللہ کا  
سعید احمد سے محبت کا رشتہ تھا اور عبداللہ سے بڑے  
ہر شے سے فائزہ کو محبت تھی۔

نکلت دور نکلی تھی سعید احمد کی زندگی سے دور  
سعید احمد اسے روکنا نہیں پایا۔



اکتوبر کی سوگوار شامیں گزرنی تھیں "زمیر کے  
اواس دن" تھی۔ وسیر کے رت کے گتت گئے تھے  
جنوری بھی خالی ہوا تھا۔

نکلت تے جاتے ہوئے صرف ایک ایس ایم ایس  
کیا تھا۔ "اس شہر میں رہنے کا جواز ختم ہو گیا۔" اور وہ  
شہر چھوڑ گئی تھی۔

اس شام کے بعد فائزہ نے کبھی کال نہیں کی تھی۔  
خوب صورت کارڈوں والے لفافے لے جانے کے  
بعد عبداللہ کبھی بھول کر بھی اس طرف نہیں آیا تھا۔  
سعید احمد نے سب ہی بیاروں سے رابطے توڑ لیے  
تھے مگر ہر شب اس نے خلوتوں میں سے نکلت کے لیے  
دعا کی۔ ہر صبح اس نے ہاتھ اٹھا کر پروردگار سے اواس  
لڑکی کے لیے عبداللہ کو مانگا۔

ہر دو عا میں نے عبداللہ کو شامل رکھا۔

آج کئی ماہ بعد نکلت کا پیغام سعید احمد کے موبائل پر  
نمودار ہوا تھا۔ "تمہارے شہر کی ہوا میں سانس لے  
رہی ہوں۔"

سعید احمد کو لگا آج مدت بعد اس کے شہر کی ہوا

خوشگوار ہوئی ہے۔

"عبداللہ کی بارگاہ میں شرفیہ ہوئی آ جاؤ۔" اس  
کا ایس ایم ایس آیا تھا اور سعید احمد کا دل پھیل گیا تو ڈر کر  
باہر آنے والا تھا۔

"عبداللہ کی شادی تھی! بس کون تھی؟"

"فائزہ! اگر وہ نہ ہوئی کوئی اور تو وہ مر جائے  
گی۔" سعید احمد کو فائزہ کا دکھ بے چین کر گیا۔ اتنا بے  
چین کر اس نے لانا کی چادر اتار دی اور بن بلائے شرفیہ  
ہوئی پہنچ گیا۔

نکلت نے آج بھی کلا سوٹ پہنا ہوا تھا۔  
بچھے ہوئے چہرے والے سعید احمد کو اس نے دکتے  
چہرے کے ساتھ خوش آمدید کہا۔

"مجھے بت اچھا لگا سربئی۔" اسماٹ عبداللہ سفید  
شیر والی میں بست تھی رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر  
ایسیج سے اتر آیا تھا۔ سعید احمد کی کپٹیاں سلگ رہی  
تھیں۔ اس کا جی چاہا وہ عبداللہ کو کمریوں سے پکڑ کر  
چھوڑانے اور پیچ کر پوچھے۔ "تمہیں کیا حق  
پہنچتا ہے کسی کے خواب اچھاڑنے کا؟"

گروہ ایسا نہیں کر سکا۔

نکلت اسے بازو سے پکڑ کر ایسیج کے پاس لے آئی۔  
بچھے دل والا سعید احمد اس منظر سے جلدی نکل جانا  
چاہتا تھا۔

"کسی کے بغیر جینا محال ہو تو سربئی!" اچانک اس  
کے کان میں عبداللہ نے شوخی بھری سرگوشی کی۔ سعید  
احمد نے چونک کر عبداللہ کو دیکھا۔

"مجھے لمبی لمبی آنکھیں کرنے والی سے نہیں ملیں  
گے؟" عبداللہ نے سعید احمد کو دلہن کے سامنے لاکھڑا  
کیا۔

"میں نے کہا تھا! اس کے بغیر مر جاؤں گی۔" سر  
جھکا کے دھیمی آواز میں کہا۔ سعید احمد کو لگا جیسے وہ تپتے  
صحرے سے یک دم گھٹی چھاؤں میں آ گیا ہے۔ اس نے  
وہیں کھڑے کھڑے سب کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا  
نکلت نے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی میں بوسے دیا۔





مخاندنگار و خانان

کلیں چلیں

قسط ۵۸

”اور تمہارا فیصلہ! ایک لمبی چپ کے بعد، مست پر امید نظروں سے دائم کو دیکھتے ہوئے عزہ نے سہم سہم آواز میں پوچھا۔

جواب میں ایک گھبر خا موٹی تھی۔ عزہ اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ پھر جیسے ٹھک کر اس نے نظریں دوسری طرف کر لیں۔

”میرا فیصلہ۔ کبھی بھی۔۔۔ جب وہ اس کے جواب سے مایوس ہو چکی تھی تو دائم نے مست ناپ تول کر کہنا چاہا۔ عزہ نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔

”مجھے تمہارا جواب مل گیا ہے، اب کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہت تیزی سے اس نے یہ دونوں جملے بولے، لمحہ بھر کو اسے نگاہ اس کا آدھا سانس حلق کے نیچے ہی کسی خلا میں گم ہو گیا ہے اور اس کا کلا کھٹنے سا لگا۔ گلے کو ہاتھ سے دبا کر اس نے بیشتر سانس باہر کو کھینچا۔



”تم ابھی بھی کچھ نہیں سمجھیں؟“ وہ اس کی کیفیت سے بے خبر تھی سے بولا۔ ”ابھی بھی وہی جلد بازی وہی جگت سے تمہارے اندر جو قناعت کسی فیصلے پر پہنچ جانے اور نتائج اخذ کرنے کی عادی ہے۔“

اس کی نگاہوں میں شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔

”ابھی بھی جگت میرے اندر ہے؟“ وہ غجب بھرے انداز میں بولی۔

”یہ جگت پسندی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم خود سے ہی ہر نتیجہ نکال لیتی ہو۔“ وہ چڑے ہوئے انداز میں بولا۔

”اور کتنا میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ روکا تھا کہ عورتی جلدی اتنا بڑا فیصلہ مت کرو مگر اس وقت بھی یہی جلد بازیاں۔“

”پلیز مجھے اب اور کچھ نہیں کہنا سنا۔۔۔ آپ جا سکتے ہیں۔“ اس کے حلق میں تنگیں پائیوں کے گولے سے اگلنے لگے تھے۔

ماں باپ کے بعد اب وائٹ کا سے یوں اکیلا چھوڑ دینے کا فیصلہ۔ یہ سب کچھ سہہ سہہ جانا آسان سمجھا تھا۔ وہ اب اس سے صرف اپنی رعایت چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد سماں سے پٹا جائے اور وہی بھر کر کہہ بند کر کے روئے لٹاتا۔ اتنا کہ پھر زندگی بھر کے لیے اس کی آنکھیں اپنا پٹیوں سے خالی ہو جائیں۔

”اور جو تم سے محبت کرتے ہیں تم انہیں اتنا سنا ابھی حق نہیں دو گی کہ وہ تمہیں ذرا سی مرزوش ہی کر سکیں۔“

پھر سے شکایتی لہجے میں بولا۔ اس کی نظریں عزم کے مختصر چرے پہ جمی تھیں۔

”ذرا سی مرزوش۔۔۔ اس نے انہی سے آنکھیں بند کر لیں۔“

”اس ذرا سی مرزوش کا سلگنا جسم جو اس کے اندر سانس لینے کا تھا معلوم نہیں آئندہ آئے والے دنوں میں وہ اسے بیٹے بھی رہتا یا نہیں۔ ابھی تو وہ مر لیا سوال ہی ہوتی تھی۔ سہا ہر والوں کے ارد گرد والوں کے پھلے منہ کی پتھر۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی آخری فیصلہ وہی ہو گا جو اس کے اندر سے آئے گا اور وہ کیسا اور کتنا اور خوفناک ہو گا اور اس فیصلے کے ماتحت اس کی آنے والی زندگی کیسے گزرے گی یہ خیال اسے ابھی سے ہر سماں کر رہا تھا۔

”میں نے ساری زندگی ہر طرح کا فیصلہ چھوٹا ہوا بڑا، معمولی یا غیر معمولی خود کیا ہے۔“ وہ جانے کس پل اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اب نظریں اس کے ہر سماں چہرے پر جمائے کھ رہا تھا۔

”عزہ کا جی چاہ رہا تھا اپنے پیچھے ایسا تہا ہلا دھکا دے کر گرائے اور سماں سے بھاگ جائے کسی بھی آخری فیصلے کو سے بغیر!“

”مگر اس چہرے چھوٹے بڑے معمولی غیر معمولی فیصلے میں میرے ہر تنہی کی رضا شامل ہوتی تھی۔ کبھی ان کی رضا مجھے پہلے مل جاتی اور کبھی ذرا بعد میں میری کچھ کو پیش اس میں شامل ہوتی اور کبھی وہ خود ہی میرے مزاج کو دیکھ کر سمجھ جاتے کہ اب انہیں یہ سب کرنا ہی پڑے گا۔“

”اوہ تو آپ اپنے مزاج کو ابھی اس سچ چرے کے جرات میں گئے جس سے خوفزدہ ہو کر یا بلیک میل ہو کر آپ کے پیر تنہا یا آخر آپ کا کوئی بھی فیصلہ منظور کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“ وہ ایک دم سے پہلے والی عزم میں گر بولی۔

”تو پھر میری طرف سے سوری۔“

”وائٹ نے بے اختیار اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا۔“

”ابھی نہیں۔ ابھی کچھ بھی نہیں کہو۔“

”پلیز۔“ اس نے تیزی سے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹایا۔

”تمہارے ایڈووکیٹ کے جھگڑے سے ہماری محبت کی پوری عمارت جو ابھی تو تعمیر شدہ تھی سوکھے پتے کی طرح ہلرز رہی ہے۔ سو پلیز ابھی پھر سے کوئی جلد باز سا فیصلہ نہیں کرو۔“ وہ ذرا سا مسکرا کر آنکھوں میں گہری سنجیدگی سے

بولا۔

”اور جو فیصلہ آپ کے ہر تنہی ابھی فرما کر گئے ہیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”وہ ان کا حق ہے۔ میں نے انہیں استعمال کرنے دیا مگر عزم یہ میری زندگی ہے جس طرح اپنی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا مجھے شعور ہے حق حاصل رہا ہے تو میں یہ حق کسی کو آسانی سے کیسے ٹھوہٹھ کر سکتا ہوں پھر مجھے اس طرح کمزور بنانے پر بھی تم نے مجبور کیا۔“

اور وہ اسے پتھر لانی نظریوں سے دیکھتی رہ گئی۔

یہ طلعت نے جملہ اس کی زندگی کے آنے والے ہر دن کا ایک ناگزیر حصہ بننے والا تھا۔ کیا وہ اسے اپنی زندگی کے ہر دن کا لازمی جزو بنا کر ایک مکمل زندگی گزار پائے گی؟

ایک ایسا سوال جس نے اسے مجھد سا کر دیا۔

”واٹم اور ابھی کچھ لبوں رہا تھا مگر اس کے کان کچھ نہیں سن رہے تھے صرف وائٹ کے ہلنے لگنے اور۔۔۔“

”مجھے کٹورہ بھی تھنے کیا۔“ ایک ہی جملے کی بازگشت۔

”میں ابھی کچھ جا رہا ہوں اور تم یہ مت سمجھنا۔ میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ اب اس کا فائدہ بھی نہیں مہم اپنی مرضی کر چکی ہو۔ لیکن مجھے کچھ دن یہ سب کچھ سٹ کرنے دو۔ اتنا تو مجھے فیور کر دو گی تا عزم۔“ وہ اس کا کندھا ہلکا کر پوچھ رہا تھا۔

”اور وہ خالی خالی نظریوں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔“

”وہ کیا ہوا اب کیا سوچنے لگیں؟“ وہ اس کی کیفیت پر لہجہ بھر کر پوچھ نکلا۔

”عزہ نے کوئی جواب دینے پر بغیر آنکھی سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا۔“

”مگر ابھی ہیں اور مجھ سے بات کرنے میں بلکہ ان کا ڈاٹ تو میرے ساتھ سے ہاتھوں نے پیا کو منہ کی کو پیش بھی کی بلکہ محمد فٹنا چند دنوں میں پیا بھی مان جائیں گے وہ میری اور ماما کی کسی بات سے زیادہ دن انکار کر رہی نہیں سکتے پھر تم۔“

”وہ اب ذرا جوش میں اسے کھلی دے رہا تھا۔“

”اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ مجھد لہجے اس سے فیصلہ کر دیا چکے تھے۔

”مطلب؟“

”آپ شاید گھر جا رہے تھے۔“ وہ بے اثر چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”وائٹم اس کے چہرے کو دیکھ کر کچھ اخذ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔“

”تم نے کیا سوچا؟“ وہ اس کی چپ سے قدرے ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

”واٹم تو کم وہ نہیں جو اب میرے ارد گرد والوں کے لیے مزید کسی رضائی کا باعث بنے۔“ وہ فحوس آواز میں بولی۔

”اور میں تمہارے ارد گرد والوں میں شامل ہوں نا؟“ وہ ذرا سا بے یقین ہو کر بولی۔ عزم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”عزہ!“

”وائٹم ابھی آپ جائیں۔ ابھی ہمارے گھر میں بھی سبہ بلکہ کہیں بھی کچھ نارمل نہیں۔ تو ہم ایسے حالات میں کوئی بھی اچھا۔۔۔ سہی مناسب فیصلہ کر سکیں گے۔“

”اور وائٹم کو کچھ عجیب سا لگا۔ کچھ دیر پہلے وہ وائٹم کا آخری فیصلہ جاننے کی مختصر تھی اور اب وہ کہہ رہی تھی ”ہم“ کوئی مناسب فیصلہ نہیں کر سکتے۔“



کبھی دن کے چور لھوں میں بیارات کے تاریک اندھروں میں۔ ایک عملی مسلمان بھی اس کی محبت کو نصیب نہیں ہو سکا تھا اور وہ پھر بھی۔ پھر بھی محمود عالم کو اس کی پوری زندگی لوٹا سکتی تھی اور عزم کو سب سے بہادر کرنا چاہا اور اب۔۔۔ اس نے نور سے ان نکلوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔



میرا یہ باقوت کو لگا ان کے قدم زمین نے کچھ اس قوت سے جکڑے ہیں کہ وہ عمروں کی توانائی لگا کر بھی اپنے پیر نہیں چھڑا سکیں گی۔ اور یہ منظر کاش آپ کچھ ان کی بیانی چھین چکی ہوتی تو اس طرح کا کوئی منظر وہ نہ دیکھ سکتیں۔ گمراہی کا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح مستطبیسی زمین کے ساتھ ایستادہ تھیں اور ان کی بے دم ہوتی نگاہیں اس منحوس منظر کو یک ٹک دیکھ رہی تھیں۔

لائبہ اور جمالیکہ بہدانی۔۔۔ دونوں ساتھ ساتھ ایک ہی صوفے 'ایک دوسرے کے پاس قدموں سے لے کٹھ سے انداز میں اور مطمئن چروں کے ساتھ لے یوں ہو کر رہے تھے جیسے وہ انہیں کوئی کرتب دکھانے لگی ہوں۔ 'نام امیٹ مانی تیرو تیرو جہا ظہیر ہدانی' لائبہ چمک کر بولی۔ 'اور وہ وہی میں بھول گئی۔ آپ دونوں تو شاید پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔' انہیں اپنے سے نہیں۔ پچھلے کبھی جسم میں۔ جہا ظہیر نے ایک کان انداز میں لائبہ کی گردن میں ہاتھ نہ مائل کر کے خیانت سے بولا۔

اور میرا باقوت کو لگا آج ہی حشر کا دن ہے۔ ان کے اعمال نامے کا ایک ایک پرت آج ہی کھل کر رہے گا۔ ہر وہ پرت جس پہ ان کے کردہ ناکر وہ چاہے ان چاہے ان رکھے گناہ کا حساب یوں سطر سطر درج ہے کہ وہ خود سے یہ سب پڑھ سکتی ہیں اور اس سارے شمار نامے کے ساتھ ان کی سزا کا اندراج بھی ساتھ ہی لکھا ہے۔

'کیا بات سے صاف ہی ایہ منظر اتنا دل کو بھاریا کہ نظریں ہٹانے کو تھی نہیں چاہ رہا۔ ایسی بات سے تو ادھر آجانیے ناؤ ہلے بالکل فریب۔ آپ بھی جاس ہوں گی ہمارے دل و جان کی روشنی زندگی خوشبو بہا اور کیا نام دونوں میں اپنی اتنی شادیاں حسین لائف پارنٹر کو تو دیکھیں زندگی کی ہر بہار ہم سے حمد کرنے لگی قسم سے۔۔۔ جہا ظہیر بہدانی۔۔۔ ان کے دربار کا وہ کتاب جو ہیئت ان کے قدم چلانے کے لیے دم ہلا تالوں میں لگا تالیا قوت کی قربت کے چند ٹکٹے چند منٹ ٹھہب ہونے کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔ اب وہ لائبہ ان کی سگی مان کی جائز ان کی سب سے لڑائی اولاد۔۔۔

کتنا کریمہ منظر تھا۔ مگر نہیں انہوں نے تو اس سے بھی زیادہ کریمہ اور غلیظ مناظر بہت سے۔ ان گنت کہ اب تو کتنی بھی بھول گئی تھی اور وہ سارے رجسٹراندر راج نامے بھی گل و فخر کھلے پر نذر آتش کر دیے جاتے ایسے کتنے ہی منظر انہوں نے بہت سی لڑکیوں کے مقدر میں لکھے تھے۔ اور ان کی بے بسی پر فلک شگاف تھتھے بھی لگا تے تھے۔

وہ اسے بگھٹا رہ گیا۔ ایک ایڈووکیٹ کر چکی تھی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی طبیعت یا فطرت کے اس لازمی جزو کو اپنے اندر سے نکال چھیننے کا ارادہ کر چکی تھی۔

بلکہ شاید کوئی اور ایسا ہی فیصلہ! وہ تم نے کیا سوچا ہے عزم؟ وہ لمحہ بھر میں بہت کچھ جان چکا تھا کہ عزم کچھ اور سوچ چکی ہے۔ میں نے۔ کیا اس سارے منظر نامے میں مجھے بھی حق حاصل ہے کوئی فیصلہ کرنے کا؟ وہ عجیب پھینکے لیے میں بولی۔

وہ تم کو وہ بہت کھرنی ہوئی اور شکست خوردہ سی لگی۔ اس سارے میں اگر کسی نے کچھ نہیں پایا تھا تو عزم کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا تھا آگ کا دریا عبور کر آنے کے بعد بھی وہ خالی ہاتھ تھی۔ 'میں نہیں واپس آجائے گا دکھ ہے۔ پیش تھا تمہارا تو خود کو یوں پرو چکٹ کرنے کا ایک دم سے دائم کو خیال آیا۔

'پرو چکٹ ہو نہ۔' وہ صرف یہی دہرا کر رہی ہوئی۔ اس منحوس پریڈ کے بعد اس دن سے برینڈ ٹینوں کے کتنے فون آچکے تھے اسے کہ اس نے فون ہی مستقل آف کر دیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے یہی بات بہت حیران کن تھی کہ ایک ہی رات میں شہرت کی بلندیوں پر بیٹھ کر وہ کیسے شہرت سے خائف ہو گئی۔

وہ شاید ابھی بھی خائف نہ ہوتی اگر میرا باقوت کا اصل چہرہ تکلیف کا تیرا احساں اس کے اندر کسی بھی بڑی طرح سے ڈرا۔

وہ میرا باقوت جس کو میرا ہنسنا میں کچھ نہ کچھ نہیں بلکہ بہت بڑا ہاتھ اس کے آئیڈل باب کا بھی تھا۔ 'ابو کے تم اندر چل کر تھوڑا ریسٹ کرو۔ ہم پھر بات کریں گے' دائم کو اس کی ذہنی حالت پہنچا اتنی آپہن نہیں لگ رہی تھی۔ سو نہری سے اس کا ہاتھ چھو کر بولا۔ عزم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ کوئی الوداعی کلمہ۔ اور آہستگی سے اندر کی طرف مڑ گئی۔

اور دائم کے موڈ میں پچھلے قدم بے اختیار ٹھٹک گئے۔ یہ جبکہ اس کی ڈیٹی کے چاروں نکڑے اٹھا کر سیدھا ہوا اور ان ہی قدموں پر واپس چلنا عزم کے پاس آیا۔ اس کے یوں واپس آنے پر ٹھٹک کر مڑی تھی۔

دائم نے خاموشی سے وہ چاروں نکڑے اس کی طرف بڑھادیے۔ 'اتنی محنت کے بعد سب کچھ حاصل کرنا اور پھر فوراً انہی سے یوں برباد کرونا۔' وہ ان نکڑوں کو دیکھتی رہ گئی۔ ان پچھلے بے جان نکڑوں میں کیا نہیں تھا۔ محمود لا کو غیابوں سے ہلا کر زمین بوس کر دینے کا سارا سامان۔ اور اس سے زندہ رہ جانے کا ہر جواز چھین لیا جاتا اگر یہ ٹھٹکے کہیں میں جڑے رہتے۔

وہ کانپ کر رہ گئی۔ 'مشاید وہ ابھی بھی صرف۔۔۔ محمود عالم سے محبت کرتی ہیں اور اسی محبت سے مجبور ہو کر۔' دائم وہاں دھورے بیٹھے بول کر بہت کچھ کہہ گیا۔ عزم ہاتھوں میں وہ بے جان نکڑے لیے اس عورت کی محبت کے نکڑوں کو جو رشتے کی ناکام سنی کرتی رہی جو شاید اسے کبھی ثابت مکمل ملی ہی نہیں تھی۔



کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ نہ آسمان میں ہوا تھا نہ زمین پھٹی تھی۔ نہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہوئے تھے۔ بس یوم حساب کو  
نہ اوسے مل گیا تھا۔

مگر شاید صرف ان کے لیے۔۔۔  
یاقوت دنیا کے سارے لوگ تو اسی طرح اپنی دنیا داری کے ہندوں میں ملن رواں دواں تھے۔ یہ یوم حشر صرف  
ان کے لیے تھا۔

جانے کون سا وہ لمحہ تھا۔ انہوں نے اپنے وجود کی ساری قوتوں کو جمع کر کے زور سے جھٹکا لگایا اور جیسے اڑتی ہوئی  
دونوں کے سروں پر بچھ گئیں۔

ایک زوردار پھیر انہوں نے قلاب کے منہ پر سید کیا تھا اور پھر ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا...  
"خیروار!" دوسرے لمحے جمنا تیرہ ہوانی نے پوری قوت سے ان کی کلائی بھڑکی تھی۔  
"خوش میں بھی ہوش قائم رکھو یا قوت بیگم!"

وہ کسی زخمی شیر کی طرح غریا۔  
"یہ اب تمہاری بیٹی ضرور ہے مگر میری بیوی ہے۔ اس کو ہاتھ لگانے سے پہلے بلکہ چھونے سے بھی پہلے  
میں تجھ سے اجازت لینا ہوگی ورنہ مجھے اتنا کمزور نہ سمجھتا کہ میں اپنی جزی کی حفاظت نہ کر سکوں۔"

وہ پورا زور لگا کر بھی اپنی کلائی اس خبیث سے چھڑا نہیں سکی تھیں۔  
"تم سے اب میرا جو رشتہ ہے صرف اس کا لانا کر کے چھوڑ رہا ہوں ورنہ تم جانتی ہو جمنا تیرہ اپنے غصے میں کیسا  
باندھ ہوا جاتا ہے اپنے غم کی پیمان نہیں رہتی اسے۔"

اس نے خور و ہرے انداز میں یا قوت کی کلائی ایک جھٹکے سے دوڑا کر اس پر دھک دیا تھا۔  
دوسرے لمحے میڈیم یا قوت نے نیچے گرتے گرتے سنبھل کر تیزی سے اپنے کندھے سے چھوٹے بیگ میں  
تھوڑا لالہ اور دو مہرے کے سیاہ پتھلے ان کے ہاتھ میں تھیں۔

"باب میری سمجھ میں آیا کہ اتنا اتنا کچھ ہوا اور تم مرود نہیں مرے اس کی کیا وجہ تھی؟" وہ جھٹکے سے سنبھل  
گئی تھیں۔

"اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تم نے آج بس لمحے میرے ہاتھوں سے سروا تھا۔" وہ نفرت بھرے انداز میں غرا کر  
لیں۔

"چہ چہ" اپنی بیٹی کو اتنی جلدی بیوہ کر دو گی۔ ایسی بھری جوانی میں بیوگی مر رہ جائے کہیں یہ۔ اسی کا ہی سوچ لو ہنڈھ  
سے اگر کوئی بدبختی سے بھی تمہیں تو ساس جی! وہ بہت مطمئن انداز میں بول رہا تھا۔

"تم دھمکی دہتی کو بھول جاؤ۔ اب صرف اپنی آتی جاتی سانسوں کو گونگے گونگے سانس آخری ہو گی۔" انہوں  
نے بڑی مہارت سے پستول کا رخ میں اس کے دل کی طرف کرتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔

"نہیں مام!" دوسرے لمحے لائبرین جمنا تیرہ ہوانی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔  
اور جمنا تیرہ ہوانی کو لگا "وہ اپنی جوانی کے عین بیسیس سال میں چلا گیا ہے۔ اب بھی یا قوت بھی اس کی یونٹی  
مائل بنا کر لی تھی اسی طرح سے ہر مشکل میں اس کے آگے کھڑی ہو جایا کرتی تھی۔

"مالی سوہت ہارٹ مالی ڈارنگ! تمہیں ذرا سی خراش بھی آئے تو اس سے پہلے میں اس گولی کو اپنے سینے پر کھانا  
کر دوں گا۔ پلین ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" وہ بڑی بے باکی سے لائبرین کو اپنی بانسوں میں بھر کر بولا۔

"کچھ یاد ہے یا قوت بیگم! کبھی تم بھی ہماری یونٹی ڈھال بنا کر لی تھیں لو بے اور اسٹیل سے مضبوط ڈھال۔"  
وہ بے باکی سے یا قوت کو آنکھ مار کر بولا۔

"لائیبر! ہٹ جاؤ جاؤ اس شیطان کے سامنے سے۔ آج میں اوس کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ پاگھوں کی طرح  
چلا کر بولیں۔

لائبرین یا قوت کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔  
"کیوں مام! سیکوں زندہ نہیں چھوڑیں گی؟" وہ مطمئن انداز میں سامنے آکر بولی۔

"تم۔۔۔ تم ہٹ جاؤ۔ میں کہہ رہی ہوں۔" وہ خوفناک انداز میں بولیں۔  
"اس لیے کہ میں نے اس سے اپنی رضا اور خوشی سے شادی کی ہے؟" وہ اسی بے چلک آواز میں بولی۔

"لائبر! اس سے زیادہ سنا ان کے لیے مجال تھا زور سے چیخ کر بولیں۔ لائبر کے چہرے پر وہی سکون تھا۔  
"یا اس لیے کہ میں نے ہر اس شیطان دھندے میں آپ کی معاونت کی اسے آگے بڑھایا جس میں آپ کی  
بھی خوشی شامل ہوتی تھی۔" وہ زور لگا کر بولی۔

یا قوت کے ہاتھ میں پستول لہر کر رہا گیا۔  
"ابکواس بند کر دو اور ہٹ جاؤ اس کے سامنے سے۔" وہ خود پر قابو پا کر چلا گئیں۔

"مام! اگر یہ گولی کے لائن سے گنا گنا ہوانے کے قابل ہے تو آپ خود کیا ہیں؟ کچھ سوچا آپ نے یا ابھی سوچنے  
کے لیے آپ کو قیامت کے دن کا انتظار ہے۔"

وہ لائبر کو دیکھتی رہ گئیں۔  
اس نے کیسے تاک کر نشانے لگائے تھے۔

"مام! اگر ایسی موت اس کا مقدر ہو سکتی ہے تو آپ کی کیوں نہیں؟" وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں یہ سب کچھ  
ان سے لائبر کہہ رہی ہے۔

دوسرے لمحے وہ پیچھے پھیل کی فائر میں بڑے لمبے پھیل والا چاقو کھینچ کر ہاتھ میں لے چکی تھی۔  
"مگر آپ جمنا تیرہ شوٹ کریں گی تو میں اس سے آپ کی جان نہ لے سکی تو اپنی لے لوں گی۔ اکی سو تیرہ مام!"  
اس نے چاقو کے لمبے پھیل کی نوک اپنے سینے میں کھینچ رکھی تھی یا قوت کو لگا شاید نوک ان کے سینے میں اتر  
چکی ہے۔

"ہٹاؤ۔۔۔ ہٹاؤ اسے نہ لگ جائے گا لائبر! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہٹاؤ۔" وہ زور سے چیخیں۔  
"میں اسے ایک ایچ جیٹا لوں گی یا ایک ایچ اپنے اندر اتار لوں گی مام! اگر آپ نے اگلے سیکنڈ میں یہ پاتھل ہاتھ  
سے نہیں رکھی تو۔۔۔" وہ پھر سے اسی لمحے میں بولی۔

"اؤ۔۔۔ جو لوگ اس جیسے شیطان سے جانتے ہو جیسے شادی کر سکتی ہے وہ کیا نہیں کر سکتی۔" اتنا تو انہیں اندازہ ہو  
تی گیا تھا۔ لائبرین جنابائی بن میں ان سے بھی بہت آگے ہے۔ وہ ان کی کسی دھمکی میں نہیں آئے گی۔

انہوں نے ہٹکے ہوئے انداز میں ہاتھل والا ہاتھ نیچے کر لیا۔  
"گڈ!" جمنا تیرہ بچوں کی طرح تالیاں بجانے لگا۔ "وری اور بیڈ۔ ہٹ ہڈ۔" وہ خوش ہو کر بولا۔

"رکھو اسے واپس۔" یا قوت خود پر اپنے آتش نشانی کی طرح اگلے غصے پر قابو پا کر لائبر سے بولیں۔  
اس نے آستکی سے چاقو پھیل والی نوکری میں واپس رکھ دیا۔ کمرے میں موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

"چلیں ڈارنگ! آپ کی والدہ کا آشرہ یاد تو نہیں مل گیا۔ یہ دل اپنی ہی زندگی کی شروعات کرنے کے لیے  
بے تاب ہوا جا رہا ہے۔ اب اور زیادہ انتظار ممکن نہیں۔"

وہ پھر سے لائبر کی گردن میں بازو حاصل کر کے بے تکلف انداز میں بولا اور یا قوت کے ہاتھ کی گرفت پستول  
کے ٹریگر پر سخت ہو گئی۔



"ہوں نہیں نہیں۔ اماں! آپ پلیز نہیں کریں گی۔" لائیبہ یوں جرات گیری کی طرف نرم منگوا کر اچھا لگا کر بولی جیسے دونوں میں بے تحاشانہ محبت ہو اور یہ قوت ہے۔  
 میری ہمت کی آنکھوں میں جیسے کسی نے مچھلیں بھر دیں۔  
 وہ زور سے آنکھیں بند کر کے نہ کہیں۔

"کیوں اس بے چاری کا اس عمر میں اتنا کڑا امتحان لے رہی ہو۔ اس عمر میں بلڈ پریشر نارٹالیک برین ٹیمبرج جیسی کئی جان لیوا جانک سے ایک کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تم پھر بھی بار بار انہیں اسی اذیت ناک کیفیت سے دوچار کر رہی ہو۔" وہ پھر سے مزے لے کر اس کے اور بھی قریب ہو کر بولا۔

"بے چاری کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی۔ اب انہیں آرام کرنے دو اس عمر میں آرام کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں بھی اندازہ ہو گا۔ آج تم عمر رسیدہ عورت تمہاری ماں ہے لاکھ خود کو فٹ شو کرے مگر عمر کا جاوا تو اثر کر کے ہی رہتا ہے۔" جہا نکیر اس سے گن گن کر بولنے لگا رہا تھا۔

اور میری ہمت سے اس سوائے ہرگز سے لگتے شزاروں کو تھپ کر کے اور کوئی راستہ نہیں تھا فی الحال۔  
 "کیا یہ بڑھا بچہ کیوں اس گرد ہائے لائیبہ! وہ خود پر قابو کر کے قدرے تارمل آواز میں بولیں۔  
 لائیبہ سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔

"ڈارلنگ! حیران کیوں ہوئی یہ ایک سو کاڈر الزما ڈران ماں کا لیبہ ہے جو اپنی بیٹی کے شوہر کو حریص نظروں سے دیکھتی ہو یہ وہ حد ہے جو بچہ رہتا ہے اس کے لیے میں۔" وہ پھر سے ٹانگ اڑا کر بولا۔  
 "آپ کا مطلب نکاح سے نام؟" لائیبہ نے جہا نکیر کی ہرزہ سرائی کو نظر انداز کر کے کہا۔  
 "ہم آپ سے جھوٹ کیوں بولیں گے ماں؟" وہ ڈراؤن آواز سے بولی۔

"تو کیوں؟" وہ زور سے پوچھیں۔  
 "یہ ضروری تھا ماں! وہ نظریں ہٹا کر بولیں۔  
 "کیوں کیوں ضروری تھا؟" وہ سامنے پڑا بیٹھل میں فریش پر مار کر زور سے بولیں۔  
 "دوباتوں کے لیے۔" لائیبہ اسی سکون سے بولی۔

"اوسوں ڈارلنگ! بیٹو! تمہیں اس جہلی بڑھیا کے ساتھ اسے صحیحی کی کسی بنا رہی ہو۔ ہم اس کے آگے جواب نہیں۔" اس کے منہ سے ہستی رال اسے اور بھی مگر وہ تار ہی تھی۔  
 "میری آپ سے ایک ریکورڈ ہے جہا نکیر! لائیبہ نے ایک نظر یا قوت کے لمحہ پہ لمحہ مسخ ہوتے چہرے پر ڈال کر مانتے سے جہا نکیر سے کہا۔

"کلم کرو میری جان! کو تو پلوں کے بل چل کر باہر گاڑی اشارت کروں یا جو تم کو۔" وہ اور بھی رال ہٹا کر بولا۔  
 "ہماری ہوش میں بنگ ہو چکی ہے نا! وہ اس کی ہستی رالوں سے نظروں چرا کر بولی۔  
 "آف کورس ڈارلنگ! بلکہ وہ ہم بھی فرسٹ برائینڈل ٹائٹ کے لیے ڈیکورٹ کر لیا گیا ہے۔ اب تم چلو نا اور کتنا تڑپاؤ گی مجھے۔ بس اب اس بحث پر بحث بھیج دو اور چلو بس۔" وہ بچوں کی طرح خمی خدی پن سے کہتے ہوئے لائیبہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بے قراری سے بولا۔

یا قوت نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔  
 "آپ ہوش جا میں میں ہام سے بات کر کے وہیں آیاؤں گی۔" وہ تحمل سے اسے دیکھ کر بولی۔  
 "کیا؟" اس کا منہ اور بھی کھل گیا۔  
 "میں بالکل بھی نہیں۔" وہ سر سے لمحہ زور سے مہرا کر بولا۔

"میں تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گا ہرگز نہیں۔" وہ پھر سے اس کے قریب آئے لگا تھا۔ لائیبہ آہستگی سے ایک طرف ہو گئی۔

"میرا ماں سے بات کرنا ہمت ضروری ہے۔"  
 "اوکے تم کرو بات۔ میں تمہیں بیٹھ کر انتظار کر لیتا ہوں۔"  
 وہ اب کے ذرا مزہب انداز میں کہتے ہوئے پھر سے صوفے پر بیٹھنے لگا۔

"نہیں پلیز! لمے نہیں میں اس طرح بات نہیں کر سکتی۔ آپ ہوش چلے جا میں مجھے کچھ ٹائم ملے گا۔"  
 جہا نکیر ابھی ہوشی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔  
 "مجھے صرف وہ بات بتاؤ جو تمہارے دل میں ہے۔" دوسرے لمحے وہ اکھڑن سے بولا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے جہا نکیر! انی سوئیر۔ وہ میری ماں ہیں اور یہ نکاح میں نے ان کی رضامندی کے بغیر کیا ہے تو اتنا حق تو ہونا چاہیے کہ میں اپنی ماں کو منانے کی کوشش کروں۔"  
 وہ ایک مایوس وارنی کی طرح جہا نکیر کی منتیں کر رہی تھی۔

"نہیں ہے۔ عورت کسی کی بھی ماں بننے کے لائق اور نکاح کے بعد اس کو منانے کی یا کسی بھی اور رشتہ کو شوہر کی خوشی پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ تم اتنا سمجھتی ہو نا! وہ ہٹ دھرم لہجے میں بولا۔  
 اسے مطلب کے لیے اسے رشتوں کی درجہ بندی بھی کرنا آگئی تھی۔

"تم فریج کیوں نہیں ہو جاتے یہاں سے۔" یا قوت اسے کھنا جانے والے لہجے میں بولیں۔  
 "پلیز باام! میں بات کر رہی ہوں نا! آپ ہمارے معاملے میں ت بولیں نا۔" وہ ایک بالکل ہی بدلی ہوئی لائیبہ تھی۔

یا قوت نے یقینی سے اسے دیکھتی تھی۔  
 "جہا نکیر! آپ کا رشتہ ہر آنکھوں پر لیکن میں ہام سے بات کیے بغیر نہیں جاؤں گی اور نہ ہی آپ کی غیر موجودگی میں۔ آپ کو جانا ہو گا۔" وہ سنجیدگی سے جہا نکیر کو بولی۔  
 "اور اگر نہ جاؤں تو؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"تو آپ جانتے ہیں آپ بھی میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔" وہ لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد ٹھوس آواز میں بولی۔  
 "مطلب کیا ہے اس سارے ڈرامے بازی کا؟" وہ پھر سے غصے میں آ کر بولا۔  
 "میں ابھی گاڑو ڈ کو بولاتی ہوں" اسے ہاتھوں میں اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک آتے ہیں۔" یا قوت نفرت سے بولیں۔

"ہام پلیز! لائیبہ زور سے چلائی۔  
 اور یا قوت کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔  
 اب ان کا باہر تیزی سے کام کر رہا تھا کہ اس جہا نکیر کو کس طرح ہوش کے لیے۔  
 "اگر ہمت پہلے میں نے اس سے جان چھڑالی ہوتی۔ جبکہ میں جانتی تھی یہ لائیبہ پہ بری نظر لکھتا ہے تو کیا لائیبہ کو تنزل دے نہیں اس نے انہو کیا تھا؟"

ایک حیرت انگیز سی بات ان پر منکشف ہوئی۔  
 وہ متکلوک نظروں سے جہا نکیر کو دیکھنے لگیں۔  
 تو پھر تنزل مجھے فون کیوں کر رہا۔



”اُس کے آکر تم گھنٹے میں ہونے نہ پھینچیں تو میں خود آجاؤں گا اور اکیلا نہیں آوں گا۔ اپنی ماں کو اپنی زبان میں سمجھا لیتا۔ ویسے تو شرافت کی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی تم جو اس کو سمجھنا چاہ رہی ہو تمہیں سمجھے گی یہ۔ یہ شرفیت سے مراد یہاں قوت کو دیکھ کر بولا اور اچھے کر جانے لگا۔

”میں نے کہا۔ میں آجاؤں گی ڈونٹ ڈری۔“ اسی پر اس کو دو واؤں سے تک پھوڑے جا رہی تھی۔

”اپنا فون آن رکھنا۔“ وہ فکر بھری آئینہ اسے گرا ہاتھ جیسے دونوں ہاتھوں میں بیوی ایک لہا لہا ایک ساتھ گزار چکے ہوں۔

”میدیا قوت کے دن میں پھر بنگاریاں ہی پھٹے گئے۔

”میں آپ کے فون کرنے سے پہلے بیچ جاؤں گی۔ آئی برا۔“ وہ اسے خوب تسلیاں دے رہی تھی۔

وہ سر ہلا تاپا گیا اور دلنا تیر اندر آئی۔ ”میدیا قوت نے منہ پھیر لیا۔“



”کیا سوچ رہے ہو آغا۔ کسی المنی۔ کہانی مقلی محمود عالم۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی جن باہ اللہ بخشے اس کی ماں شاہین کو۔ کیسے کیسے حلف اٹھا رہی تھی میرے لیے پارہاں کے دعوے تمہیں بتاؤ بھلا بندہ کس کا یقین کرے کس کا نہ کرے۔“

”ثریا یا تو ایک شاک کے عالم میں تھیں کبھی تو پانکل گرم صم بیٹھے آغا فیاض کو مخاطب کر کے کچھ بولتیں اور کبھی خود ہی اپنے آپ سے باتیں کرتی جاتیں۔

”لاکھ بڑی سستی ٹیلم۔“ چار چار ہائیاں ہوں گی اس کی ماں زوریں میں۔ اس کا بھید ہم تم جانیں برانصاف سے کہو ہم میں سے کس نے ٹیلم کو کوئی گناہ کرتے دیکھا اس پر بیکہ دار ماں کا ٹھہکا ہوا گناہی رہا اور اس محمود نے کیسے فائدہ اٹھایا اس کو کیا کہو گے؟“

اسے ساری سوالوں نے بھی آغا فیاض کی چپ کو نہیں ٹوڑا۔

”سچ بولتی تھی سارا لیا لکل ٹھیک اس کو دورے دیتے تھے عالی سے۔ ٹھکانے کے۔ بچاری سے پہلے آکر مجھ سے ہائیاں دتی ہوئی کہ ماں وراثت بھر جاگ کر خالی کتابوں کو کوئی کیسے چاہ سکتا ہے۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے مگر اس کو تو اس عشق کا ہر کالنگ تھا اور ضمیر کے چوکے بھی تو جگاتے ہوں گے۔ ظلم تو کیا ہی کیا تھا۔ اور بولو کھو تنزل۔ کوئی مان سکتا ہے اس بات کو عقل شل ہوتی سے سوچ سوچ کر۔ کیسا دھتکارا ہوا اللہ اور آتا تھا عالی کا بیٹہ تنزل کے ساتھ اور دیکھو تمہرت نے کیا کھیل کھلایا اس کے ساتھ۔“

”یہ مرد دیکھ لو بیٹا بھی اس کا توڑ لٹکا، کیسا متہ پر جو ماں بھتیج کر مار کر آیا کہ اگر خدا اپنے کو بغیر باپ کے پیدا کرنا تو کیا خوب تھا۔ اس کا غصہ غلط تو نہیں تھا آغا۔“

”تم کیا پتھر کے بن گئے ہو۔“ بہت دیر بعد انہیں آغا کی لمبی چپ پر غصہ سا آیا۔

”اچھی بوا اس کرے جا رہی ہوں میں۔ کچھ تو منہ سے پھوٹو۔“ وہ اپنی اصلیت پر اگر تیز آواز میں بولیں۔

”تم نے وہ بات تو سنی ہو گی نا بھلا بھلا! ایچے والی اینٹ تیرھی رکھو تو اس دیوار کو پھر آسمان تک اٹھا کر لے جاؤ۔ وہ پتھر ہی جاسے گی۔“

وہ بھیرا ان کی طرف دیکھے جیسے خود کلائی کے سے انداز میں بولے۔

”لو یہاں اس عالم کا فاضل محاورے کی کیا ضرورت؟“ وہ ناک جڑھا کر نخوت سے بولیں۔

”یہ سارا گند جو پھینچا اور جس کا ذمہ دار ہم نہ خالی محمود کو کہہ سکتے ہیں نہ ٹیلم کو نہ کسی اور کو بلکہ۔“ وہ پھر چپ

کر رہے تھے

”اور کون ہو گا ذمہ دار اس محمود کے سوا۔“ وہ تیزی سے بولیں۔

”میں میں ہوں اس ساری ساری اپنی اور ریاضی کا ذمہ دار اور میری جیسے دار تم بھلا بھلا اور بہشتن میری اماں۔“

”کیا بک رہے ہو ہمیں نے کیا کیا ایسا۔“ ثریا یا تو کو تو گویا چھوٹے کاٹ لیا کرتی رہیں۔

”کچھ نہ کرتے ہوئے بھی سب کچھ کر ڈالا۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

”سٹھیا گئے ہو جو اب اپنے کے دھڑے کا لہجہ مجھ پر اور اماں بچاری پر ڈال رہے ہو۔“

”وہ سب جو میں نے زوریں کے ساتھ کرنا تھا۔ اس پر مجھے کون آکسانا تھا؟ بھول گئیں۔ ایک شخص۔ اگر فقط ایک شخص کو معاف کر دیا جاتا، زوریں کی خود میری کو اس کی جوانی کی بھول سمجھ کر بیٹھ کے لیے معاف کر دیا جاتا تو بھلا جو آج آج اتنی زندگیاں تباہ نہ ہوتیں۔“

”بھول گئیں تم اور اماں کس کس طرح مجھے اس کے خلاف برہہ چڑھ کر آسکتی تھیں۔ میں کیا دن بھر گھر میں بیٹھا رہتا تھا جو سستا تھا تم لوگوں کے منہ سے اور اس کے بعد۔“

”جانے دو آغا فیاض اب اپنے گناہوں پر تمہیں نہ پانی ڈالو اتنی آسانی سے نہیں دھلتے والے۔“ انہوں نے کبھی غلطی تسلیم کی تھی جواب کرتیں۔

”یہ تو میں جانتا ہوں۔ یہ تو تمہوں کی غلاظت ہے بول دو چار آنسوؤں سے تو نہ دھلتے گی اور میرے یہ سب کرنے کا مقصد۔ تمہیں مورد الزام ٹھہرانا نہیں تھا، صرف حقیقت بیان کرنا تھا۔“

وہ اسی نہ نظر آنے والے تکتے کو مسلسل گھور کر بولے۔

”حقیقت بیان کر رہا تھا۔“ وہ منہ میں بیڑا نہیں۔

”اگر ماں دونوں میں اعلیٰ سے دو کچھ میں اس کے بارے میں جان چکا تھا اس سے بوجھ لیتا یا اسے معاف کر کے اسے گھر میں ایک باجحت جگہ دے دیتا تو ٹیلم اس لغت کی نر میں نہ آئی جو زوریں کا مقدر بن چکی تھی۔ کیوں میں نے یہ فیصلہ بھی تسلیم کر لیا کہ زوریں کی بیٹی بھی اس جیسی ہی بنے گی؟ کیوں میں نے اس کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھایا۔ ایسا کیا دیکھ لیا تھا بھلا اس کی سچی سی عمر میں میں نے تمہے ہم سب نے کہ مسلسل ایک ہی گردن زوریں کی بیٹی ہے نا۔ ورنہ اگر میں اس کا باپ بن کر سینہ تان کر اس کے آگے کھڑا ہوتا تو یہی شاہین میری بہن کیسے جا بڑی سے اپنے بیٹے کے لیے ٹیلم کا رشتہ مانگتی اور سب کچھ ایسے ہرگز نہ ہوتا جیسے ہوا۔ یا پھر تم۔ احسن کا۔“

”بس رہے دو آغا فیاض اب بڑے مرے اکھاڑ کر تم کون سا کمال کر رہے ہو۔ اس سے بھلا اب کیا ٹھیک ہو گا۔“ وہ اٹنا ہاتھ مار کر نخوت سے بولیں۔

”جانتا ہوں۔“ وہ آہی بھر کر بولے۔ ”اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

”اور تم تو بڑے ٹھیکے سے گئے تھے کہ مجھے ٹیلم سے ملنا ہے تو اس وقت جانا تھا۔ ساروں کے سچ جا کر زوریا ہاتھ جو ڈر مننا کر معافی کے دو بول بولتے پھرو کہتے وہ تمہارے ساتھ کیا کرنی ہیوں نہ گئے اس کے سامنے تم۔“ وہ چپک کر بولیں۔

انہیں تو اس بات پر ہی غصہ آیا کہ آغا فیاض ہر کے کا الزام ان پر لگا رہے ہیں۔

زوریں کا فقیہ ٹیلم پر نہ ہونا تو بھی وہ احسن کی شادی اس سے کرتیں نہ عالی کی ٹیلم سے ہونے دیتیں، سارہ کی دیوا لگی ایسا کرنے دیتی بھلا۔

”اور ایسا کرنے کے بعد بھی بہت کچھ غلط ہو جاتا۔“ انہوں نے دل میں سوچا اور یہ ایسا کچھ غلط تو نہیں تھا۔

”اب جانے کا کچھ فائدہ نہیں تھا مجھے۔ اب اس سے معافی نہیں چاہیے تھی۔“ وہ پھر بہت سوچ کر بولے۔



اب کیا، عمل دھلا گئے، تمہارے سارے کالے گناہ؟ وہ اگلے کو اس کی بد صورتی سے پار بار آگاہ کیے بغیر نہیں سکتی تھیں۔

گناہ تو توبہ سے دھلتے ہیں تاہم اگر مجھے معاف کر بھی دیتی تو شاید میرا خدا مجھے معاف نہ کرتا۔ جس طرح ایک باغ کا رکھوالا مالی ہو تا ہے اور اس باغ میں ہونے والی ہر خرابی اور برکتوں کی کاہل و داری ہی ایک فرد اس طرح ایک گھر کا سربراہ اس گھر کے اندر ہونے والی ہر خرابی اور برکتوں کے لیے جواب دہ ہوتا ہے۔

میں اپنی غرض کے لیے معافی مانگتا چاہتا تھا لیکن اب میری سمجھ میں آ گیا کہ یہ معافی میری مشکل کو آسان نہیں کر سکتی۔ کچھ اور میری اس کے لیے۔ ان کی آواز ڈوب ہی گئی۔

”کچھ اور۔ یعنی۔“ وہ الجھ کر بولیں۔

”حساس ندامت۔ توبہ کے آنسو اور بس۔“

ثریا بانو آگے سے کچھ بول ہی نہ سکیں۔ یہ تو ان کا دل بھی گواہی دیتا تھا مگر توبہ کے آنسو تو کوئی تپ بہاتا ہے۔ وہ اپنے گناہ کو تسلیم کر لے، توبہ بھی اس مرحلے میں ہمیں اس آخری درجے کی تمنا کیے کر سکتی تھیں۔

آئیہ فیاض آہستہ آہستہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

”گناہ بچا رہے کے پیچھے ہٹ گیا اور اس گھنے سیٹھے عالم کو دیکھو کیا پارسا بنا رہا ساری زندگی جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہیں یہ بود بکھو جی شریف امیر زادوں کے کر توت اور جو کوئی اس بے چاری نیم کے رونے چلانے پر کسی کو یقین آیا ہو۔“

جانے کیسے ان کا دل عیلم کی حمایت میں آگے ہی آگے سوچتا چلا گیا۔



اتنی ساری باتیں، وہ نہیں اور محمود عالم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اپنی خطا کا ہر اکہاں سے پکڑیں۔  
”واکنش زندہ کی کہاں کو سوچے تو جیسے یہ عیاشی عرق عرق ہو جاتی۔“

تیز نزل ان کا پینا۔ تو دل جیسے مٹھی میں آجاک۔

ایک اور جی وہ بھی نیم کے پاس۔ اور نیم جو اب باقوت ہے کالے دھندے کی سر پرست اعلیٰ تو کیا اس کی بی بی بی محمود عالم کی بی بی۔ کیا اپنی ماں کی لائن پر نہیں چلی ہوگی۔“

ان کا دل جیسے پیچھے ہی پیچھے اترا چلا جا رہا تھا۔

”اور میں جو صرف عزمہ کو ایک ریب رہ جلتے دیکھ کر دل پکڑ کر بیٹھ گیا ہوں اگر وہ بھی ہاں جیسی۔“

ان کے گمروں میں درد کی تیز لہریں ابھری تھی۔

”اور مصطفیٰ کا رویہ کتنا تنگ آہیز تھا۔ کس طرح اس نے میرے منہ پر اور باجوہ اس کا تیز نزل کے سامنے رہنا وہ ذہب کچھ کہہ گئی اور میں۔ میں کیسے تیز نزل کو تباہوں کہ میرے دل میں بیٹے کی تمنا لٹکی شدید تھی وہ بھی اپنے بیٹے کی۔ اور تم نے بھی تو۔ ملتے تھے جب بھی۔ میں تمہارے ساتھ کس لغزت سے پیش آتا تھا تو کیا اس کے بعد بھی حافی۔ نہیں؟“

سادہ۔ جس کے غصے ناراضی اور اس کے شک کو میں ساری زندگی اس کا پانگن پنا نفسیاتی پن قرار دتا رہا۔

ب۔ اب کس منہ سے اس کا سامنا کر سکیں گا۔

ایک بھول کیسے کیسے گناہوں نے جنم لیا۔

اور اب عزمہ۔ جانے اس نے کیا قوت نے عزمہ کے بارے میں کیا سوچا۔ اگر وہ عمل کر گزری یہ۔

انہیں اپنی وہ اولین بے چینی یاد آئی جس کی بنا پر وہ مصطفیٰ اور وائیم کی نہیں کر رہے تھے کہ وہ کسی عین صیغہ یا قوت کو یہاں لے آئیں۔ وہ کئی بھی اور وہ اتنی اہم بات اس سے کرنا بھول گئے اس کی منت کرنا اس کے پاؤں پکڑنا۔

اگر وہ اپنے عزمہ پر عمل کر گزری۔ اب تو اس کے پاس بہت سے جوازیں۔

تیز نزل کو نہ سہی عزمہ کو توبہ جو خوشی بر باد کرنا چاہی۔

میں کیا کروں خود جاکوں اس کے پاس۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔

اگر وہ ضد میں لگتا تھا میں اندھی ہو رہی ہے اور بھی ضد میں آگئی تو۔ کس کو بلاؤں۔ کون اس کے عزائم کے بارے میں مجھے بتا کر کہتا سکتا ہے؟ وہ بے قرار ہی سے سینہ مٹنے لگے۔

”مصطفیٰ کا رویہ۔ کتنا ناقابل فہم سا تھا۔ اگرچہ اس معاشرے کے اصول و ضوابط سے ہٹ کر تو نہیں گھر

انہیں اپنے اتنے جانتا رو بہت سے یہ توقع نہ تھی۔  
تم اس کی بلکہ ہوتے محمود عالم تو شاید تمہاری جانثاری کا عالم اس سے بھی سوا ہو تا اس نے کون سا لٹو کھا کام کیا۔

اب تو معاملہ دوستی و جانثاری کا نہیں بلکہ اپنے گھر کی عزت کا تھا۔

تو عزت جس کی خاطر میں نے کیا نہ کیا اس بھولی عزت کی خاطر کاش میں نیم کو دن کی روشنی میں Own گھر نے کی بہت کر لیتا تو آج یہ سب سب۔

”میں۔ اب کیسے پتا کروں یا قوت کی بی بی۔ میری بی بی وہ بھی، نہیں نہیں خدا نہ کرے۔ یا قوت کا نمبر ایڈریس کچھ بھی تو نہیں میرے پاس۔“ وہ بدقت لہرتے اٹھ کر بیٹھ گئے۔

سمرانے ہاٹیل فون ہاتھ میں لے کر سوچنے لگے کس کو فون کریں۔ یوں لگ رہا تھا شہر گھر میں ایک بھی دوست ایک بھی خیر خواہ نہیں رہا۔ ”اگر کسی جانتے والے کو فون لیا اس نے عزمہ کے بارے میں پوچھ لیا تو۔“ ان کے ہاتھ بے جان سے ہونے لگے۔



”بس کریں میں ناما اور کتنا طویل سجدہ کریں گی۔ گھنٹہ بھر سے نفل پڑھ رہی ہیں۔“ وائیم زندہ کی مسلسل نماز سے کچھ بڑھ کر بولا۔

زندہ نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”اللہ رب العزت تیرا کس زبان سے شکر یہ ادا کروں۔ تو نے ایک جان بچالی جو میری غفلت کی ہیئت چڑھ گئی تھی۔ میں کس زبان سے شکر ادا کروں۔“

انہوں نے چہرہ صاف کر کے جائے نماز سمیٹ لی۔

وائیم خاموش بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

”ایسے کہوں بیٹھے ہو وائیم میں اپنے اللہ کا جتنا بھی طویل سجدہ شکر ادا کریں تم ہے اس نے میری برکت کو قبولیت عطا کی آج تمہاری اور اپنی نظروں میں سرخرو ہو گئی میں۔“

وہ پھرتے رونے لگیں۔

”پاپا کہاں ہیں؟“ وہ خود پر قابو نہیں پا رہی تھیں۔ اس لیے ان کا دھیان بنانے کو بولا۔

”مصطفیٰ نہیں۔“

”بہت مایوس کیا مجھے مصطفیٰ کے رویے نے وائیم، ذرا دیر بعد وہ خود ہی اصل موضوع کی طرف آگئیں۔“



”میں نہیں آتا ہوں اچھی۔“ وہ فون کان سے لگائے باہر نکل گیا۔  
 ”مجھے یا سبین کی طرف بھی جانا چاہیے۔ ستریل کا رویہ یا قوت کے ساتھ۔ وہ ہے تو اس کی ماں ہی جس کے لیے وہ اتنا تڑپتی ہے۔ مجھے پہلے وہیں جانا چاہیے مگر مصطفیٰ۔ شاید وہ یہ سب پسند نہیں کریں۔“  
 ”جی میں بس ابھی بنا کر کے جاتا ہوں کچھ بھر میں۔“ دائم کہتے ہوئے باہر کی طرف جا رہا تھا وہ اسے آواز دے کر پوچھنا چاہتی تھیں مگر رگ نکلیں۔ شاید وہ انہیں صحیح جواب نہیں دیتا۔  
 ”یہ یقیناً ”عزہ کا فون ہو گا۔“  
 وہ قیاس کرتی باہر نکل گئیں۔ ابھی انہیں مصطفیٰ کا موبو دیکھنا تھا۔

”بہت بھیا تک لمحے تھے ماموہ! میری زندگی کے خوفناک ترین لمحات۔ اگر اس لمحے میں کمزور۔ مگر میں کمزور تو پونجی تھی۔ میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس۔ جس طرح شیطان سوار تھا۔“  
 ”شیطان۔ ماموہ آپ اس کو تو اچھی طرح جانتی ہوں لی جو ایک زمانے سے آپ کا ہم راہی ہے۔“ وہ طنز بھرے انداز میں بولی۔  
 یا قوت کچھ بول نہیں سکیں۔

”اتنی ساری لڑائیاں۔۔۔ ماموہ آپ کو کتنی یاد ہے ان کی کس طرح اپنے اس ہم راہی کے ساتھ مل کر آپ نے زندہ جسموں کو زندہ لاشوں میں تبدیل کیا۔“ وہ کرب سے بولی۔  
 شاید آئینہ بھی وہ کام نہیں کر سکتا تھا جو کام اس وقت لائبرے کے الفاظ کر رہے تھے۔  
 بہت بار انہوں نے سوچا۔ اس دلیل سے نکل جا میں مگر ہیرا ریزہ خیال سوچ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کاش کبھی انہوں نے اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا ہوتا تو آج لائبرے انہیں اپنی نگاہوں میں اتنی نفرت لے نہ دیکھ رہی ہوتی۔  
 ”آپ کو ماموہ لاشیں پسند ہیں نا۔ بے جان لاشیں جو مزاحمت نہیں کرتیں میں بھی اس لاش میں بدلنے والی تھی کہ میرے ہاتھ چیروں نے مزاحمت کرنا چھوڑ دی تھی اس لمحے ماموہ میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ بہت زیادہ۔“  
 کاش آپ اس لمحے وہاں ہوتیں تو میرا تار تار ہوا لباس دیکھ سکتیں۔ مجھے ماورازار۔۔۔ ماموہ آپ سمجھتی ہیں تاکیا ہوتا ہے آپ کی سب ہی راز چھڑ میں کام ہوتا ہے نا۔ ابھی بو تھیک کی شکل میں کہیں یا راز اور مسانہ سینٹر میں ہر جگہ ایسی لڑکیوں کی کلکشن اور پھر ان میں سے بہت سی بد قسمتیوں کو سلکٹ کر لیا جاتا ہے۔ ان تاریک کنووس میں۔ چھلنے کے لیے وہاں سے نکلنے کا راستہ موت کے سوا اور کہیں بھی نہیں جاتا۔ جانتی ہیں نا آپ۔“ گور میڈم یا قوت کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

ان کے پورے بدن میں جیسے کہیں بھی زندگی کی رقیق باقی نہیں تھی۔ صرف ان کے کان زندہ تھے اور آنکھیں جو لائبرے کی آنکھوں اور اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں جہاں صرف نفرت تھی۔ دکھ اور لذت!  
 ”ان لمحوں میں میں نے خواہش کی کاش آپ آئیں اور مجھے اس حالت میں دیکھ کر ایک اچھی سی ویڈیو بنا لیں اور۔۔۔“  
 لیکن نہیں صرف ایک ویڈیو سے کیا ہوتا آپ کو تو مختلف کلائنٹس کو ڈیل کرنا ہوتا ہے۔ سب کی پسند الگ۔ سب کا مزاج الگ تو اس حساب سے انٹرکشن لیکچر۔“  
 وہ انہیں واقعی یونہی تنگ کر دینا چاہتی تھی اپنی باتوں کے ذریعے۔  
 وہ بے حس بنی سن رہی تھیں۔

”میں مصطفیٰ کو ہر حال اتنا تنگ نظر تو نہ سمجھتی تھی اور جب ان سے میں نے یہ سب سیر کیا تو بھی انہوں نے فرس خدی سے سب قبول کر لیا مگر اب عزہ تو ان کے دوست کی بیٹی تھی اور پھر عزہ کی غلطی اتنی بڑی تو نہیں۔“ وہ راک نکلیں۔  
 ”لیکن گھر سے یوں نکل کر راتیں باہر گزار کر اتنا واقعی ایک لڑکی کے لیے اچھی بات نہیں مگر مصطفیٰ کو کم از کم محمود بھائی کے ساتھ۔۔۔ جب کہ وہ اتنی سیر میں کفایت میں ہیں مجھے اچھا نہیں لگا۔“  
 دونوں خاموش بیٹھے رہ گئے۔

”اور قسمت کی خوبی دیکھو، محمود بھائی ساری زندگی بیٹے کے لیے ترستے رہے اور یہ ماما بھی تو کس طرح۔“ دائم کے پاس تو جیسے شیئر کرنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہ گیا تھا۔  
 ”تم ساری عزت سے کمر رہی ہے۔ میں آئیگا کہ ابھی شاید کچھ بھی کہنا مناسب نہیں۔ کچھ خاص بات نہیں ہوتی۔“

”ماموہ! پاپا نے ایسا کیوں کیا؟“ بہت دور بعد وہ کچھ بے بسی سے بولا۔  
 ”تمہارے پاپا اس معاشرے سے الگ تھوڑی ہیں۔“ وہ کھینکی مسکراہٹ سے بولیں۔  
 ”پھر بھی میرے لیے میری خاطر۔“  
 ”کرنا تو پڑے گا انہیں سب کچھ تمہاری خاطر سہی اپنے ان ہی قدموں پر لوٹ کر شاید جانا پڑے۔“  
 ”اگر پاپا نہ ہوتے تو۔۔۔ وہ بے یقین سا تھا۔  
 ”تو تم نے کیا سوچا ہے کیا کر دے گا؟“  
 ”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ وہ اللہ سوال کر کے بولا۔

”ماموہ! میں کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا جس سے آپ یا ماما ہرٹ ہوں یا کوئی ایسی بات جس سے ہماری یا انہل کی عزت کو اور بھی نقصان پہنچے۔ یہ سب کچھ جو بھی ہوا ہے اس کی وجہ یہی کمزور فیصلہ تو تھا جس پر جذباتی بن میں انہوں نے عمل تو کر ڈالا مگر پھر اسے جھانسنے سے بھاگ گئے اور دیکھیں۔“  
 ”شبابا! ش میری جان! مجھے تمہارے خیالات جان کر خوشی ہوئی۔ کاش ہم سب ایسے جذباتی مرحلوں پر پہنچ کر کوئی بھی برا قدم اٹھانے سے پہلے اس کے نتائج پر غور کر لیا کریں تو بہت سی خرابیوں اور مصیبتوں سے بچ جائیں۔“ وہ تاسف سے بولیں۔

”آپ ماما سے بات کریں گی؟“ وہ ذرا دیر بعد امید بھرے لمحے میں بولا۔  
 ”ابھی نہیں میرے خیال میں ان کا غصہ کہہ لو یا جھکی جو بھی ہے فوری ہے وہ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے کچھ دنوں میں۔“

”اور ماما! میں اتنے دن۔۔۔“ وہ اُلجھ گیا۔  
 ”بیٹا! جہاں اتنا صبر کیا کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ وہ یقیناً درمت فیصلہ کرے گا ہمارے حق میں۔“  
 ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ انہیں اٹھتے دیکھ کر دائم بولا۔  
 ”تمہارے پاپا کو کیوں اور دائم! مجھے لگتا ہے ایک بار تو مجھے یا قوت سے معافی مانگنی چاہیے۔ ایک بار اس سے مل کر یا کچھ دن بعد۔ ابھی تو وہ حسد ہی اتنی ہی میں ہے اسے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔“  
 اسی وقت دائم کا فون بجنے لگا۔  
 ”کس کا فون ہے، عزہ کا؟“ رخشہ اسے دیکھ کر بولیں۔



”ایک دیکھو تو آپ کے اسیٹے سالوں کی محنت کا صلہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے ماہ! آپ کے بعد یہ پرورش میں نے سمجھا تھا اس لیے ذرا اچھے بھی تو پرکھ لیں گے۔“

وہ ان کی حالت سے مزہ لے رہی تھی۔

”اور مجھے جو فریڈ کر کے وہ آپ کا اسٹینڈ کیوں نہ ہو؟ اس سے اچھا خیال اور کیا ہو سکتا ہے۔ بس میں نے جہاں گھر کے سامنے یہی خیال رکھا اور ماہ ایہ میری لکھ تھی کہ انہیں نہ صرف یہ خیال پسند آیا بلکہ انہوں نے مجھ سے شادی کرنے کا بھی فوری فیصلہ کر لیا۔“

To live in an ever-last hell (بہشت کی دوزخ میں رہنا) کیسا آئیڈیا تھا ماہ؟“

میں نے ٹھیک کہا نا؟“ وہ بے ہوش انداز میں پوچھ رہی تھی۔

سب سے بڑی قوت خاموش بیٹھی رہیں۔

”اگر آپ ہمارے ساتھ پارٹنرشپ کرنا چاہیں گی تو موٹو ویکل بزنس ہم دونوں نے یہ سوچا ہے کہ ہم آپ کے مقابلے میں آپ سے بھی زبردست ایسٹریٹس کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے جہاں تک آپ سے زیادہ ہے اور اس کی سب سے بڑی قوت کی بٹی۔ اور ماہ مجھے بھی کوئی ایسا بونیک ساتھ دے دیں تاکہ کوئی بیٹی پتھر نیلم جیسا کہ آپ کا پہلے نام تھا، ظاہر ہے اس فیملی کو سپردا کر کے لے سیتے ہیں گوشت پوست کا دل تو نہیں چلے گا۔ پھر کاروبار ہرات کا دل چاہیے آپ مجھے اچھا سا کوئی نام دیں گی؟“

وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

”اوکے نام! میں اب چلتی ہوں، جہاں تک میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ شاید ہم زندگی میں دوبارہ کبھی ملے تو کسی مقابلے کی میز پر یا۔ کسی ایسے ہی انڈسٹری کے کنارے جہاں آپ بھی کچھ لائسنس دھکیلنے آئی ہوں اور میں بھی سب سے زیادہ کاروفیشن نو اوولوا ہی سمجھتی ہوں، ماہ! وہ جانتے ہوئے رہی۔“

”ایک مشق! وہ ابھی دروازے تک نہیں پہنچی تھی کہ میری قوت کھڑی ہو کر بولیں گے کہ یہ رک گئی۔“

”تم نے ٹھیک کہا کہ اب شاید ہم دوبارہ کسی ایسی ہی جگہ پر ملیں۔ تو کیوں نہ آج جانے سے پہلے میرے ساتھ ایک کپ کافی کا پی لو، آخری کپ اور بے فکر ہو، بس کپ میں تمہیں جہیں زہر نہیں دلاں گی۔ تم خود بلازم کو بلا کر کافی کا آرڈر دے دو اور میں دونوں کپ تمہارے سامنے چکھوں گی۔“ وہ بولتے ہوئے رہیں۔

لاڈلے متذذب ہی کھڑی رہ گئی۔

”کیا ماں اپنے شوہر سے زیادہ قابل بھروسہ نہیں؟“ اسے سوچتے دیکھ کر وہ بولیں۔

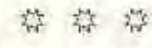
”اس میں پتھر حجت نہیں، میرے خیال میں۔“ لائیبہ کندھے اچکا کر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”تو پھر آرڈر کرو۔“

”کیوں نہ ہم کہیں باہر جا کر کافی پی لیں؟“

”تو گویا ابھی بھی شک ہے، مجھ پر کہ گھر میں کچھ نہ کچھ ملایا جاسکتا ہے، اوکے ایزبوش۔“ وہ پھلے پھلے انداز میں کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لائیبہ انہیں بخور دیکھ رہی تھی۔

”میرے خیال میں ہم یہیں بیٹھے ہیں۔ آپ ملازمہ کو بلا کر میرے سامنے آرڈر کر دیں۔“ لائیبہ قدرے مطمئن انداز میں بولی تو میری قوت مسکرائیں۔



”سو جاؤں تا آپ میں کہیں نہیں جاتا۔ آپ کے پاس ہی ہوں، کیوں لے بھروسہ ہو رہی ہیں۔“ تنزل فری

تے یا کہیں کا ہاتھ دیا کر لیا۔

”تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“ یا کہیں روئے لگیں۔

”پہلے تائیم چلی گئی، اب تم پہلے تو مجھے بتاؤ تمہارا مرض ہو بھی گئے تو لوٹ آؤ گے اور اب۔“

”تو کیا اب یقین نہیں رہا؟“

”ہے مگر وہ عورت وہاں سے تمہاری۔“

”پلیز زانی! وہ ایک دم سے کھڑا ہو گیا۔“

”اب اگر آپ نے یہ بات دہرائی تو میں واقعی آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“

”اور تم جو بھائی باپ ہیں تمہارے ماں باپ کی محبت سب سے زیادہ، آؤں کو بے بس کر دیتی ہے۔“

”تو آپ واقعی چاہتی ہیں میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں؟“ وہ دھمکانے والے انداز میں بولا۔

”اچھا چھوڑیں، آپ سے ایک بات کہنی ہے۔“ وہ ڈرا دیر بعد بولا۔

”اور آپ کا خیال ٹھیک ہے امی! مجھے یہاں رہنا تو نہیں۔“

”تنزل! اب وہ دل نکلیں۔“

”ابو کاروبار۔“ نہیں امی! یہاں رہنا اور یہ فیس کرنا اب بہت مشکل ہو گا میرے لیے۔“

”اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں، تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔“ وہ پھر سے روئے لگیں۔

”امی! میں شادی کر رہا ہوں۔“ وہ یا کہیں کے آسوا صاف کرتے ہوئے۔ رُک کر ایک دم سے بولا۔

یا کہیں کے آسوا وہیں روک گئے۔

”اب یہ مذاق رہ گیا تھا کرتے کوہ۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”مذاق نہیں، حقیقت امی! اور لڑکی بھی اچھا پسند گئی میں نے۔“

”مذاق کہہ رہے ہو تنزل!“

”امی! بس عورت کی ذہنی ہوئی ایک اور لڑکی۔ تائیم جیسے۔ آپ اسے قبول کر لیں گی نا؟“

اور یا کہیں جیسے جواب میں بولنا ہی بھول گئیں، ایسا تو انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔



”نہ کھلا۔ کتنا بڑا دھوکے باز انسان ہے تمہارا باپ! ایک عمر مجھے دھوکے میں رکھا جس کے ساتھ محبت کی اس کو کتنا بڑا دھوکا دیا۔ یہ ہے اس صاف ستھرے بظاہر، مذہب انسان کی اندر سے اصلی صورت تو کیا میں اس سے غلط لڑتی چھگلتی تھی۔“

سارہ عمر کے پاس بیٹھی بچت پڑنے والے انداز میں بولی۔ عزت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”ایسا بے وقاف انسان نہ چھو جس سے محبت کی اسے کیسا کھلا دھوکا دیا اور ساری زندگی قسمیں کھاتا رہا، جھوٹی قسمیں کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”اور مجھے پہلی بار عزت! پہلی بار نیلم سے اتنی ہمدردی محسوس ہوئی، ہو سکتا ہے وہ بہت بڑی عورت ہو بڑے کام کرتی رہی ہو، مگر یہ بھی تو دیکھو، اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا گیا، پہلے ہمارے گھر میں پھر اس شخص نے میرا دل چاہتا ہے۔ اس عمر میں تمہارا خیال نہ ہو تا تو عزت۔“

وہ بولتے ہوئے رُک گئی

”تمہاری شادی ہو جائے جلدی سے تو میں اس دھوکے باز کے ساتھ ایک دن نہیں رہوں گی۔ یہ تو طے کر لیا





زندگی کب میرے پتدار کا سودا کر دے  
 جانے کب کوئی ضرورت مجھے بھوکا کر دے  
 کب اُڑا کر مجھے لے جائے ہوا دور کہیں  
 آسمان کب میری ہجرت کا اشارہ کر دے  
 دُشمنی مار نہ دے جان سے بڑھتے بڑھتے  
 دوستی مینے کا مجھ سے نہ تقاضا کرنے لے

یہاں کتنا اندھیرا ہے  
 ہزاروں سال سے گہرا یہ کوئی غار ہے شاید  
 ہزاروں سال سے اونچی کوئی دیوار ہے شاید  
 ہزاروں سال سے لمبا کوئی بازار ہے شاید  
 ہزاروں سال سے صبح  
 پُرانا داڑھ پہنے  
 ہے اپنے راستوں میں گم  
 ہزاروں سال سے مسکن  
 ہے جانے دن کہاں پیارے  
 نہ جانے ہیں کہاں ہم تم  
 کامی شاہ

دوستی مینے کا مجھ سے نہ تقاضا کرنے لے  
 مجھ میں کھینچ کے لے جائے میری تنہائی  
 میری دستت مجھے پھر مجھ میں تنہا کر دے  
 ہے ہر اک شخص کے ہونٹوں پر گزارشِ بہیم  
 میرے مولانا میرے حالات کو اچھا کر دے  
 دل سے نکل ہوئی اک آہ مادے مجھ کو  
 ایک پٹکا ہوا آنسو میرا چریا کر دے  
 شمیم ناطقہ

پہلے سے

معرزہ کی شادی کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج ابھی کیوں نہیں۔  
 ان دونوں کو پتا نہیں چلا کہ محمود عالم ان کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے تھے۔  
 "مٹی شرم تو ہے مجھ میں، تم میں نہیں ہوئی کہ خدانے یہی کی ضرورت ہی تو میں اسے بھالنے کی کو مشعل  
 کروں۔" وہ تضحیح کر بولی۔  
 "زندگی بھر تو تم نے یہ کوشش کی نہیں تو اب بھی کیا ضرورت ہے۔" وہ جواباً بولے۔  
 "تمہیں طلاق چاہیے نا ایک دن تم مجھ سے دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔  
 تم عزہ کی فکر مت کرو۔ اس کا یا پ ابھی زندہ ہے۔" وہ تضحیح سے بولے۔  
 "تمہیں طلاق چاہیے نا تو میں تمہیں طلاق۔" وہ نفرت بھرے انداز میں دیکھ کر بولے ہی لگے تھے کہ عزہ  
 اٹھ کر ان دونوں کے درمیان آگئی۔  
 "عزہ! تم ہٹ جاؤ بیچ میں سے۔" وہ غرا کر بولے۔  
 "ہٹتی تو رہی ہوں۔" وہ بھی اسی لیے میں بولی۔  
 "اور مجھے اس بات میں بھی کوئی اعتراض نہیں کہ آپ دونوں اب مزید اکٹھے نہ رہیں، پہلے آپ دونوں نے  
 اکٹھے رہ کر کیا کر لیا۔ کم از کم میرا نقصان تو گویا۔" دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تضحیح سے بولی۔  
 "آپ بے شک کوئی بھی فیصلہ کر لیں، لیکن پہلے میرا فیصلہ سن لیں۔" وہ دونوں کی طرف دیکھ کر بولی۔



سٹر جرنلگیر ہوائی سٹیٹ نمبر 105 اوکے۔ وہ یہ سیشن سے معلوم کر کے مسکراتے ہوئے آگے  
 بڑھنے لگیں۔  
 "ہمیں اطلاع کروں؟" ریسٹنٹ نے انہیں ٹوکا۔  
 "نہ تو تھیں مکس میں پہلی جاؤں گی۔ آئیں میں فون کر چکی ہوں۔" وہ مسکرا کر جواباً بولیں۔  
 ریسٹنٹ مسکرا کر فون اٹینڈ کرنے لگی۔  
 لفٹ رکتے ہی وہ باہر نکل آئیں۔  
 "صوری لایہ، مٹی! کم از کم میں تمہیں اتنی دکھ بھری زندگی کے حوالے نہیں کر سکتی۔ کچھ تو مجھے کرنا ہی تھا اور  
 میری جان مرنا تو سب کو ہی ہے ایک دن اس سے فرار تو کسی کو بھی نہیں مجھے، تمہیں۔۔۔ بھی سب کو مرنا ہے  
 ہے ناکہ اور اگر آپ کی یہ موت بہت سوں کی مشکلوں کو آسان کر دے تو کیا یہ مرنا اچھا نہ ہوا۔"  
 وہ گورنڈور کے سر سے رہی رک کر خود کو گیموز کرنے لگیں۔  
 ظاہر ہے یہ کوئی چھوٹا کام تو نہیں تھا جو وہ کر آئیں اور آج تک یا قوت نے چھوٹا کام کیا کون سا تھا۔ حتیٰ کہ دل  
 کے معاملے میں بھی جب محبت نہ ملتی تو اس نے ہر محبت بھرے دل کو بچھڑا دیا۔  
 وہ سچ سچ کر چل رہی تھیں۔  
 اس بات سے بے خبر کہ کوئی اور بھی ان کا فتنہ ہے، ذرا اس دیر میں ہونٹوں میں ایک دلہنہ لہو لہو چھوڑی تھی جس  
 نے لہجہ بھر کے لے ہر شے کو سناکت کر دیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)



# شکست جہاں رزق آگاہی

آدمیت کا عرض سامان مہبت کر دیا  
اک عرب نے ادھی کا بول بالاکر دیا  
شاہدہ شہیرا نا۔ رحمان گڑھ

بگھ باتیں بڑے لوگوں کی ما  
آپ کے ساتھ اچھی گاڑی میں سواری کرتے کے  
لئے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی مگر آپ  
کی زندگی میں کیا کوئی ایسا شخص بھی ہے جو گاڑی  
خواب ہونے پر آپ کے ساتھ میں میں سفر کرے۔

(ادبہ اذقری)  
ڈھلکی عمر کے پیار کی خوشی جلتی ہوئی سبز لکڑی  
کی طرح ہوتی ہے اس لیے کہ آگ بجھنے میں سبھی  
درختوں سے اس سے آگ ہی زیادہ حرارت پیدا ہوتی  
ہے اور اس کی قوت اتنی ہی زیادہ دیر نکت  
برقرار رہتی ہے۔ (کریمین وروا)  
گل انشالہ صادق آباد

محبوب کے لیے  
وہ میرا شمال اور جنوب، میرا مشرق اور مغرب تھا  
میرے ہنسنے پھرنے کا کام تھا اور توراہ کا آرام تھا  
میری دو پہر میری ہمہ شب میری گفتگو میری گیت تھا  
میں نے سمجھا کہ پیار ہمیشہ باقی رہے گا  
مگر میں غلط تھا۔

(ڈی بیو ایچ آڈن)  
ماہیہ شہر میں معروفوں کی ایک کتاب  
شراب کا ایک پیالہ روٹی کا ایک ٹکڑا  
اور تم میرے پہلو میں گیت گاتی ہوئی  
ادھ جنگل بھی میرے لیے جنت کا ٹکڑا بن جانے کا  
(مطرخام)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
سندنا ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے  
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا  
"وہ شخص جس کا دل کھول کر میں توجہ دوں گا گناہ  
اسی پر ہوگا جو بہت دکرے گا۔ جب تک مظلوم زیادتی  
نہ کرے۔"

حضور کی عظمت آئینہ عالم میں ما  
ایک نامعلوم متعصب ذہنیت رکھنے والے مؤرخ  
یوں رقمطراز ہیں۔

"ہر بات مجھے وسط جہت میں ڈالنی ہے کہ جس  
ایک عزیز اور غلو کہ مال مسلمان ایک ایسی مسجد  
میں بیٹھے ہیں جس کی چھت کعبہ کے پتوں سے ڈھکی ہے۔  
سنی کہ بادشہ ہونو چھت ٹپک ٹپک کر رہے ہیں پھر ہوجاتی  
سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کار جب سجدہ  
کرتے ہیں تو یہ سنی کعبہ سے لٹ بات ہوجاتی ہے۔  
مگر یہ لوگ مسجد میں بیٹھ کر مشوے کرتے ہیں تو یہ ان دور  
کی سلطنتوں کو تخت و تاج کرتے اور آئین کردہ ایران  
کو مٹا کر کے خاندانہ داعی مگر انی تمام کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر  
ہم دیکھتے ہیں کہ چند ہی سالوں میں یہ ایسا کر دکھاتے  
ہیں۔ میں محمد کی رسالت کا تو قائل نہیں ہوں مگر یہ  
بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ اتنا بڑا انقلاب کیسے  
آ گیا۔"

ہندوستان کے مشہور شاعر ہری چند اختر  
کہتے ہیں۔  
خمس نے قطروں کو ملایا دریا کر دیا  
کس نے قدروں کو اٹھایا سحر کر دیا  
کس کی حکمت نے یہ تپوں کو کیا دیا۔  
اور غلاموں کو زمانے کا مولہ کر دیا

وفا سرشت ہوں دُوری میں بھی محبت ہے  
اکیلے رہنے میں لیکن بڑی اذیت ہے  
یہ جاگتی ہے تو پھر دیر تک جگاتی ہے  
مرے وجود میں سوئی ہوئی جو وحشت ہے  
جہاں یہ عشق کی سرحد جنوں سے ملتی ہے  
وہاں یہ آگے ملے وہ اگر محبت ہے

بہت ہیں خواب مگر خواب ہی سے کیا ہوگا  
ہمارے سچ جو حال ہے وہ حقیقت ہے  
وہ دور آیا کہ وہ بھی گھروں کو چھوڑ گئے  
جو سوچتے تھے کہ اب مستقل سکونت ہے

سمجھ رہے تھے مسافر قیام کو منزل  
خسبر نہیں تھی کہ آگے بھی ایک جہت ہے  
بہت سے لوگ ریلوں میں چھپانے بیٹھے ہیں  
یہ فاطمہ ہی نہیں ہے جسے شکایت ہے  
فاطمہ من

وہ حال ہے کہ تلاشِ نجات کی جلتے  
کسی فقیر دُعا گو سے بات کی جلتے  
یہ شہر کیسا خوش اوقات تھا اور اب کیا ہے  
جو دن بھی نکلے تو وحشتِ ندرت کی جلتے  
کوئی تو شکل گماں ہوا، کوئی حیلہ خیر  
کسی طرح تو بسراپ حیات کی جلتے

گھروں میں وقت گزری کا اب سے شغل ہی کیا  
نہی کہ گفتگو نے حادثات کی جلتے  
مصر ہے دل کہ مخاطب ہوں امتعاروں میں  
گھٹن یہ کہتی ہے، اب کھل کے بات کی جلتے  
کچھ ایسے بھی ہیں تہی دست و بے نوا جن سے  
ملاؤں بات تو خوشبو نہ بات کی جلتے  
عشر بہا یونی



مجھے یقین ہے کہ اگر میں مر جاؤں اور تم میری قبر کے پاس سے گزر دو تو میں زمین کی گہرائیوں میں بھی تمہارے قدموں کی آواز سن لیں گا۔  
(بنی نوہرہ کلمہ دوں)  
جتنی بار تم میرے ہوتوں پر مسکراہٹ لاتے ہو اگر اتنی بار میں ہاتھ بٹھا کر آسمان سے ایک ستارہ توڑ سکوں تو رات کا سارا آسمان میری جھپٹی پر آجائے۔  
(ذوقِ حقّی یاد کر)  
ہر روز میں تمہیں گورے ہوئے گل سے زیادہ ادھر لے والے گل سے کم محبت کرتی ہوں۔  
(روزِ محشر جبریلؑ)

تمہارے ساتھ گورے ہوئے گلچات میرے نزدیک ایک خوشبودار باغ، ایک منگھی شام اور ان میں گنگنائے ہوئے ایک فوارے کی مانند ہے صرف تم ہی مجھے احساس دلاتی ہو کہ میں زندہ ہوں۔  
کہا جاتا ہے کہ دو سروں نے فرشتوں کو دیکھا ہے لیکن میں نے تمہیں دیکھا ہے اور میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔  
(پارچہ نمونہ)  
پیارا ایسے ہی سسکے پہنچا لے ایسے جیسے کہ یادش کے بعد دھوپ۔  
(شکستہ گیسٹرا)  
غزوہ اقرہ کراچی

### آسان کام

دو درجہ پڑھ کر ہاں اور کام چور آدمی پارک میں بیٹھ کر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے، ایک بولا۔  
"میں نے بائیس سال کی عمر کو پختہ سے پہلے ہی تہمت کر لیا تھا کہ میں بہت دولت کماؤں گا اور ایک اہم کیریئر میں ہوں گا۔"  
"لیکن تم میری قبر تو نہیں دیکھے؟ دوسرے نے حیرت سے کہا۔  
"دراصل بائیس سال کی عمر کو پختہ سے بس کچھ روز پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ دولت کمانے کے مقابلے میں خیالات تبدیل کر لینا زیادہ آسان کام ہے، پچھلے کاہل نے جواب دیا۔  
جاسم مریم نوید۔ کراچی

### زریں اصول

جب دو کاریں آپس میں ٹکرائیں تو یہ فیصلہ کریں طرح کیا جائے گا کہ کون سا ڈرائیور غلطی برپا ہے ہمارے لوگوں نے اس مسئلے میں چند اصول بنائے ہیں۔ ممکن ہے ان پر عمل کرنے سے دوسرے ممالک کے لوگوں کو بھی فائدہ ہو۔  
\* غلطی ہمیشہ سیکینڈ ہینڈ اور کم قیمت گاڑی والے کی ہوتی ہے۔

\* غلطی مرد اور ٹیوٹر کے، نفاقوں اور ٹیوٹر کی نہیں تو وہ بغیر لائسنس کا ریلا رہتی ہو۔  
\* غلطی ملازم اور ٹیوٹر کی ہے، مالک ڈرائیور کی نہیں۔  
\* غلطی ہمیشہ معمولی لباس پہننے والے اور ٹیوٹر کی ہوتی ہے۔ ریونیو نام یا مینوٹ پہننے والے کی نہیں۔  
\* غلطی ہمیشہ مقامی یا اور پورے والے اور ٹیوٹر کی ہوتی ہے، انگریزی بولنے والے کی نہیں۔  
کریمن، مینٹیشن، سکرچی

### چراغ زندگی

کسی کام کا آغاز اس کی نصف کامیابی ہے۔ بغیر مقصد کے زندگی کوئی یا شہ نہیں گزرتی۔ سو آغاز بہت اور مقصد بہتر بن جاتا ہے۔  
جس چیز کو دیکھنے سے نظر فریب ہو، اسے دیکھنا بہتر ہے۔  
آدمی جب تک ٹوٹتا نہیں، اسے چاہیں چلتا کہ وہ کتنا مضبوط ہے۔  
گردگی مضبوطی میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ایک قوت اور دوسری ضبط نفس۔  
محبت میں محنت جائز ہے دھوکا ہاں تو نہیں۔  
سیوہ نسبت کیلانی۔ کپڑوں کا

### تو ہی ہے ما

ایک شاعر نے مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ کا اس شعر پر اعتراض کیا۔

بس کہ دریاں نکارو چشم ہیرام قوی  
ہر کہ بھلائی ستارو دود بھلا قوی  
(تو میرے دل اور آنکھوں میں اس طرح سما ہوا ہے کہ دود سے ہر آنے والے کو سن سجتا ہوں کہ تو جی ہے)  
شاعر کا اعتراض تھا کہ اگر دود سے گدھا آتا دکھائی دے تو پھر آپ کیا سمجھیں گے؟  
مولانا نے جواب دیا، میں سمجھوں گا کہ تو جی ہے!۔  
انیقدا نار پچوال

### تعلیم بالغان

پانچویں کلاس کے اکثر طالب علم آج دیر سے کئے گئے، اسمبلی میں منظر ملنے پر ایک طالب علم نے وجہ بتائی۔  
"سر کے بال رنگنے کی وجہ سے دیر ہو گئی۔"  
"خورد میں روئے ہوئے نیچے کی وجہ سے اسے سن خیر مشکل ہو گیا تھا۔"  
"ایک ٹائٹل میں دو طالبات نے آپس میں ہنسی اور ہنسے مارنا شروع کر دیا۔"

آج طالبات بچت ہر سال کلاس کیوں کہ زیادہ تر طالب علم اپنی چھتری اور نظری کی عینکیں گھر بھنول آتے تھے۔  
ابچوہ محاضری علوم کا سبق سننا رہا تھا کہ اسے موبائل پر ایس ایم ایس آگیا۔  
"بارک ہو، اب دادا میں گئے ہیں!"  
"مے کا پوچھا تھا، بسنے میں شہر لو وہ گیٹ کے پاس گئے ہی والی تھی کہ ایک لڑکے نے اسے "ای" کہا کہ اس سے بہت لے لیا۔  
وہ طالبات کی اکثریات پر بے ساختہ ہنسا کرتا تھا۔ اور سب طالبات اس سے شرمانی تھیں مگر اس دن وہ بہت شرمندہ ہوا۔ جب طالبات کی کسی بات پر کھنکھلا کر ہنستے ہوئے اس کی "بھئی" پیچھے کر گئی۔

مدیحہ یوسف۔ کراچی

# خانا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ  
لاہور

فروری 2011 کا شمارہ "سارگرمز" شائع ہو گیا ہے

فروری 2011 کے شمارے کی ایک جھلک

گجرات "حقیقہ کیلانی" سے ملاقات

"گولڈی زخم بھر گلاب" نیلہ ابوراہہ کا نکل، دل

"محبت سندیسہ سے پیار کا" ام مریم کا نکل، دل

"تم سے تمہی تک" نازبہ مغل کا نکل، دل

"راستے محبت کے" سنگتہ بھٹی کا نکل

"محبتوں میں حساب کیا" منجیبہ فیصلہ کا نکل

"اس کے علاوہ" انیسٹین انیسٹین خان، نازبہ مغل اور

شاہدہ مصطفیٰ کے نکل

"پیدا سادشت" فرحت سلوگت کا نکل، دل

"میرے ساحر سے کہو" ام مریم کا نکل، دل

"میں ستارہ صبح امید کا" فوزیہ مغل کا نکل

جاسم مریم نوید کی باتیں، انکا، نازبہ مغل اور دیگر شہزادہ کی دنیا کی دلچسپ معلومات کے علاوہ داتا کے بھی مشعل سلسلہ شامل ہیں

فروری 2011، کا شمارہ  
آج ہی اپنے قریبی بک اسٹال سے طلب کریں



ایک ہری فرم کے مالک تقاینے دوست سے کہا۔

میرا اکاؤنٹ منخواہ کی ایک پانی مالل کھا تا ہے۔ اس نے میں بارہ گھنٹہ تک کے سلسلے میں جیل جانے سے بچایا۔

ہر ایک آپ اپنے شوہر کے مستقبل کے بارے میں کچھ جانتا چاہیں گی، قسمت کا مال بتانے والے نے ایک خاتون سے پوچھا۔  
"جی نہیں، قانون تو ہیں مجھے تو بس آپ اس کے ماحی کے بارے میں تعینل بتا دیجیے!"

ایک صاحب کی بیوی کہیں غائب ہو گئی، انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا۔  
"میری بیوی ایک ہفتہ سے غائب ہے۔ اگر کسی نے اطلاع دینے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔"

آسیہ باویدر علی پورچھٹہ

زادوں کی تلامش

ایک بادشاہ کو ایک ہم پیش آگئی۔ اس نے مننت مانگی کہ اگر میں اس ہم میں کا ایسا ہو گیا تو زادوں کو دو ہم دونوں کا اللہ نے اس کی مراد پوری کر دی تو اس نے مننت کی رقم ایک خاص غلام کو دی اور حکم دیا کہ اسے زادوں میں بانٹ دو۔  
یہ غلام بڑا عقل مند تھا۔ وہ تمام دن گھومتا رہا اور تمام کو دیکھ کر تمام رقم پوری کی پوری بادشاہ کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جنگلے پناہ! میں نے ہر چند ڈھونڈا، لیکن مجھے کوئی زاد نہیں ملا۔"  
بادشاہ نے کہا "کیا بتا ہے۔ میرے علم کے مطابق تو اس ملک میں ہزاروں کم زاد نہ ہوں گے۔"  
"عالم پناہ! جو زاد ہے وہ لیتا نہیں اور ہر لیتا

ہے وہ زیاد نہیں

ستیدہ نسبت زہرا کبر و پکا

بائیں قلیس جبران کی

اگر تیرا دل آتش نشاں ہے تو سپر کیوں تو قہر رکھتا ہے کہ وہ جھولوں کو تیرے ہاتھ میں ترو تا تازہ رہنے دے گا۔

میا لقا ایک حقیقت ہے بس کی فطرت تاملو سے باہر ہوتی ہے۔

بڑے سے بڑے غمی اور بڑے سے بڑے فقیر کے درمیان فقیر فاصل ایک دن کی جھوک اور ایک دن کی پیاس ہے۔

جب تمہارا غم یا خوشی مدرسے بڑھ جائے تو دنیا تمہاری نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔

دوستی میں کوئی عزم نہیں ہوتی چلبے۔ سولے اس کے کہ روح کی گہرائیاں پیش نظر ہوں۔  
گروا شاہ۔ کبر و پکا

ادویات کی مختصر تاریخ

- 1. ڈاکٹر میسرے کان میں درد ہے۔
- 2. 2000 قبل مسیح - لویہ بونی کھاو۔
- 3. 1000 قبل مسیح - لویہ کھانا پھرک ہے۔ لویہ ڈکار چھو۔
- 4. 1850 بعد از مسیح - دفا کو تا دم پرستی ہے۔ لویہ عرق پی لو۔
- 5. 1950 بعد از مسیح - عرق تو صاب کا زہر ہے۔ لو یہ کوئی نکل لو۔
- 6. 1925 بعد از مسیح - یہ گولی توبہ اڑھے۔ یہ ایٹمی یا ٹونک لو۔
- 7. 2000 بعد از مسیح - یہ ایٹمی یا ٹونک تو مصنوعی ہے۔ لویہ بونی کھاو۔  
فدیو سلیم - کراچی



حارون کی ڈاڑھی

کبکشاں اگھذ

علامہ اقبال محض ایک شاعر نہیں تھے۔ ان کے یکمانہ تدریسے مسلمانوں کے ذوال کی سنگینی کو محسوس کسا اور ان کی باتوں میں نظرے اس ذوال کے دور میں نتائج کی جو تصویر دیکھی وہ آنتہائی عبرت ناک تھی۔ وہ مسلمانوں میں جو خضوع و صیانت دیکھنا چاہتے تھے اس کے لیے انہوں نے شاہین کو مثال دینا کر پیش کیا۔ ان خضوع و صیانت کے لیے اقبال نے موجودہ دن کی کوئی تصدیق نہیں کی۔ خصوصاً آج کی فوجیان نسل کے لیے ان کے کلام کو پڑھنا اور اس کے مقصد کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

فنون لطیفہ

اسے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مستعد ہتر سوز صیانت ابدی ہے یہ ایک نفس یاد نفس مثل شرد کیا

جس سے دل دریا تلامظ نہیں ہوتا اسے فطرۃ نیسا لہ صدف کیا، وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو مگر معنی سکا نفس ہو جس سے چین انسر وہ ہو وہ باہر کیا

یہ معجزہ دنیا میں آج بھی نہیں تو ہیں جو حریبہ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

سیراجیات

میری ڈاڑھی میں تحریر محمد اللہ شاہ کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ حقیقت کی عکاسی کرنی ہوتی یہ غزل امید ہے آپ سب کو بھی پسند آئے گی۔

دُھوپ کا چاندنا

یہ جو پرستش ہے خافتہ، یہ جو زخم زخم نکلیا ہے یہ ہے داستان میرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا آہاب ہے

جہاں ترجمانی ہو جھوٹی کی، جہاں حکمرانی ہو ٹوٹ کی جہاں یات کرنا محال ہو، وہاں آگہی بھی غلاب ہے

میری جان ہوٹا لو کھول تو مجھی اپنے حق میں بھی بول تو یہ عجیب ہے تیری فاشی، نہ سوال ہے نہ جواب ہے

سر راہ چراغ علیے گا کیا، کوئی منزلوں کو چلے گا کیا بڑا دل ہے ابھی، تجھا ہوا، تری آنکھ میں ابھی خواب ہے

وہی آب آب ہیں آکھے، وہی فصل فصل ہیں فاصلے وہی خار خار ہے راہ گزار، وہی دشت دشت سراسر ہے

وہی بام ددر ہیں چلے ہوئے، وہی پاند چرچر ڈھلے ہوئے وہی بیج کوئے ملال ہے، وہی شام شہر خراب ہے

مجھے مقرر تجھ سے گلہ نہیں، کہ میں خود ہی تجھ سے سلا نہیں میری زندگی بھی غلاب ہے، تری زندگی بھی غلاب ہے





بدل دے زندگی کا ہر انداز



منٹو  
توتھ پیسٹ



- ✓ کیلشیم اور فلورائیڈ سے دولت منطبق
- ✓ Extra Whitening سے
- ✓ دانتوں پر اونگھی چمک اور سفیدی
- ✓ مکمل Tartar کنٹرول
- ✓ ناماتھو دوش سے منگنی مہاسیں

Extra Whitening

خالہ جیلانی  
میری وطن سے

شین اقبال نوشی \_\_\_\_\_ گاؤں بدر مرچان  
وہ بچپن کی ٹیڈ آواب خواب ہوئی  
کیا غرتھی کہ رات ہوئی اور سو گئے  
کیا دکھ تھے کون جان سکے گا گارنڈ  
جو میرے اور تیرے دوپٹے جھگو گئے

فی قریشی \_\_\_\_\_ فراب شاہ  
بھول خوشبو کو ہوا میں فلا گہرا لکھنا  
سات رنگوں میں کبھی آس کا سزا لکھنا  
تقلیاں رنگ لیے پھرتی ہیں چاروں جانب  
کلتا مشکل ہے بیماروں کا فقید لکھنا

سیدہ فرزانہ \_\_\_\_\_ چھوڑ شاہ منیم  
خود پس من کا پھیرا ہوں گروں کی مانند ہے  
ہر ذشت پر سالوں کی طرح ٹوٹ کے برکوں  
اتیل امام \_\_\_\_\_ چھوٹ  
دکھ دے گا بدل کے وہ میرے دہب کی صورت  
میں ہرٹ کا اشاں ہوں تو وہ دھوپ کی صورت

سیدہ فرزانہ \_\_\_\_\_ چھوڑ شاہ منیم  
ریشری محبوباں خدمت مگر  
تو نے وعدہ کیا تھا یاد تو کر  
سمرزاشتہ لیشن راؤ \_\_\_\_\_ کھوٹ ادو  
یہ بھی آداب ہمارے ہیں تمہیں کیا معلوم  
ہم تمہیں جیت کے ہارے ہیں تمہیں کیا معلوم

نسبت سینو \_\_\_\_\_ کپور پٹکا  
بغیر وجہ کے نہیں بے رخی عدم ان کی  
ہر روز ہم سے وہ رنجنت نیا دہ گھٹے ہیں

سیدہ فرزانہ \_\_\_\_\_ کپور پٹکا  
ملا تو اور بھی تقسیم کر گیا مجھ کو  
سینٹی تھیں سے میری کرتیاں محسن



ساتھ عظیم نئی

کتاب — وسیلہ ظفر  
 مرتب و تدوین — انور احمد علوی  
 شکر و شکر جمال  
 زیر اہتمام — اکادمی بازیافت  
 قیمت — 200 روپے

معروف مزاح نگار انور احمد علوی نے جب مجھے نئی شائع شدہ کتاب ”وسیلہ ظفر“ کا تحفہ دیا تو میرا ذہن اپنے بچپن کی فلموں کی طرف مڑ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ معروف ادیب ابو ظفر زین وہ پہلے ادیب تھے جنہوں نے مجھے اپنی کتاب ”پازنی اردو“ اپنے دستخط کے ساتھ عطا کی تھی۔ اسکول کے دور میں ملنے والے اس قلم کار کے لیے ممنونیت اب تک میرے دل میں ہے کہ مجھ جیسے طفل کتب کو انہوں نے اپنی کتاب کے ملاحظہ جاننا مجھے میں نے بالکل مختلف کیفیت کے ساتھ پڑھا اور ان کی شگفتہ نثر سے متاثر ہوئی۔ میری یادداشت میں ابو ظفر زین کا چہرہ اب وہندلا وہندلا سا ہے کہ وہ میری سیسیلوں کی آغوش کے پر شوق دادا اور رشتہ جانی کے والد محترم تھے اور میں ان کی بچوں سے محبت اور کتابوں سے ہمراہی کے دوروں کو بڑے رشک سے دیکھا کرتی تھی۔ حال ہی میں ان کے مصنفین کا انتخاب ”وسیلہ ظفر“ کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔

ابو ظفر زین صاحب طرز ادیب ہیں۔ انہوں نے مزاح برائے مزاح کے قائل ہوتے ہوئے بھی مزاح برائے اصلاح تحریر کیا ہے۔ نرمی مقصدیت ان کا مزاج تھا، نہ شعار۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پر معنی باتیں کر جاتے ہیں کہ معاشرے کی ناہمواری کو ان کی چلبلی نظر بھانپ لیتی ہے اور وہ قلم کی نوک سے جھپٹن دینے کی بجائے ملاحظہ نثری اور شائستگی سے فقرہ کہہ جاتے

ہیں کہ سوچا کوئی راہ تو ملتی ہی ہے جھمکے فقرہ گو کہ گدائے الفاظ سے سیاست ان کا پتہ پتہ موضوع ہے وہ منجھکے خیز صورت حال کو بڑے سلیقے سے ناپ لیتے ہیں۔

”کراچی 1946ء میں“ یہ ایسا مضمون ہے۔ جس میں اس دور کی کراچی کو یاد کیا ہے۔ آج کے کراچی کو دیکھتے ہوئے اس مضمون کو پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے ایک سیٹھ صاحب کو کرائے کے گھر کی تلاش سے بالآخر انہیں گھر مل بھی گیا ہے۔ اس مضمون کا آخری پیرا گراف دیکھیے۔

”چلو میں تمہارا مکان کرائے پر لے تو لوں۔ تین ماہ کے لیے نمک۔“ چندویں ماں نے فوراً ”میری بات کاشی۔“ سرکار مائی باپ ہیں۔ کراچی تو ساڑھے تین روپے باہوار ہے۔ لیکن لالہ جاکئی لالہ کے تم دوست ہو چار آنہ کتنی۔ کیا کروں بابا! ابھی کھر جاہت بڑھ گیا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر گھر کے بالکل سامنے یہ خالی پلاٹ برائے سارے گھوڑے اور گدھے جو بندھے ہیں اور گدھی پھیلا رہے ہیں۔“

جانائی کے گدھوں سے گھر پرے ہاتھ جن سے شاہد وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے لگا رہی تھی ”میرے منہ کے سامنے نہجائے ہوئے چندویں مائی بولی۔“ بھولا سا میں!

یہ سب گھوڑا اور گدھا سرکاری ہے۔ آج کل جمین (زمین) کا بوجھ بھی گھڑا جہاں پر بھی کھالی (خالی) پیرا ہو وہ سرکاری گھوڑے اور گدھوں ہی کے لیے تو ہوتا ہے۔ اور کچھ ان کے چھلکے ملاحظہ کریں۔

- (1) کیوٹ ممالک میں کوئی نہیں پوتا، جمہوری ممالک میں کوئی نہیں سنتا۔
- (2) میں حق کی حمایت میں جیل کے دروازے تک جاسکتا ہوں۔ اور بس۔
- (3) اس دور میں چوری کرنا جرم نہیں، پکڑے جانا جرم ہے۔
- (4) ہاتھیوں کو کبھی کلوری کی فکر نہ ہوتی، اسی لیے وہ بسی عریا تے ہیں۔
- (5) چھوٹا قائل تختیا تا ہے بڑا قائل تخت۔

(6) جرم بے رشک کر۔ اچھا کھیل تمہیں بری کرا دے گا۔

ابلی جگہ — عنادل  
 ترتیب — رشید خالد رائے  
 یا سمین کاشف  
 مقام اشاعت — گورنمنٹ کالج  
 برائے خواتین اوکاڑہ

دیکھنے میں آ رہا ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں میں طلبہ و طالبات کی ترجیحات مختلف ہو چکی ہیں۔ اس کے لیے عموماً ”طلبہ و طالبات پر الزام دھرو دیا جاتا ہے کہ وہ صحت مند تعمیری سرگرمیوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔“ تفریحی سرگرمیاں اولیت حاصل کر چکی ہیں کہ یہ سہل الحصول بھی ہیں اور دسترس میں بھی ہیں۔ یقیناً ”یہ نازک ترین دور ہے کہ نہ تو جدید ٹیکنالوجی سے بچوں کو دور رکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی مکمل طور پر ان کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ ایسے میں وہ ایسا تہہ قابل قدر ہیں جو آج بھی طلبہ کی ذہنی تربیت و شعور کے حوالے سے سرگرم رہتے ہیں اور اپنا فریضہ نبھانا جانتے ہیں۔ ایسی ہی کوشش ابلی جگہ کی صورت میں نظر آتی ہے۔ جس کی روایت برسوں سے چلی آ رہی ہے۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک ایسا ہی ضخیم جملہ موصول ہوا جو گورنمنٹ کالج برائے خواتین اوکاڑہ کی اساتذہ طالبات نے ترتیب دیا ہے۔ بڑے ابلی مراکز سے دور اوکاڑہ جیسے شہر سے قلم کاروں کو تحریروں کے ایک کٹکٹانی بھر مٹ کی شکل دی گئی ہے۔ اس جملے میں ترتیب و تزئین کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور تحاریر کے انتخاب میں بھی معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ بعض تخلیقی کوششوں سے امید نظر آتی ہے کہ مستقبل میں اردو ادب کو اچھے لکھنے والے لکھیں گے۔

مجموعہ گلام — آئندہ لگتی نہیں  
 شاعر — اسد بیگ  
 زیر اہتمام — حرف اکادمی  
 قیمت — 200 روپے

”آئندہ لگتی نہیں“ کا عنوان دیکھ کر میرے ذہن میں خیال ابھرا کہ اسد بیگ کی شاعری میں ہجر کا کرب اور فراق کا دکھ نمایاں ہو گا۔ گریہ و نالہ و شیون ان کا مزاج ہو گا۔ شب بیداری ان کی عادت ہو گی۔ نیند ان کی آنکھ سے گزرا کر گزرا جاتی ہو گی۔ زہر میسر جو مجھ کی ورق گردانی کرتے ہوئے ”اسد بیگ کی شعری فضا میں سانس لیتے ہوئے اپنے ہی خیال کو فوراً ہی رو کر دینا پڑا کہ جہاں لوگ خواب کی دنیا میں بھٹکتے پھرتے ہیں“ وہاں وہ تعبیر کا سر اٹھانے بیٹھے ہیں۔

وہ محبتوں کو پالنے کی سرشاری کا احساس وافر رکھتے ہیں یہی کیفیت ان کے وجود میں طمانیت کا سرور بھر دیتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں دیکھنے سے بھل جاتے ہیں وہ اس بھولے روشنی میں زندگی کا تابناک راستہ دیکھتے ہیں کہ یقین ان کا اثاثہ بن جاتا ہے۔ خدا کی عطا کردہ نعمتوں سے طمانیت پاتے ہیں اور یہی طمانیت ان کے اندر عزم کو جگائے رکھتی ہے یہ شعر دیکھیے۔

دیا ہوا دل کے من پہ جلا بھی سکتا ہوں  
 کئی بھی سمت سے سفر چکا بھی سکتا ہوں  
 ”آئندہ لگتی نہیں“ کے شاعر کے دل میں محبتیں کا سمندر موجزن ہے۔ جو بھی لہر اندر سے اٹھتی ہے وہ نرم پھوار میں بھیجے ہوا لہجہ دے جاتی ہے۔ وصل کا رنگ ان کا بنیادی اور گرا رنگ ہے۔ اس رنگ کی گھاٹ ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔

زیر تبصرہ مجموعہ کا شاعر کسی خیالی وجود کا پیکر تراش کر اس کے خواب آنکھوں میں بسا کر اپنے ہی مدار میں نہیں گھومتا۔ معاملات محبت میں وہ سرگرواں ہے۔ مگر اداس نہیں کہ اس کا محبوب تصوراتی نہیں بلکہ اس کے آس پاس ہے۔ وہ اس کے ہونے کے احساس سے سرشار ہے یہ شعر دیکھیے۔

حصار جاں میں مجھے بسا کر تم اپنا چہو نگاہ رکھنا  
 سنری سمجھوں میں کھلی راقوں کا بیان جاناں حساب رکھنا  
 علاوہ ازیں ”اسد بیگ کی نظموں میں درد مندی اور حساسیت کا احساس ملتا ہے کہ وہ نئے پاکستانی اور بشعور فرد محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی کئی نظموں میں اسی خصوصیت کی حامل ہیں۔“



چیکن ووماس

## اپ کا اورچی خانہ

## سز سرت شاہین

میں عرصہ پندرہ سال سے آپ کے شمارے کی باقاعدہ قاری ہوں۔ اسکول کے زمانے سے آپ کے معارفی رسائل میرے دست بنے اور ماہو سال کا سفر طے کرتے ہم سفر بن گئے۔ میں بھی مخصوص کلی سے بچوں کی ماں بنی لیکن میرے تعلق اور پسندیدگی میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ میلے پیل کزن کے گھر سے لا کر چھپ چھپ کر پھا کرتی تھی، کونکہ امی جان شراف ہوا کرتی تھیں مگر گاج میں پہنچ کر کھلم کھلا مطالعہ کرنا شروع کیا۔

(1) ہمارے گھرانے میں ماشا اللہ جو اسٹ فیملی سسٹم ہے اس لیے افرادو خانہ کی تعداد زیادہ ہے اس کے باوجود کھانا پکاتے ہوئے سب کی پسند ناپسند، لذت اور بیٹ سب کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ چونکہ کھانا پکانے کی ذمہ داری تمام تر بچھیر ہے اس لیے اکثر سب اپنی فرمائش مجھ سے کرتے ہیں۔ والدین کی صحت اور بیماری کو مد نظر رکھتے ہوئے سبھی بنائیتی ہوں۔ اکثر افراد کو کرسی کرنے والے ہیں تو ان کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے گوشت اور اس سے بنی ہوئی اسٹام کو فوقیت دیتی ہوں۔ بچوں کو بچ پر خاص طور پر ہلکے پھلکے اسٹیکس اور ٹوڈلز بنا کر دیتی ہوں۔ ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک 4 سے 5 بار چکن کا رخ کرتی ہوں۔ میاں صاحب کباب اور پیٹھے کے شوقین ہیں گنڈا۔ یہ بھی خاص طور پر تیار کرتی ہوں۔

(2) اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مہمان بتائے بغیر ہی آتے ہیں گنڈا اس وقت جو چیز مہیا ہو وہ فوراً تیار کر لی جاتی ہے۔ ایک خاص مگر واسطے دار چیز ”چکن ووماس“ ہے جو میں بہت اچھی اور جلدی بناتی ہوں اور مہمانوں کو پسند بھی آتی ہے۔

اجزا :

چیکن

چار

اورک بسن پیٹ

دہی

ٹماٹر

ہری مرچ

شہک

سالی مرچ

زیرہ سفید

کارن فلور

ترکیب :

آرٹھاکو  
ایک درمیان  
ایک کھانے کا چمچ  
ایک چمچ  
ایک پاؤ (پیسٹ بنا ہوا)  
چھبے آٹھ عدد  
حسب ذائقہ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک چائے کا چمچ  
ایک کھانے کا چمچ

سب سے پہلے چکن دھو کر پانی نکال لیں۔ دیکھی میں کچی ڈال کر بنا ڈریک کی ہوئی سمن گریں اور نکال لیں۔ اس گرم کچی میں چکن کی برٹیاں ڈال کر گولڈن ہونے تک فرائی کریں اس کے بعد اورک بسن کا پیسٹ نمک ڈال کر بھونیں۔ دہی ڈال کر تیز آگ پر پکائیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو ہری مرچ لہجائی میں کٹی ہوئی اور کالی مرچ ڈال کر ٹماٹر کا پیسٹ ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ تھوڑی دیر بعد کارن فلور کو پانی میں مکس کر کے چکن میں ڈال دیں۔ گاڑھا سا سوپ کی شکل بن جائے تو تار لیں۔ یہ پندرہ سے بیس منٹ میں تیار ہو جاتی ہے اور اگر شام کی چائے پر مہمان آئیں تو جھٹ پٹ تیار ہونے والے لنگٹس فرائی کر لیں ہوں۔ یہ ہمارے گھر بہت شوق سے کھائے جاتے ہیں اور بچے بوڑھے جوان سب پسند بھی کرتے ہیں۔

## چیکن لنگٹس

اجزا :

چیکن

بول لیس

(ایک پیالی بوا گل کیا ہوا)

نمک

حسب ذائقہ

BAKE MARJOR

بن جاؤ **Lites** فٹناسٹک 3

جیتو 1 لاکھ فوری انعامات ہر مہینے

Lites کھاتے جاؤ۔ فوری انعامات لیتے جاؤ!

Grand Prizes

Small Prizes

چیکن ووماس کی ترکیب

Lites کھانے کے لیے بہترین اور سب سے زیادہ لذت بخش ہے۔ اس کے ذائقے کو سب نے پسند کیا ہے۔ اس کے ذائقے کو سب نے پسند کیا ہے۔ اس کے ذائقے کو سب نے پسند کیا ہے۔

چیکن ووماس کی ترکیب

چیکن ووماس کی ترکیب

چیکن ووماس کی ترکیب





ہمیشہ جو ہم سب پسند کرتے ہیں وہ ہے قرچ ٹوسٹ اور انڈے کا حلوہ اس کی ترکیب تو تقریباً ہر ایک کو آتی ہو گی۔

(5) گھر کے کھانے بعض اوقات بور کرنے لگتے ہیں اس لیے باہر کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ لیکن ایسا موقع کم آتا ہے کہ پلان بنا کر کھایا جائے۔ جب گھر میں ستری یا وال جینی ہے تو سب اپنی پکٹ منی سے کباب تھے اور بابلی کیونکہ لیتے ہیں۔ لیکن میاں صاحب کا جب دل چاہے وہ خاموشی سے لے جاتے ہیں اور اچھا کھانا کھلاتے ہیں۔ ویسے میں اتنی خوش قسمت نہیں ہوں لیکن موقع کی مناسبت سے چلتے ہیں۔ یہ سب موڈ پر منحصر کرتا ہے۔ میرے خیال میں گھر کا کھانا زیادہ مزیدار اور سستا ہوتا ہے۔ کیونکہ باہر کی نسبت گھر میں اتنا کھانا منگ نہیں محسوس ہوتا۔

(6) موسم کے ساتھ انسانی جذبات کا گہرا تعلق ہے۔ مجھ جیسی جذباتی اور حساس انسان کے لیے موسم بہت اہمیت رکھتا ہے۔ بارش میں چکن، ریڈ، سموسے، چھوڑے اور چھوڑی بنائی ہوں۔ مہمان آئیں تو تیار ہو کر آتا ہے۔ گرمی کے موسم میں کڑھی، چاول اور سردی میں گرین فی، نماری، پائے، حلیم بہت لطف دیتے ہیں۔

(7) اچھا پکانے کے لیے مشقت کی قائل ہوں۔ کیونکہ محنت کے بغیر اچھے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کباب کا سالنا پینے کے لیے میں سسل بننے کی قائل ہوں۔ کیونکہ چور میں ہرگز وہ مزہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جب عورت پوری توجہ دیتی ہے اور محنت کے ساتھ کھانے پکاتے تو لائق وچ نہیں کہ کھانا لذیذ اور ذائقہ دار نہ بنے۔

(8) ٹپ دینے تو بہت سی ہیں لیکن ایک یہ کہ ہمیشہ کھانے پکاتے وقت سردھانپ کر رکھیں۔ بلیس اللہ پڑھ کر شروع کریں۔

کھانے میں برکت ہوگی اور غیر معمولی مزیدار ہو جائے گا۔

کھلی مرچ  
چائیزونگ  
انڈے  
ڈبل روٹی کے سلائس  
تیل  
ترکیب :

چکن، بڑی سلائس اور انڈے بلینڈر میں ڈال کر بلینڈ کر کے اچھی طرح مکس کر لیں۔ اس میں نمک، کھلی مرچ اور چائیزونگ ڈال کر مکس کوئیں اور کھی گرم کر کے اس میں چچے کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈالتی جائیں اور سرخ ہونے پر تار کر گرم گرم کھچھ کے ساتھ سرو کر سکتے ہیں۔

(3) چکن میں کالم کرتے ہوئے بکھراوا تو لازمی ہوتا ہے۔ لیکن میں ساتھ ساتھ کھیتی ہوں۔ چکن میں گندگی مجھے پسند نہیں ہے۔ ہفتہ وار صفائی کے دوران میں چھلنے کے ہتھوڑا اگائی ہوں تاکہ کھانے پکانے وقت دیوار کے اوپر چھینٹے نہ پڑیں۔ اس سے دیوار گند کی نہیں ہوتی۔ پندرہ دنوں بعد چکن کے تمام برتن نکال کر صفائی بھی میری خانہ داری کا خاص حصہ ہے۔ مجھے چونکہ آرٹ کا شوق ہے اس لیے میں اکثر مختلف اشیاء اور کچن میں آرائش ضرور کرتی ہوں۔ لیکن سے متعلق اچھی اشیاء خریدنا بھی میرا شوق ہے۔ اس لیے میرا چکن میری پسندیدہ جگہ ہے اور میری سلیقہ مندی کا منہ بولتا بیوت بھی۔

(4) ہمارا گھر انہ جو تک زیادہ تر ملازمت کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے اس لیے صبح پہلو ٹنگ جی ہوتی ہے۔ مندریں جو میسر ہونے میں کھاتی ہیں دیور ذرا دیر سے جانا ہے تو وہ گل ناشتے کا قائل ہے۔ اس لیے وہی پر اٹھا سائن، انڈے اور لسی کا اہتمام ہوتا ہے۔ میاں صاحب ناشتے میں گھر کا بنا ہوا مسالہ اور پرائیڈا شوق سے کھاتے ہیں لیکن انوار کو مکمل اور باقاعدہ ناشتہ بنتا ہے جس میں حلوہ پوری، نماری، مسری پائے اور مرغ پھولے شامل ہیں۔ ایک مکمل مگر بھکا چھکا

## موسم کے پیکوان

خادہ جیلدنی

لسن کے جوے 1 عدد  
ہری مرچیں 4 عدد  
سرکہ  
چائے کے چار چمچے  
ترکیب :

مزیدار آلو آلیٹ مسالہ

ظہوری اجڑا :  
انڈے 6 عدد  
آلو ایک انچ کے کیوبز کاٹ لیں 10 عدد  
چائے کا ایک چوتھائی چمچ  
چائے کا آدھا چمچ  
حسب ذائقہ  
کھانے کے 6 چمچے  
ڈیڑھ پیالی  
پیشی ہوئی پیاز  
کھانے کے چار چمچے  
پیاز کے آمیزے کے لیے  
10 عدد (بڑی)  
تین عدد  
ایک انچ کا ٹکڑا  
ادرک

پیاز کا آمیزہ تیار کرنے کے لیے پیاز نمائز ادرک، لسن، ہری مرچیں اور سرکہ کو پیس کر پیسٹ بنا لیں۔ ایک پیالے میں انڈوں میں نمک ڈال کر بھینٹ لیں۔ ایک سوں پین میں کھانے کا ایک چمچ تیل گرم کر کے آدھی مقدار انڈوں کی ڈال کر آلیٹ کی طرح قرانی کریں۔ اسے نکال کر یہ ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ اب بقیہ انڈے بھی قرانی کر کے نکال لیں۔ پھر بقیہ تیل گرم کر کے آلو ڈال کر مٹھی مائل ہونے تک قرانی کریں اور نکال کر الگ رکھ لیں۔ اسی تیل میں پیاز کا آمیزہ ڈال کر مٹھی میں جب تیل اگ ہو جائے تو نمک



بھانسنے سے قبل چاولوں کو اچھی طرح دھو لیں۔ مزیدار انڈے والے چاول تیار ہیں۔ رائٹے اور اچار کے ساتھ سرو کریں۔

سرخ مرچ یا ڈور اور ہلدی یا ڈور ڈال کر بھونیں۔ اب آلو شامل کر کے بھونیں۔ تھوڑی دیر بعد آلیٹ کے ٹکڑے شامل کریں۔ ڈھانپ کر آلوؤں کو گلا لیں۔ گرم گرم سرو کریں۔

**انڈوں کا حلوہ**

ضروری اجزاء :

- انڈے
- دودھ
- الچھنی
- بادام
- گھویا
- چینی
- پرست
- گھسن
- ایک درجن
- ایک پیالی
- پانچ عدد (چھوٹی)
- حسب ضرورت
- ایک باؤ
- دو پیالی
- حسب ضرورت
- ایک نمکی

ترکیب :

پیشانی میں گھسن ڈال دیں اور تھکنے کے بعد الچھنی کے دانے ڈال دیں پچھ دیر سے پکا لیں پھر گھویا ڈال کر مسلسل پچھ بھالی کریں۔ یہاں تک کہ گھویا صبری مائل ہو جائے اور ایک لمبی سی بن جائے پھر اس میں دودھ ڈال کر پتلا کر لیں اور تھوڑی دیر تک پچھ بھالیں۔ جب دودھ اچھی طرح کس ہو جائے تو چھنی ڈال دیں۔ اگر مٹھا کھوا استعمال کیا ہے تو چھنی کی مقدار کم کریں۔ اچھی طرح پھینٹے ہوئے انڈوں کا آمیزہ ایک باوریک تار کی صورت میں پیشانی میں ڈالیں۔ ساتھ ساتھ پچھ بھالی جالیں۔ یہاں تک کہ حلوہ پانی چھوڑ دے۔ اس حلوے کو خشک کر لیں۔ جب پانی تھوڑا سا رہ جائے تو حلوہ برتن میں نکال کر اور باقی رہ جانے والا پانی ڈال دیں۔ یہ اصل میں گھسن ہے۔ حلوے کو پیسے ہوئے پرست اور چھلے ہوئے باداموں سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

(بیشہ طفیل۔۔۔ ضلع خانیوال)

ۛۛ

**انڈوں کے چاول**

ضروری اجزاء :

- انڈے
- (دوڑے کارنگ شامل کر کے پھینٹ لیں)
- ٹماٹر
- ہری مرچیں
- (کٹ لیں)
- پیاز
- نمک
- پسی ہوئی سرخ مرچ
- ہلدی یا ڈور
- سفید زہرہ
- آلو پھیل کر قے کٹ لیں (ڈور یا پٹاؤ
- چاول
- تیل
- حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز کے پھولوں کو تیل میں سنہری مائل کر لیں۔ اس میں ٹماٹر، ہری مرچیں اور تمام سالے شامل کر لیں۔ ٹماٹر کے ٹکٹے تک پکا میں پھر آلو بھی شامل کر لیں اور کھنے تک پکا لیں۔ آخر میں انڈے پارک تار کی شکل میں شامل کریں اور مستقل پچھ چلائی رہیں کہ انڈے پوری کر لیں پھر اچھی طرح کس ہو جائیں اور اچھی چھوڑ دیں۔ پیشانی کو پیسے آ کر لیں۔ ایک دوسری پیشانی میں بھی گرم گرم کر کے پھیلا لیں۔ پہلے چاول کی تہ بچھا میں اس پر انڈے اور آلو کا آمیزہ پھیلا دیں۔ آخر میں چاولوں کی تہ بچھا لیں۔ چاول تو دوڑے کارنگ شامل کر لیں دس سے پندرہ منٹ دم دیں۔ ڈش میں

**ہفتوں شعاع کا آیتنا ماہنامہ**

فروری 2011 کے شمارے کی ایک نمونہ



فروری 2011 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے

ۛۛ "سلطنت دل" مریم عزیز کا ناول، ۛۛ "شعاع کے ساتھ ساتھ" قارئین سے سروے،

ۛۛ "صہبیلان" نبیلہ عزیز کا ناول،

ۛۛ "خسانہ کارستان، بیمار اگل کے ناول، ۛۛ "پنارے نہیں ہونگے کسی بیماری باتیں"

ۛۛ "نیم ناز، عقیقہ محمد ربیک، سیما بٹ عالم، احادیث مبارک کا سلسلہ،

ۛۛ "نقارہ نغمہ اور آصف مخیرین قاضی کے افسانے، ۛۛ "خط آپ کے، شاعری حق بوی ہے اور

ۛۛ "دس سگ" معروف شخصیات سے گفتگو دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

کا سلسلہ

شعاع فروری کا شمارہ آج ہی خورید لیں



# خبریں ویرگیں

## غزلی توپان

کرتے۔ (پیسے سے زیادہ یہاں محبت اور غلوں سے جس کی آپ کے یہاں کمی ہے) پاکستانی فنکاروں کو بھارت میں سرانگھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ (پھر زور سے زمین پر رخ دیا جاتا ہے) اس کی مثال عدنان سمیع خان ہیں جن کے مہینے میں آٹھ فلیٹ ہیں (ان کے انجام سے بھی آپ واقف ہی ہوں گے) بھارت کے کسی موسیقار کے پاس اتنی جائیداد نہیں ہے۔ "خالیا" آپ کا مقصد مسلمانوں سے ہے ان سے مقابلنا" عدنان سمیع واقعی بہت بہتر حال میں ہیں)

روٹین

شینہ پیر زادہ خاصی متحرک رہتی ہیں۔ اسی لیے



## کامیابی

اداکار حسن سومرو کے کریڈٹ پر نازیبا لہر سے شادی کے علاوہ کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ محض اچھی آواز کی بنا پر وہی دی اور ریڈیو پر کچھ نہ کچھ کر ہی لیتے ہیں۔ لیکن اب یوں لگتا ہے کہ اپنے کانٹیکٹ کے ذریعہ وہ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے بھارتی پروڈیوسر میلان سمالانی کی نئی فلم "آکھیں" سائن کی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ فلم میں رہبر گورنر عمران خان سمیت کئی اہم نام بھی شامل ہیں۔ فلم کے پروڈیوسر گزشتہ دنوں پاکستان اکیڈمی کے نظر آئے کہ پاکستان میں اتنے فیلنٹ کی بالکل کمی نہیں۔ یہاں حقیقی فنکار، موسیقار اور مصنف بستے ہیں، بس بجٹ کی کمی ہے۔ اسی لیے ہولی وڈ کے فنکار یہاں کام نہیں



انہی تک جاتی وچھوڑ نظر آتی ہیں۔ اپنی روزمرہ کو روٹین کے حوالے سے وہ کہتی ہیں "مجھے کام کرنے کا جنون ہے۔ بلکہ میں ہر وقت سمونف رہنے کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگرچہ میرے دوست مجھے فلم انڈسٹری سے دور رہنے کا مشورہ دیتے ہیں تب بھی میرا شوق میری محبت مجھے واپس اسی جانب لے کر جاتی ہے۔ ان دنوں بھی میں مختلف اسکریپٹس پر کام کر رہی ہوں۔ میری تمام تر خوشی کا مرکز میری بیٹیاں اور میری سرزمین ہے۔ میں ان کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھتی ہوں میری زندگی کے خوب صورت لمحات وہ تھے جب ہمارے یہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ اداکاری کے شعبے میں مجھے روحی بانٹنے بے حد متاثر کیا۔ ان کی زندگی ہم سب کے لیے سبق ہے۔" (تفصیل اسی بھانے آپ لوگ پڑھنے فنکاروں کو خراج تحسین ہی پیش کر لیتے ہیں۔)

## بیہ بیان کالمناہ

☆ 75 کے اواخر میں پاکستان آیا اور بھٹو صاحب نے درخواست کی کہ میں واپس نہ جاؤں اور رگ کر ایجنٹ بن جاؤں باقی حالات کہ کس طرح سب کچھ چھوڑا، کتنی تنخواہ پر کام کیا اور کتنی کمین مشکلات و سازشوں کا سامنا کرنا پڑا، اب ہماری تاریخ کا حصہ ہے میں نے نہایت کم عرصہ میں اس ملک کو ایک ایسی اور میزبان قوت بنا دیا۔ میں نے اربوں ڈالر کی ٹیکنالوجی دی اور ایک پالی معاوضہ نہیں ملا۔ (ڈاکٹر عبد اللہ برخان)

☆ مسلسل کے ساتھ ٹی وی چینلز نے ویٹا ملک کو بظاہر کنبے میں کھڑا کر کے ویٹا ملک کا خوب بچھا دیا اور جو بظاہر تنقید تھی وہ دراصل ویٹا ملک کی استعماری مہم نکلی اور اگلے دن سے دوسرے چینلز پر بھی یہ شو شروع ہو گیا۔ بار بار وہ فحش سین دکھائے جا رہے تھے جن پر اعتراض تھا۔ اور سب سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ جو لوگ یہ سب کچھ نہیں جانتے تھے۔ وہ بار بار یہ دیکھ رہے تھے۔ (مظفر اعجاز حسرت)



☆ ہم سیلاب کے عذاب سے گزر رہے ہیں ایک دوسرے کو قتل کرنے کے عذاب کا مڑا کچھ رہے ہیں لیکن اللہ کی یاد اور توبہ تو ایک طرف پاکستان میں انصاف کے لیے بھی قدم نہیں اٹھاتے۔ انصاف کی تعریف کرتے ہوئے قرآن نے ایک شرط عائد کی ہے کہ کسی قوم، قبیلے یا گروہ کی محبت تمہیں اس بات پر مجبور نہ کرے کہ تم انصاف چھوڑو۔ اسے گریہ بانوں میں بھانگیں۔ کوئی دلیل ہے تو کوئی حافی، کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی اچھی نگر کسی کو اپنی پارٹی عزیز ہے تو کسی کو اپنا فرقہ، کوئی اپنی نسلی برتری پر دو سروں کا خون بہاتا ہے کوئی عقیدے کی بنیاد پر قتل کو جائز قرار دیتا ہے دو سروں کے قتل پر خوش ہوتے ہیں۔ اپنے مرنے والوں کی لاشیں اٹھا کر بھاگتے ہیں۔

(اور یا مقبول جان ایکسپریس نیوز)

☆ اللہ کا شکر ہے کہ عمران خان میانوالی میں ورنلڈ کلاس یونیورسٹی بنا رہا ہے کیونکہ وہ انقلابی ہے نہ حکمران نہ ہی اتنا دولت مند کہ ہمہ وقت دولت کی ہوس میں مبتلا رہے۔ (ڈاکٹر صفدر محمود۔ جنگ)

☆ ہمارے سچے سچے دلیل غائب ہو چکی ہے مذہب کا شیعہ مطالعہ غیر ضروری ٹھہرا۔ جذباتی تحریک لگاؤ اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکانا۔ مست اور تیر ہمدرد نسخہ۔ کہاں سے چل کر ہم کہاں آئیے۔ (بندگی نامہ۔ انتظار حسین)



### ماریہ ارم خان پور

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی ہی جنس سے محبت کرنا ایک طرح کی بے راہ روی ہے۔ محبت کرنا چاہیے مگر اسے خانوں میں یا نئے کی ضرورت ہے جیسے ماں باپ کی محبت، کسی سہیلی یا کسی اور کو نہیں دی جا سکتی۔ بہن بھائی کی محبت بھی بہن بھائیوں کی امانت ہے اسے نہ کسی اور کو دیا جا سکتا ہے اور نہ کسی پر اٹھایا جا سکتا ہے۔ آپ کو محبت کی ضرورت ہے تو وہ محبت اپنے والدین بھائی بہنوں میں تلاش کریں بلکہ تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے وہ ان کو دین۔ یہ ان کا حق ہے۔ سہیلیوں وغیرہ میں محبت کو تلاش کرنا غیر ضروری تھے رہنا اپنی بساط سے بہنہ کران کے لیے چیزیں خریدنا ایک امتحانہ حرکت ہے، اگر وہی چیزیں اپنے بہن بھائیوں کے لیے خریدیں تو بہن بھائیوں کو خوشی بھی ہوگی اور ان کی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی، خاص طور پر ایسے میں جبکہ آپ کا تعلق کسی خوش حال گھرانے سے بھی نہیں ہے۔

یہ صواب کچھ کہنے کا لب لباب یہ ہے کہ اپنی ہی جنس سے محبت کرنا ایک طرح کی بے راہ روی ہے اور وہ عمیہ کہ والدین اور بہن بھائیوں کی محبت کسی اور پر لگانا ایک امتحانہ فعل ہے۔

### صائمہ کراچی

بچپن میں آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے یا کوئی زیادتی ہوئی ہے تو اس عمر کے کوئی اثرات وقت گزرنے پر مٹا نہیں رہے۔ اس بات کو اپنے ذہن سے نکالیں اور بھول جائیں آپ اس کو یاد کرنے اور پریشان رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے ذہن کا رقص کتنا ہے کہ پریشان اور متاثریشانیوں کا حل نہیں ہے۔ پریشان رہنے سے انسان کا ذہن اور جسم دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ میرے حساب سے آپ ایک نارمل لڑکی ہیں۔ ایک ماہر نفسیات کا کہنا ہے پریشانیوں کا شاہی علاج مذہب ہے۔ آپ بھی باہندی سے نماز اور قرآن کی تلاوت شروع کریں انشاء اللہ ان پریشانیوں سے چھٹکارا مل جائے گا۔

### ت۔ فلک خان پور

آپ کی تحریر اس بات کی غماز ہے کہ آپ انشاء اللہ بہت ذہین ہیں۔ آپ اپنے ذہن کو اس طرف راغب کریں کہ کس طرح لوگوں کی مدد کر سکتی ہیں، ان کے کلام آسکتی ہیں، کوئی بہت بڑا کام انجام دینا ضروری نہیں۔ کسی کو اچھی بات بتانا، کسی سے مسکرا کر ملنا بھی اسے خوشی دے سکتا ہے۔ کسی نیکی یا سچے کو بڑھا کر بڑوں میں کس بیمار خاتون کی عیادت اور خدمت کر کے بھی ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں دوسروں کو خوشی دیتے ہیں ان کے کام آتے ہیں بے غرض، بغیر کسی مطلب کے، قدرت انہیں خود بخود ایک سکون، ایک روحانی خوشی، احساس عطا کرتی ہے۔ دنیا میں محبت یا شکر اور محبت پانا سب سے بڑی خوشی ہے۔

۴۴



اپنی شخصیت کا جائزہ لیں۔ کیا آپ خوش رہتی ہیں؟

اگر آپ کا جواب نفی میں ہے تو یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنی زندگی کے نئے مسائل سے مطابقت نہیں کر رہی ہیں۔ کیونکہ خوشی براہ راست نہیں حاصل ہو سکتی۔ اگر آپ کی زندگی کا کوئی مقصد ہے اور آپ اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں تو آپ کو ضرور خوشی حاصل ہوگی۔

کیا آپ لوگوں کو پسند کرتی ہیں؟

ان کے اعتماد ان کے خلوص ان کی قربت کی خواہاں ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو پسند نہیں کرتیں۔ تمہاری زندگی گزارنا چاہتی ہیں تو آپ ذہنی طور پر بیمار ہیں۔ کیا آپ ماضی کی غلطیوں پر پشیمانی روتی رہتی ہیں اور مستقبل کے ڈر سے کسی رشتہ میں آپ کو سمجھ لیں کہ آپ اپنے کل اور آج کا خون کرتی رہتی ہیں۔

آپ عمر کے کسی دور میں ہوں، کتنی ہی مال دار اور کتنی ہی غریب کامیاب کامیاب ہوں، آپ کو اپنے گھر میں ماں باپ یا بھائی بہن کی شکل میں ایک با اعتماد دوست کی ضرورت ہے۔ جس سے آپ پورے مجھو سے غلطیوں کے ساتھ سب کچھ کہہ دیں، خواہ کتنا ہی بڑا واقعہ کیوں نہ ہو۔

یہ اطمینان آپ کی دائمی صحت کے لیے بہت ضروری ہے کہ کام کی زیادتی سے کوئی بھی نہیں تھکتا۔ اور نہ بیمار بناتا ہے لیکن اگر کسی کو کام سے دلچسپی نہیں ہے تو آسمان سے آسمان کام بھی نہیں ہو پاتا۔ ایک مفکر نے لکھا ہے کہ یہ ہماری نفسی بڑی بدنقصی ہے کہ اس تہذیب اور تمدن ترقی اور ترقی روشتی کے دور میں ہم نہیں جانتے کہ ہماری سب سے بڑی دولت سب سے بڑی نعمت خود اعتمادی ہے اور ہمارے سامنے ایسی راہیں اور ایسے طریقے موجود ہیں جن پر عمل کر کے اس نعمت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہماری تہذیب کتنی پیچھے ہے کہ ہمارے طلباء تعلیمی دور گاہوں میں دنیا کی ساری حماقتیں سیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سیکھتے کہ ان میں خود اعتمادی کا جو پر جو دنیاوی کامیابی کے لیے لازمی ہے، کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں جو شخص اپنے آپ کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا وہ دنیا میں سب سے تباہ و جاہل ہے۔



اصت الصبور

# سچی طبیعت

ہوں، خاص طور پر کیلا زیادہ کھائیں۔

2۔ جسمانی مشقت کے کام زیادہ کرنا۔

3۔ فکر، غم یا تشویش۔

4۔ کم سونا۔

آپ دن میں تین مشوروں پر عمل کریں۔

رات میں کم از کم دس گھنٹے سوئیں۔

متوازن غذا استعمال کریں۔ سرگرم چھائے، قہوہ اور

تازہ پھل کم کھائیں، خوش رہنے کی کوشش کریں۔

اگر بھوک کم لگتی ہے تو ڈاکٹر کے مشورے سے کوئی

سیرپ لیا جاسکتا ہے۔

نسوانی حسن کی کمی کے لیے روزانہ ایک چھٹانک

بچہ کھائیں اور ایک چمچ کالا زمرہ ایک چمچ پھل میں نہیں

کھینچنے سے بنائیں اور دن یا رات میں سونے سے پہلے یہ

پیست لگائیں۔ آپ کی شکایت دور ہو جائے گی۔

آپ کا وزن قدم کے لحاظ سے کم ضرور ہے، لیکن

فکر مند نہ ہوں، شادی کے بعد خود بخود وزن بڑھ جائے

گا۔ ویسے بھی آج کل وزن بڑھانا مسئلہ نہیں، وزن کم

کرنا مسئلہ ہے۔ آپ خوش نصیب ہیں کہ اس دور میں

آپ کو دلے پن کی شکایت ہے۔

تازہ یا سمین۔ لاہور

بچہ۔ آپ بہن۔ کو بتائے ہوئے مشورے پر

عمل کریں۔ بالوں کو۔ اور کرنے کے لیے آپ کسی

لیڈی ڈاکٹر سے مشورہ کر لیں۔



ا۔ کس کا وزن بھرا جسم اللہ پور

م۔ باجی! میں ایم ایس سی سینٹر پارٹ کی اسٹوڈنٹ

ہوں۔ میری عمر ایس سال ہے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ

ہے کہ میرا قد پانچ فٹ چھ انچ ہے جبکہ میرا وزن صرف

39 kg ہے۔ میں اپنے قد کے حساب سے ذیلی

چٹائی لگتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی ایسا حل

بتائیں کہ میرا جسم بھرا بھرا ہو جائے۔ دوسرا مسئلہ یہ

ہے کہ میں نسوانی حسن کی کمی کا شکار ہوں اور مٹی

جون تک میری شادی بھی ہونے والی ہے۔ پلیز اس

کے لیے مجھی کوئی آزمودہ اور آسان نسخہ بتادیں۔

میرے مسائل کا حل فروری کے شمارے میں بتادیں۔

نتہ۔ دلے پن کے اسباب درج ذیل ہیں۔

1۔ نامناسب خوراک (یعنی خوراک میں انڈہ، مرغی،

مچھلی، دودھ، دہی، پھل، سبزیاں مناسب مقدار میں نہ

